قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

مارچ 2018 قیمت 15₹

ماہنامہ

اُردو دُنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

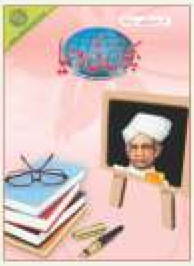

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

نھنے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

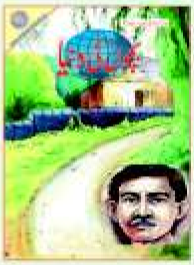

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

انٹرویو
شاعری کی تنقید کا حق ادا نہیں
ہو پا رہا ہے: ڈاکٹر حنیف ترین — غلام نبی کمار 8

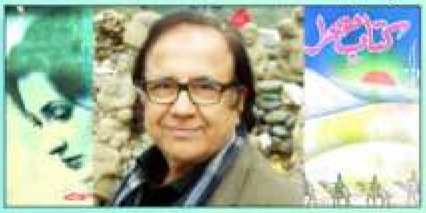

زبان و تعلیم
مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی — نجمہ سلطانہ 12

سرسید شناسی
سرسید کے خطابات — شمس بدایونی 14

مارچ کے ماہتاب
واجدہ تبسم: اردو کی
ایک معتوب افسانہ نگار — شمع اختر اعظمی 18
ساحر لدھیانوی: ادب اور
فلم کے آئینے میں — رضوانہ پروین 20

جائزہ
2017 کا فکشن اور فکشن تنقید — اسلم جمشید پوری 22

یادِ رفتگاں
پروفیسر محمد انصار اللہ کی کہانی
خود ان کی زبانی — ایم ابصار احمد 27
جمیل ظہیر — بدنام نظر 30

نقد و نگاہ
اکیسویں صدی میں منٹو شناسی — مشتاق عالم قادری 32
نادر شاہجہاں پوری — شمیم احمد صدیقی 35
بلند قامت شاعر جگدیش پرساد خلش — سید شبیر عالم 38
حامد حسن قادری — شاہنواز فیاض 40

نفسیاتی تغیرات اور سماج و
ادب پر ان کے اثرات — محمد مستمر 43

سلسلۂ صحافت
بنگال میں اردو صحافت — محمد زاہد 47

تہذیب و ثقافت
ماقبل نوآبادیاتی ہندوستان کا
سماجی و ثقافتی منظر نامہ — علیم اللہ 51

نیا آسماں نئے ستارے
ماتا جی گرلز کالج اندور
کے شعبۂ اردو کی خدمات — فاروق احمد وانی 53

سائنس اور ٹیکنالوجی
عہد آصف جاہی میں سائنس و ٹیکنالوجی — وہاب قیصر 55
کالج کی سطح پر اردو تدریس میں
ٹیکنالوجی کا استعمال — محمد اسلم فاروقی 59

کمپیوٹر
ونڈوز 7 میں مدد لینا 62

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 63

رپورٹ
نئی دہلی عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل
کے زیر اہتمام کل ہند مشاعرے کا انعقاد — عبدالحی 74

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ 76

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 77

ماہنامہ اردو دنیا، نئی دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 20، شمارہ: 03، مارچ 2018

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون: 49539000   شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

ہماری بات

اردو زبان و ادب کے فروغ اور دیگر لسانی مسائل کے تعلق سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مذاکروں اور سمینار کا انعقاد ہوتا رہا ہے جن میں اردو زبان کے تعلق سے جس جذبے اور خلوص کا اظہار کیا جاتا ہے وہ یقیناً قابل قدر ہے اور اس بات کا ثبوت بھی کہ اس مادی دور میں بھی کچھ لوگ اپنی زبان کے تئیں نہایت سنجیدہ ہیں اور انھیں اپنی ذمے داریوں کا احساس بھی ہے۔ وہ زبان کو زندہ رکھنے کے نئے نئے طریقے بھی تلاش کرتے ہیں اور فروغِ اردو کے لیے تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ ان میں بہت سی تجویزیں ایسی ہوتی ہیں جن کو روبہ عمل لایا جائے تو یقینی طور پر اردو زبان کی ترقی کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ان تجاویز پر ہم سنجیدگی سے غور نہیں کر پاتے اور نہ ہی ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم دوسرے مسائل میں اس طرح اُلجھ جاتے ہیں کہ بنیادی مسئلے پیچھے چھوٹ جاتے ہیں۔ کشمکش، رنجش اور تصادم کی وجہ سے بھی صورتِ حال دِگرگوں ہو جاتی ہے جبکہ ہونا یہ چاہیے کہ تمام اختلافات اور رنجشیں بھلا کر ہمیں زبان و ادب کے بنیادی مسائل پر غور کرنا چاہیے اور ان مسائل کو حل کرنے کی سنجیدہ کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک ہم مل کر فروغ اردو کے تعلق سے کوشش نہیں کریں گے ہمیں کسی بھی محاذ پر کامیابی نصیب نہیں ہوگی۔

اردو زبان کے ساتھ صرف اس کے فروغ اور بقا کا مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی جان سے بہت سارے اور مسائل جڑے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر ان علاقوں میں اردو کی ترویج و اشاعت کا مسئلہ ہے جو اردو کے لیے زرخیز تو ہیں مگر ان کے پاس وسائل نہیں ہیں۔ ایسے بہت سے علاقوں کی شناخت کی گئی ہے جہاں اردو سے محبت کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے اور وہاں کے لوگ چاہتے ہیں کہ اِس زبان سے اپنا رشتہ جوڑیں مگر رشتہ جوڑنے کی کوئی واضح صورت انھیں نظر نہیں آتی۔ ایسے علاقوں میں فروغ اردو کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے اور آج صورتِ حال تھوڑی بدلی ہوئی ہے۔ اردو کے تعلق سے اندازِ نظر بھی بدلا ہے، رویے میں بھی تبدیلی آئی ہے، بہت سارے لوگ اب اس زبان سے ایک نئی قربت محسوس کر رہے ہیں۔ اُن افراد کو نظر میں رکھ کر ایک مضبوط لائحہ عمل تیار کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو کی خوشبو ہر اُس علاقے تک پہنچے جہاں اس کے چاہنے والے موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لیے اردو کی انجمنوں، تنظیموں اور اداروں کو متحرک ہونا پڑے گا۔ پرانے زمانے میں انجمن ترقی اردو ہند کی بہت سی ذیلی شاخیں تھیں جو اردو زبان و ادب کے تعلق سے بہت متحرک تھیں۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں یہ انجمن کام کرتی تھی اور اس کے مفید اور مثبت نتائج بھی برآمد ہوتے تھے۔ ضرورت ہے کہ ہر علاقے میں ایک اردو انجمن، تنظیم، ادارہ قائم کیا جائے اور اس کے ذریعے لوگوں کو بیدار کیا جائے۔ اِس بیداری کا یقیناً ہمارے سماج پر اچھا اثر پڑے گا اور اردو کا ایک نیا معاشرہ وجود میں آئے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں لائبریریوں کی تشکیل بھی ضروری ہے کہ ان کے ذریعے ہی اردو کتابوں اور رسائل تک قاری کی رسائی بہ آسانی ہو سکتی ہے کیونکہ زیادہ تر علاقوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہاں نہ اردو کتابیں دستیاب ہیں اور نہ ہی اردو رسائل۔ جبکہ ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو اردو کتابوں اور رسائل سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے۔ پرانے زمانے میں اسی مقصد کے تحت بہت سی لائبریریوں کا قیام عمل میں آیا تھا اور ان لائبریریوں نے سماجی، تعلیمی بیداری پیدا کرنے میں اہم کردار بھی ادا کیا ہے مگر وہ کتب خانے اور لائبریریاں اب دم توڑ رہی ہیں۔ ایسے میں ضرورت ہے کہ ان لائبریریوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور انھیں تمام وسائل مہیا کرائے جائیں تاکہ ان لائبریریوں کی وجہ سے ہندوستان میں شائع ہونے والی کتابیں اور رسائل وہاں تک پہنچیں اور لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اِس وقت ہمیں اردو زبان کے فروغ کے لیے بہت سنجیدہ ہونے اور چھوٹے چھوٹے مسائل پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ یہی چھوٹے چھوٹے مسئلے جب حل ہو جائیں گے تو بڑے مسائل کو حل کرنے کی راہ آسان ہو جائے گی۔

اردو کے اتنے مسائل ہیں کہ انھیں چند سطروں میں سمیٹنا بہت مشکل ہے اسی لیے قومی اردو کونسل کی کوشش ہوگی کہ ماہنامہ 'اردو دنیا' کا ایک شمارہ اردو کے نام مختص کیا جائے جس میں اردو کے آغاز و ارتقا، اردو کے تعلق سے مشاہیر کے اقوال اور اشعار کے علاوہ اردو کی موجودہ لسانی، تہذیبی، ثقافتی صورتِ حال کے حوالے سے مضامین شائع کیے جائیں۔ اس تعلق سے اربابِ علم و دانش سے درخواست ہے کہ وہ رہنمائی فرمائیں تاکہ 'اردو دنیا' کا 'اردو نمبر' دستاویزی حیثیت کا حامل ہو سکے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

آپ کی بات

✍ 'اردو دنیا' کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر اور علم و آگہی سے مالامال ہوتا ہے، آپ کا حسنِ انتخاب، مضامین کی ترتیب بہت ہی عمدہ ہوتی ہے، رشک آتا ہے۔ سولاپور اردو کتاب میلے کی بہترین رپورٹنگ کی گئی ہے۔ کتاب میلے کی کامیابی یقیناً کونسل کی سنہری تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اردو کی قدیم بستیاں، مراکز آہستہ آہستہ اجڑ رہے ہیں اور نئے نئے شہر آباد ہو رہے ہیں، اردو شمال سے جنوب کی طرف تیزی سے منتقل ہو رہی ہے۔ اہل جنوب نے جنون کی حد تک اس کو اپنے سینے سے لگایا ہے، وہ اردو سے محبت دینی فریضہ سمجھ کر کرتے ہیں۔ کونسل کے اربابِ اختیار سے ایک گذارش ہے کہ کتاب میلوں کے ساتھ علاقائی کتاب میلے پانچ روزہ ملک کے اردو اکثریتی علاقوں میں شہروں میں منعقد کیے جائیں تو اردو کی اشاعت و ترویج میں ایک نیا تجربہ ہوگا۔

✿ **مرزا عبدالقیوم ندوی**: اورنگ آباد، مہاراشٹر

✍ 'اردو دنیا' جنوری 2018 کے شمارے میں یہ دیکھ کر جی خوش ہوا کہ ڈاکٹر فرزانہ جمیل بیگ نے اردو کے اہم علمی و ادبی مجلّے 'نگار' کے 'مومن نمبر' کو موضوعِ قلم بنایا اور اس کے مشمولات کا تعارف پیش کیا۔ آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا، بلکہ بہت سی باتیں اپنے مطالعۂ 'نگار' کے دور کی یاد آگئیں، جیسے کہ یہ 'نگار' کا پہلا خاص نمبر تھا جسے نیاز نے اپنے جریدے کی اشاعت کے ساتویں سال کے آغاز میں شائع کیا تھا اور پھر انھوں نے ہر سال کے آغاز میں خاص نمبر شائع کرنے کی روایت زندگی بھر نبھائی تھی۔ انھوں نے 'مومن نمبر' اس طمطراق سے پیش کیا تھا کہ اردو کی کلاسیکی شعری کائنات میں جہاں میر و غالب ہی کا غلغلہ بلند تھا، نقادانِ ادب مومن کو بھی مرکزِ توجہ بنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ نیاز نے 'نگار' کے 1927 کے پرچوں میں مومن پر بہترین مضمون لکھنے والے کو پچاس روپے ادا کرنے کا اعلان کیا تھا، جو کہ 'مومن نمبر' میں شامل سید امتیاز احمد کو ان کے سیر حاصل مضمون پر ملا تھا۔

'مومن نمبر' کی غیر معمولی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ نیاز کی زندگی ہی میں اس کے دو اڈیشن اور شائع ہوئے تھے۔ دوسرا اڈیشن لکھنؤ ہی سے بغیر کسی اضافے کے شائع ہوا تھا۔ تیسرا اڈیشن انھوں نے پاکستان سے 1964 میں شائع کیا تھا۔ ابتدا میں 112 صفحات پر شائع ہوئے خاص نمبر میں اب تقریباً دو سو صفحات کا اور اضافہ ہو گیا تھا اور مضامین کی تعداد بھی (بشمول انتخابِ کلام) سترہ تک جا پہنچی تھی۔

نیاز نے دراصل 1928 کے اس خاص نمبر کے ذریعے مومن شناسی کی بنیاد رکھ دی تھی۔ دوسرے ادبی جرائد اور خود 'نگار' میں وقتاً فوقتاً مومن اور ان کی شاعری پر تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ میں نے ایک دور میں نگار بعہدِ نیاز کا مکمل سیٹ اکٹھا کر لیا تھا، یہاں خاص طور پر دو انتہائی اہم مقالوں کو نشان زد کرنا چاہوں گا۔ (1) کیفی چریا کوٹی کا مقالہ 'مومن و کلامِ مومن'، جو 'نگار' میں اکتوبر تا دسمبر 1929 اور مارچ تا مئی 1930 میں چھے قسطوں میں شائع ہوا تھا اور (2) نظیر صدیقی کا مقالہ 'مومن کا تغزل'، جو 'نگار' میں جون تا اکتوبر 1953 میں پانچ قسطوں میں آیا تھا۔ یہ دونوں گراں قدر مقالے 'مومن نمبر' کے تیسرے اڈیشن میں مجموعی صورت میں شامل ہیں، سابقہ اشاعت کی تفصیل کے بنا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ نظیر صدیقی نے بہت ہی سلجھے ہوئے پیرائے میں ان نقادوں کی خبر لی ہے جو مومن پرستی کے ریلے میں کلامِ مومن کی تقریباً ہر خوبی کو صیغۂ افضل التفضیل میں بیان کرنے، یہاں تک کہ مومن کو غالب و میر سے بھی بڑھا کر پیش کرنے لگے تھے۔ نظیر صدیقی نے جہاں 'دیوانِ مومن' کے مرتب و مقدمہ نگار پروفیسر ضیا احمد بدایونی اور 'مومن و غالب' نامی ایک چھوٹی سی کتاب کے مصنف معجز سہوانی کو ہدفِ تنقید بنایا ہے، وہیں انھوں نے 'نگار' کے 'مومن نمبر' کے مضمون نگاروں میں اثر لکھنوی اور سید امتیاز احمد، یہاں تک کہ اڈیٹر نگار نیاز کے پیش کردہ دلائل و نظائر کی ان کمزوریوں کو بھی واضح کیا ہے، جو مومن کا کسی طرح کا تفوق و امتیاز معاصر شعرا پر ثابت کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے مومن کے محاسنِ شعری کے کچھ ایسے پہلو بھی پیش کیے ہیں، جن پر دوسروں کی نگاہ نہیں گئی تھی اور اس طرح اپنے مقالے کو بڑی عمدگی سے ایک توازن کے ساتھ انجام کو پہنچایا ہے۔ یہاں پر نیاز فتح پوری جیسے سخت گیر اڈیٹر کی یہ اعلاظرفی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انھوں نے اس دور کے ایک جدید نقاد (نظیر صدیقی) کے ایک ایسے مضمون کو میرٹ کی بنیاد پر 'نگار' میں نمایاں جگہ دینے میں کوئی پس و پیش نہ کیا، جس نے خود ان کی مومن شناسی پر سوالیہ نشان قائم کرنے کی جرأت دکھائی تھی اور ان کے ہیرو کو بھی نشانۂ نقد بنایا تھا۔ ہم عدمِ تحمل کے جس دور میں جی رہے ہیں، ماضی کی ان مثالوں سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ دیکھیے، میں تو فرزانہ بیگ صاحبہ کو مبارک باد دینے چلا تھا کہ انھوں نے یہاں 'مومن نمبر' اور کہیں اور 'اصنافِ ادب نمبر' کی بات چھیڑ کر 'نگار' کے جلوؤں کو نمایاں کرنے کی چھوٹی ہی سہی کوشش تو شروع کی، پر شوق نے بات کیا بڑھائی ہے۔

✿ **اسیم کاویانی**: 702 کیتن اپارٹمنٹ، بیلویڈر روڈ، مجگاؤں، ممبئی

✍ زیر نظر شمارے میں آپ کے اداریے کا ایک جملہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور نئی ثقافتوں اور نئی تہذیبوں کے دریچے کھولتے ہوئے ساری دنیا کے مسائل جو سامنے لے آتا ہے وہ برحق ہے۔ ادب ہی کی وجہ سے قوم و ملک اور پوری انسانی وحدت و جمعیت سے ہمکنار اور وابستہ ہے۔ ادیب اور شاعر ہی ان مسائل کا حل اپنی تخلیقات میں پیش کر کے انسانیت اور یکجہتی کا پیام زمانے کر دیتے ہیں۔ آج آپ نے جن مسائل کا ترتیب وار ذکر کیا ہے وہ بلاشبہ آپ کے مطالعے اور مشاہدے کی علمی وسعتِ نظر کی دلیل ہے۔ شاعر اور ادیب ہی وہ پہلے عالمی کردار کے حامل فرد ہیں جو بے انصافی و تشدد اور نسلی عصبیت، مذہبی اور ثقافتی تصادم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔

میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ زبان اور ثقافت کا قومی اردو کونسل ایک باشعور پلاٹ فارم ہے جس کی اردو خدمات اور کارہائے نمایاں اردو ادب کے فروغ و ابلاغ کے لیے مثالی اور لاثانی ہیں۔ پانچویں عالمی اردو کانفرنس کے تحت بعنوان اردو زبان و ثقافت اور موجودہ عالمی مسائل کے انعقاد کا اقدام قابل تحسین اور تاریخ ساز ہے۔ اتنا ہی نہیں کونسل کی جانب سے آئے دن اردو ادب کی عالمی شناخت کے پیش نظر کی جانے والی ادبی اور ثقافتی خدمات کو تاریخ اردو اپنے دامن میں ایک زریں اور سنہرے باب کی مصر بنے گی۔

تازہ شمارے میں احمد سہیل کا مضمون ٹی ایس ایلیٹ، عشرت ناہید کا مضمون زلیخا بیگم، عبداللہ عثانی کا مضمون منشی نول کشور اور ان کا مطبع، امتیاز الائی کا مضمون حسرت موہانی کی صحافت، مہتاب عالم کا مضمون قرۃ العین حیدر کا خاندانی پس منظر اور فرح ہاشم کا مضمون لکھنؤ کی صحافتی خدمات اردو دنیا کی قرطاسی سرزمین پر روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر نگارشات بھی اپنی جگہ نایاب دستاویز کا درجہ رکھتی ہیں اور آپ کی ادارت میں 'اردو دنیا' رسالے سے بڑھ کر ادبی صحیفہ کی صورت میں عالمی سطح پر اپنا منفرد مقام بنا رہا ہے۔

◆ **علیم صبا نویدی**: رائس منڈی اسٹریٹ، چنئی، تمل ناڈو

✍ اردو دنیا کا جنوری 2018 کا شمارہ ملا۔ ابتدائی اسلامی ادوار میں مسلم سائنس داں نے دنیا میں بہت سے اہم دانشورانہ کام کیے اور سائنسی ایجادات کو متعارف کرایا۔ مصر میں اسلام کی آمد کے بعد ایک بڑی تعداد میں سائنسی کتابوں کا یونانی، قبطی، فارسی اور دیگر قدیم زبانوں سے عربی میں ترجمہ ان ماہرین نے کیا جنھیں شہزادہ خالد نے مقرر کیا تھا۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز (682-720) نے صحت کے محکمہ میں اسکندریہ کے نومسلم فزیشین پروفیسر ابن ابجر کو چیف میڈیکل افسر کے طور پر مقرر کیا تھا۔ خلیفہ ہارون رشید نے 'بیت الحکمت' کے نام سے ایک ریسرچ سینٹر اور سائنسی تجربہ گاہ قائم کیا تھا جس میں متعدد سائنسی موضوعات پر کلاسیکی کتب کو مختلف غیر ملکی زبانوں کے مسلم ماہرین نے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ مشہور و معروف اسلامی اسکالر مولانا شبلی نعمانی نے ذکر کیا ہے کہ ہارون الرشید نے ایک معروف ہندوستانی طبیب منکا الہندی کو بغداد بلایا تھا جس نے ادویات سے متعلق بہت ساری سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ عربی اور فارسی میں کیا تھا۔ اس مضمون سے بہت ساری جانکاری حاصل ہوئی۔

◆ **عبدالقادر**: ویمبور، معدن موڈل اکادمی، ملاپرم، کیرالہ

✍ 'اردو دنیا' جنوری کا شمارہ ملا۔ زیر نظر شمارے کے تمام مضامین معلوماتی اور محققانہ ہیں، خصوصاً جناب افروز صاحب کا مضمون 'سماج پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے اثرات' راقم کو بہت پسند آیا، افروز عالم صاحب نے سائنس و ٹیکنالوجی کے مثبت و منفی پہلوؤں کو جس بہترین سانچے میں ڈھال کر سمجھانے کی کوشش کی ہے، وہ قابل تعریف و تحسین ہے اور ہماری بات میں مدیر اعلیٰ جناب ارتضیٰ کریم صاحب نے جس انداز سے اردو زبان و ادب کی تعریف، اس کے ارتقا اور فلاح و بہبود کے حوالے سے باتیں تحریر کیں ہیں وہ بھی قابل مطالعہ ہیں، اس شمارے کو پڑھنے کے بعد یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں ہوگا کہ ماہنامہ 'اردو دنیا' زبان و ادب کا گہوارہ اور سرچشمہ علم و ادب ہے۔

◆ **محمد صدر عالم**: دویاپتی نگر، سمستی پور، بہار

✍ 'اردو دنیا' جنوری شمارے کے اداریہ میں 'ہماری بات' کے تحت عالمی مسائل میں جن جن زخموں کی نشاندہی آپ نے فرمائی ہے بلاشبہ وہ جلد اور پائیدار علاج کی متقاضی ہیں۔ یقین ہے، قومی اردو کونسل کے عہد نامے اپنے کشادہ نظریات کی بدولت اس جہان اور باشندگانِ جہان کی بقا اور سالمیت کے لیے کلیدی رول ادا کرنے کے قابل ہیں۔

◆ **محمد وسیم اختر**: ہدیٰ کالونی، کشن گنج، سنگھیا، بہار

✍ خوب صورت سرورق، مرزا غالب کی تصویر اور عکس تحریر سے مزین گوشۂ غالب پر تین مضامین: غالب کی ہشت پہلو شخصیت تماشا تھی اور تماشائی بھی، غالب سے منسوب یادگاریں، نسخۂ عرشی کی تدوین میں مولانا امتیاز علی عرشی کا طریقۂ کار کی شمولیت رنگین تصاویر سے آراستہ، معیاری نثری و شعری مشمولات سے مزین ماہ دسمبر کا اردو دنیا باصرہ نواز ہوا جس میں مدیر محترم نے ان فنکاروں کی بازیافت پر خصوصی توجہ دلائی ہے جن کی شخصیت و فن امتداد زمانہ کے سبب دھندلا گیا ہے جو ایک مثبت فکر ہے۔ ف س اعجاز سے لیے گئے انٹرویو میں اردو کے شعری و نثری ادب اور صحافت کے پس منظر کے ساتھ ساتھ موجودہ ادبی منظرنامے پر بھی بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ کلثوم فاطمہ نصیر کے مضمون 'کثیر لسانی ملک میں زبان کی تعلیم' میں سہ لسانی فارمولے اور اس کے نفاذ میں زبانوں کے پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل کو بڑے مبسوط انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔ لطیف احمد صاحب کا مضمون 'غالب کی ہشت پہلو شخصیت تماشا تھی اور تماشائی بھی' میں غالب کی سیرت کے ہمہ جہت پہلوؤں سے بخوبی روبرو کرایا گیا ہے۔ 'غالب سے منسوب یادگاریں' میں معروف صحافی سہیل انجم نے غالب کی حویلی، غالب اکیڈمی، غالب انسٹی ٹیوٹ وغیرہ پر تاریخ کے تناظر میں مفصل روشنی ڈالی ہے نیز حویلی میں اشعار غالب اور غالب کے نام میں املا کی جن فاش غلطیوں کی نشاندہی کی ہے وہ آج کے اردو کش دور میں حیرت کا باعث قطعی نہیں ہے۔ عبدالرزاق صاحب نے 'دیوان غالب نسخۂ عرشی کی تدوین' میں مولانا امتیاز علی عرشی کا طریقۂ کار کے تحت عرشی صاحب کے نکات تحقیق پر بڑی صراحت کے ساتھ بھرپور جائزہ پیش کیا ہے۔ محمد امجد نے نذیر احمد کے ناول 'مراۃ العروس' میں عورت کا تصور میں پلاٹ کے تانے بانے میں نسوانی کرداروں کی سیرت، نفسیات اور جبلت کی عکاسی تنقیدی پیرائے میں تقابل و توازن کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ محمد یوسف رضا نے 'مخمور سعیدی کے شعری افکار' کا تجزیہ ان کی شاعری کے عہد بہ عہد رجحانات کے تناظر میں کامیابی کے ساتھ کیا ہے۔ آفاق عالم صدیقی نے اپنے مضمون 'خود کفیل شاعر حمید الماس' میں شاعر کی سیرت و شخصیت کے باطن میں جھانک کر ان کے فکر و فن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ شرف الدین صاحب کا 'اپندر ناتھ اشک کا تخلیقی سفر' نہایت محنت و عرق ریزی سے لکھا گیا معلوماتی مضمون ہے۔ مظفر حسین سید کا 'تصوف بنیادی اہمیت و عصری معنویت' پر مغز و سیر حاصل مقالہ ہے۔ بھگوت گیتا کا عام فہم ترجمہ دل کی گیتا از محمد عتیق الرحمٰن، شوق نیموی کی غزل گوئی از ثاقب فریدی، محمد عمران کا اردو کا چینی نژاد شاعر شیدا چینی، ناندیڑ میں اردو صحافت، ضیاء الحسن،

ریحان انصاری کا تکنیکی سطح پر اردو زبان کو چیلنج انیس امروہوی کا رامانند ساگر وغیرہ مضامین فن اور شخصیت پر خاصے اہم ہیں۔ نشاط حسن نے 'فلمی نغمہ نگاری سنیما کی تاریخ کا روشن باب' میں فلمی نغمہ نگاری کا تاریخی تناظر میں انتہائی مبسوط جائزہ پیش کیا ہے۔ تبصرہ و تعارف کے علاوہ قومی و بین الاقوامی اردو خبرنامے کی شمولیت نے کوزہ میں سمندر بھر دیا ہے۔

❖ **محمد احمد دانش روانوی**: پوسٹ روانہ، شکارپور، ضلع بجنور، یوپی

✍ ماہنامہ 'اردو دنیا' جنوری کا شمارہ نہایت خوبصورت سرورق سے آراستہ ظہور پذیر ہوا ہے۔ اس میں محترمہ زرنگار کے مضمون میں جمیل مظہری کی نظموں میں رومانیت کے متعدد زاویوں کو نشان زد کیا گیا ہے۔ ان کا یہ شعر خودی کے جذبے کا حامل ہے اور اس کا بھی حوالہ دینا ناگزیر تھا:

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

جاوید عالم صاحب کا، اردو ہندی دونوں زبانوں کے ناول و افسانہ نگار منشی پریم چند کے آخری ناول 'گودان' کا تجزیہ ان کے دونوں ہی زبانوں کے عمیق و دقیق مطالعے پر مہر ثبت کرتا ہے۔ 'قدر' لفظ عربی زبان کا اگرچہ ایک مونث لفظ ضرور ہے، تاہم اس کی جمع 'اقدار' بھی، (ہمیشہ 'صنف' سے 'اصناف'، 'قسم' سے 'اقسام'، 'وجہ' سے 'وجوہ'، 'رسم' سے 'رسوم'، 'بجز' سے 'بجوز' وغیرہ کی مانند) جمع ہونے پر بطور مذکر ہی ہمیشہ مستعمل ہوا کرتی ہے۔

جناب پی محمد داؤد محسن صاحب نے عالمی شہرت یافتہ شاعر کیفی اعظمی کی شاعری میں 'سوشلزم' کے جذبے کو اگرچہ معقول و مناسب اشعار کے حوالوں سے پیش کیا ہے، تاہم نغمہ نگار کے متعدد فلمی نغمات میں جس طرح سے اس جذبے کو دردآمیز لہجے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، وہ قابل مدح رہا ہے۔

دیگر تمام مشمولات بھی لائق ستائش و ادارے کے انتخاب مضامین کے ضمن میں ذوق سلیم و حسن ظن کا غماز ہیں۔

❖ **کرشن بھاوک**: کوٹھی نمبر A-201، گلی نمبر A-18، گورونانک نگر، پٹیالہ، پنجاب

✍ ماہ دسمبر 2017، اردو دنیا کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اس کے اداریوں کے موضوعات عوامی حسیت پر مشتمل ہوتے ہیں۔ زبان اور ادب کے عوامی مسائل اور وسائل پر مدیر دانش مندانہ روشنی ڈالتے ہیں۔ شکیل افروز نے ف

س اعجاز سے ایک خصوصی انٹرویو لیا جس میں رسالہ 'انشا' کی تاریخ، کردار، تہذیب، خصوصیات و خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آج کے ماحول میں بھی انشا اپنی خدمت انجام دے رہا ہے۔ ہمت اور حوصلے کا کام ہے۔ اکیسویں صدی میں اس طرز کا رسالہ اردو داں طبقہ کے لیے بیش بہا نعمت ہے۔

جنوری 2018 کا شمارہ بروقت ہدست ہوا۔ شمارہ وقت پر ملنے پر خوشی ہوتی ہے۔ اردو دنیا کے مدیر اور ان کے رفقا، کار کو نیا سال مبارک اور 69 واں یوم جمہوریہ مبارک ہو۔ 100 صفحات کا یہ شمارہ اپنے اندر ہمہ جہت صفات و ادبی خوبیاں لیے ہوئے ہے۔ یہ اردو کے روایتی ماحول کو عصری تقاضوں سے مربوط کرنے میں کلیدی رول ادا کر رہا ہے۔ مدیر نے ادب کے کردار پر دانش مندانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں ادب ہی ایک ترقی پسند صحت مند سماج کی تشکیل کرتا ہے۔ پی ایف رحمان صاحب نے اردو یونیورسٹی کا بیس سالہ سفر میں جامعہ میں مروجہ کورسز کی تفصیل دی ہے۔ عصری اور روایتی کورسز، نظامت فاصلاتی تعلیم کے کورسز اور مختلف وائس چانسلرز کے دور کے کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔ احمد سہیل نے ٹی ایس ایلیٹ شاعر اور نقاد مضمون میں بہت تفصیل سے معلومات فراہم کی ہیں۔ ان کی زندگی، ادبی نشیب و فراز، تنقیدی رویہ و نظریہ سے بحث کی ہے۔ اس شمارے کے باقی مشمولات بھی معلوماتی ہیں۔

❖ **ڈاکٹر محمد ناظم علی**: سابق پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ و اکاڈمک سینٹ ممبر، تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد

✍ میں آپ کے دونوں رسالوں 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' سے آل انڈیا اردو کتابی و تہذیبی میلہ میں واقف ہوا جو کہ 27 دسمبر 2014 سے 4 جنوری 2015 اورنگ آباد میں منعقد ہوا تھا۔ آپ کے اس رسالے 'اردو دنیا' نے جس طرح کی تحریروں سے اردو ادب کا دامن وسیع کیا ہے اس سے اردو کے فروغ کی رفتار تیز ہوئی ہے۔ 'نیا آسماں نئے ستارے' کالم کے ذریعے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی قابل تعریف قدم ہے۔

❖ **سہیم الدین بن خلیل الدین صدیقی**: ایم فل، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی، اورنگ آباد، دکن

■

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے افراد کے ذوق اور سطح کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ادب کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحریریں شائع کی جاتی ہیں مگر ایسے مضامین کو ترجیح دی جاتی ہے جو سائنسی، سماجی، ثقافتی اور تعلیمی شعبوں میں ہونے والی ترقیات کا احاطہ کرتے ہوں یا روزگار کے حصول میں معاون وسائل کی نشان دہی کرتے ہوں۔ یہ ہر طبقے کا رسالہ ہے اسی لیے اس میں تنوع کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' کی خوش بختی ہے کہ اسے ہندوستان بھر کے قلم کاروں کا تعاون حاصل ہے۔ ہر موضوع پر ہمیں مضامین ملتے رہتے ہیں۔ لیکن تمام مضامین کی فوری اشاعت ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اب قلم کاروں سے گزارش ہے کہ اپنے مضمون کے ساتھ چند سطروں میں مضمون کے اہم نکات کی نشان دہی فرمادیں تاکہ ترجیحی طور پر مضمون کو شامل اشاعت کیا جاسکے۔ برائے مہربانی اپنے مضامین، خبروں اور خط کے ساتھ اپنا موبائل نمبر اور مکمل پتہ ضرور فراہم کریں۔ معاوضے کے لیے بھیجے گئے فارم میں اپنے قلمی اور بینک اکاؤنٹ میں درج نام کی الگ الگ نشان دہی کریں۔

'اردو دنیا' کے لیے تمام مضامین/مکتوبات اردو دنیا کی ای میل آئی ڈی کے علاوہ درج ذیل آئی ڈی پر بھی ضرور ارسال کریں: director@ncpul.in

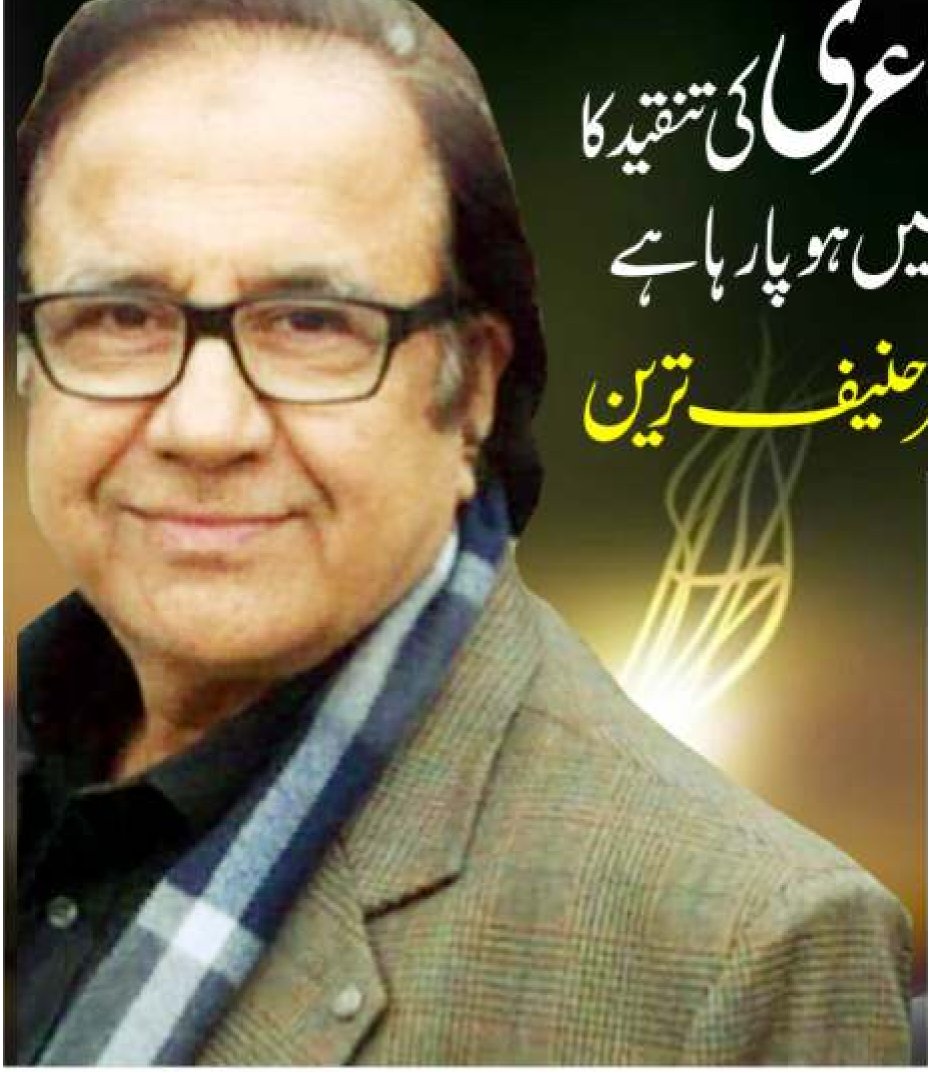

شاعری کی تنقید کا حق ادا نہیں ہو پا رہا ہے

ڈاکٹر حنیف ترین

غلام نبی کمار

انٹرویو

غلام نبی کمار: ڈاکٹر حنیف ترین صاحب اپنی زندگی کے بارے میں بتائیں؟ آپ اپنی پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت کے حوالے سے گفتگو کریں:

حنیف ترین: میری پیدائش سرائے ترین سنبھل یوپی میں ہوئی۔ میں بچپن میں بہت شرارتی تھا اور چلبلا پن تو میرے اندر انتہائی زیادہ تھا۔ اس لیے میرے ماں باپ کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ کہیں یہ بچہ ہمارے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ چنانچہ انھوں نے میرا داخلہ ایک مدرسے میں کرایا۔ جہاں میں ایک آدھ سال تک ہی ٹک پایا۔ اس کے بعد میرا داخلہ علی گڑھ کے منٹو سرکل اسکول (طاہر سیف الدین ہائی اسکول) میں کرایا گیا جہاں میرے بچپن کا زیادہ تر وقت گزرا۔ اس طرح میری اسکولنگ علی گڑھ میں ہی ہوئی ہے، جہاں سے میں نے Premedical کیا۔ اس کے بعد میرا سلیکشن آگرہ میڈیکل کالج میں ہوا۔ لیکن ہائی اسکول سے ہی میری دلی خواہش کشمیر میں ایم بی بی ایس کرنے کی تھی۔ لہٰذا سینٹرل گورنمنٹ کی طرف سے میرا Nomination ہوگیا۔ کیونکہ ہندوستان کے دیگر امیدواروں سے میری بہتر رینک آئی تھی اور ہاں Premedical! میں بھی میرا نام سرفہرست تھا۔ 1970 میں گورنمنٹ میڈیکل کالج سرینگر سے میری ایم بی بی ایس کی ٹریننگ شروع ہوگئی جو بالآخر 1975 میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ اس زمانے میں ایم ڈی میں داخلے کے لیے ایک سال کا ہاؤس جاب (House Job) کرنا پڑتا تھا۔ جس کے لیے میں نے سب سے پہلے سرینگر میں واقع چیسٹ ڈزیز ہاسپٹل (Chest Disease Hospital) میں چھ مہینے کا ہاؤس جاب کیا۔ یہ اسپتال سرینگر میں ورجن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد میں نے علی گڑھ کی جانب رخ کیا۔ جہاں سے مزید میڈیسن میں چھ مہینے کا کورس کیا۔ اس طرح دو مختلف جگہوں سے ایک سال کا ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد میرا داخلہ ایم۔ ڈی میں ہوا۔ یہ کورس بھی 1981 میں تین سالوں کے اندر اندر مکمل کرالیا۔ جس زمانے میں علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا اس دور میں ڈاکٹر طارق منصور صاحب میرے گہرے دوست ہوا کرتے تھے وہی پروفیسر طارق منصور صاحب جو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ وہ میرے ہم پیشہ تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میری ایم ڈی SPM میں ہوئی جبکہ پروفیسر موصوف کی سرجری میں۔ ایم۔ ڈی مکمل کرنے کے بعد میں SPM کے اندر ہی Demonstrator ہوگیا۔ وہاں سے نکلنے کے کچھ مہینوں بعد میں بحیثیت عارضی لکچرر تعینات ہوا۔ چونکہ نوکری مستقل نہیں تھی اس لیے بہت جلدی اس کو الوداع کہنا پڑا۔ پڑھائی مکمل کرنے کے فوراً بعد میں سعودی عربیہ چلا گیا۔ جہاں 1982 سے 2004 تک میرا قیام رہا۔ چنانچہ بائیس برس کے طویل وقفے بعد میں واپس انڈیا لوٹا۔ یہاں میں نے Apollo جوائن کیا اور چار سال تک Psychiatry شعبہ میں خدمات انجام دیں۔

غ ن ک: آپ سائنس کے طالب علم رہے ہیں، پھر آپ کو شاعری کا شوق کیسے ہوا؟

حنیف ترین: شاعری سے مجھے بچپن سے ہی کافی لگاؤ تھا۔ جب میں بہت چھوٹا تھا تو ہمارے گھر میں حضرت علامہ اقبالؒ کی نظمیں شکوہ اور جواب شکوہ اکثر و بیشتر پڑھی جاتی تھیں اس کے علاوہ جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو یہ دونوں نظمیں مجھے ازبر ہوگئی تھیں۔ جب میں Premedical میں تھا تو دوستوں سے ملنا اور ان کے ساتھ چائے پینا میرا معمولی مشغلہ تھا۔ میں بات کر رہا ہوں 1967-68 کے زمانے کی۔ اس زمانے میں کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کا بھی بڑا زور تھا۔ جب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو وہاں منعقد کیے جانے والے مشاعروں میں کیفی اعظمی اور علی سردار جعفری کو ضرور بلایا جاتا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ علی سردار جعفری آتے تو زیادہ تر قیصر زیدی صاحب کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ ان کی بیگم ساجدہ زیدی مشہور شاعرہ تھیں۔ اگر مجھے شاعری کا ذوق نہیں ہوتا تو میں کیوں رات رات بھر سلام مچھلی شہری کی نظمیں سننے بیٹھتا۔ مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ ہم کئی بار مشاعروں سے بدایوں کے طنز ومزاح کے مشہور

شاعر جن کا نام اس وقت یاد نہیں آرہا ہے، کو پکڑ کر اپنے ہوسٹل لے آتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ معروف شاعر بیکل اتساہی کو بھی اپنے ساتھ ہوسٹل لے آئے۔ اس زمانے میں ان کی یہ غزل بہت مشہور ہوئی تھی۔

اے میری جانِ غزل روحِ غزل حسنِ غزل
آ تجھے گیت کا اندازِ ترنم دے دوں

جب میں ڈاکٹری کی تعلیم کے سلسلے میں کشمیر گیا تو وہاں شاعری کے تعلق سے کوئی خوشگوار ماحول نہیں ملا، میڈیکل کالج کا بھی یہی حال تھا۔ البتہ ہمارے کالج میں گونی صاحب کی شہزادی شمع گونی پڑھتی تھیں۔ گونی صاحب اس وقت جموں کے ایک صوبہ کشتواڑ کے ایم۔ایل۔اے ہونے کے ساتھ ساتھ ریاست کے ہیلتھ منسٹر بھی تھے۔ جموں و کشمیر میں اس وقت کے چیف منسٹر سید میر قاسم کی بیٹی شمشاد قاسم ہمارے ساتھ پڑھتی تھیں۔ ہمارے ساتھ ہندوستان کے صدر وی وی گیری کا پوتا بھی پڑھتا تھا۔ سب بڑے بڑے خاندانوں کے بچے میڈیکل کالج میں ہمارے ساتھی رہے ہیں۔ ان سب میں رہ کر میں سوچتا تھا کہ میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ انھی دنوں کالج میں ایک فنکشن ہوا۔ تو میں نے وہاں ایک غزل پڑھی جو Super Hit ہوگئی۔ وہاں سے مجھ پر شاعری کا نشہ کچھ زیادہ ہی چڑھ گیا۔ اس کے بعد ایک اور فنکشن ہوا جس میں، میں نے نظم سنائی تو اس پر بھی مجھے بے شمار داد ملی۔ آہستہ آہستہ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں تو شاعری کا اچھا خاصا مذاق رکھتا ہوں۔ اس طرح ایک روز میں ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کے پاس پہنچ گیا جو خود بھی بڑے شاعر تھے اور اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سرینگر کے چیف پروڈیوسر تھے۔ میں نے انہیں اپنی نظمیں دکھائیں جن کی انھوں نے اصلاح کی اور اسی وقت بولے کہ آؤ میں تمھاری ریکارڈنگ کرا دیتا ہوں۔ آل انڈیا ریڈیو پر وہ میری پہلی ریکارڈنگ ثابت ہوئی۔ 1976-77 کی ہی بات ہے کہ آکاش وانی نے نوجوانوں کے لیے یووانی سروس کا آغاز کیا تھا۔ جس نے بہت سے شاعروں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔ آج کے بہت سے بڑے شاعر یووانی سروس کی ہی دین ہے۔

غ ن ک : آپ کی پہلی تخلیق کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟

حنیف ترین: میری پہلی تخلیق 'شمیم' کے عنوان سے ہفتہ وار 'اخبارِ نو' میں شائع ہوئی تھی۔ یہ اخبار م افضل کی ادارت میں دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ شروع میں میرا بیشتر کلام اسی اخبار میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد ہند و پاک کے معتبر رسائل و جرائد میں میرا کلام تواتر کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں جتنے بھی بڑے بڑے اخبار اور رسائل و جرائد شائع ہوتے تھے سب میں میری تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ مجھے چند رسائل کے نام یاد آرہے ہیں جنھوں نے میرے گوشے شائع کیے ہیں ان میں چہار سو، اسباق، شاعر، استعارہ، رنگ، سبق اردو، تمثیل نو، لاریب، توازن، کوہسار، ارتکاز، معلم اردو، وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ماہنامہ 'کتاب نما' میں میری شخصیت اور شاعری پر 2004 میں خصوصی شمارہ شائع ہوا ہے۔ تقریباً میرے اوپر شائع شدہ گوشوں کی تعداد ڈیڑھ درجن سے زیادہ ہوگی۔ مجھے اسّی فیصد لوگ پاکستانی سمجھتے تھے کیونکہ میں زیادہ تر پاکستانی رسائل میں چھپتا تھا۔

غ ن ک : اردو میں آپ کی محبوب صنفِ سخن کون سی رہی ہے اور کیوں؟

حنیف ترین: نظم / صنفِ نظم مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ نظم میں شاعر اپنی بات کو اچھی طرح کہہ سکتا ہے۔ اس میں مختصر طور پر بھی اپنی بات کہہ سکتے ہیں اور مفصل انداز میں بھی اپنے خیال کو صفحۂ قرطاس پر رقم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ Situation پر انحصار کرتا ہے۔ بعض جگہوں پر وضاحت بھی درکار ہوتی ہے جس سے نظم میں رچاؤ آجاتا ہے، مزہ آجاتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے جب تک نظم میں رچاؤ نہیں ہے، تسلسل نہیں ہے، شگفتگی نہیں ہے، تخلیقی حسن نہیں ہے تب تک شاعری بھی اصل حسن سے عاری نظر آتی ہے، اس لیے اس آرٹ میں مزہ نہیں ہے جو نظمیہ خوبیوں سے عاری ہو۔ کیونکہ یہ آرٹ مخصوص ذہنوں کا حصّہ ہوجاتا ہے جو کبھی شہرت نہیں پا سکتا۔

غ ن ک : حنیف ترین صاحب آپ نے کثیر تعداد میں نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔ آپ غزل گو شاعر کہلانا پسند کریں گے یا نظم گو شاعر؟

حنیف ترین: اس کا جواب دینا تھوڑا مشکل محسوس ہو رہا ہے کیونکہ میں غزل اور نظم دونوں کا شاعر ہوں اور میں نے دونوں اصناف میں متوازن انداز میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ قارئین بھی میری شعری تخلیقات کو برابر پسند کرتے رہے ہیں۔ جہاں میری نظمیہ شاعری کا تعلق ہے، اس میں مختصر سے لے کر طویل ترین سب نظموں کو مقبولیت حاصل ہوچکی ہے۔ وہیں میری غزلیں بھی ایک انفرادی موضوع، لب ولہجہ، آہنگ اور انداز بیان کے سبب خاصی پسند کی جاتی رہی ہیں جس سے مجھے قلبی اطمینان بھی حاصل ہوتا ہے۔ میری نظم 'باغی سچے ہوتے ہیں' پونے چار سو مصرعوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ میری وہ نظم ہے جسے سن کر لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں اور یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ واہ! کیا شاعری ہے۔ غزلوں کی جہاں بہت سی خصوصیات گنائی جاسکتی ہیں وہیں اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ غزل میں کم سے کم الفاظ استعمال ہوں۔ جن میں اشارے کنایے ہوں۔ اس کے لفظوں میں ارتباط ہو۔ کچھ غزلیں تو اچھی ہوتی ہیں لیکن ان میں الفاظ مربوط نہیں ہوتے۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میری غزل گوئی اور نظم گوئی میں وہ خوبیاں موجود ہیں جو اسے جاویدانی بخش سکتی ہے۔ باقی سب قارئین پر چھوڑ دینا چاہیے۔

غ ن ک : آپ نے نظم اور غزل کے علاوہ کسی اور صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے؟

حنیف ترین: جی ہاں! میں نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ قطعے، ترائیلے، دوہے، ہائیکو وغیرہ بھی کہے ہیں۔ آپ میری چھوٹی چھوٹی نظموں میں جاپانی سے مستعار صنف ہائیکو کی خصوصیت پائیں گے۔ میں نے ہائیکو میں کسی کی نقل نہیں کی ہے بلکہ میری جتنی بھی نظمیں ہیں وہ سب میں نے اپنے اسٹائل اور انداز کی کہی ہیں جس میں کسی کی تقلید نہیں۔ میں نے ایسی نظمیں لکھی ہیں کہ سامع بھی حیرانگی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک نظم

ملاحظہ فرمایئے۔

کون کیوں کہاں کیسے
اس کے ان سوالوں سے
گھر میں شور رہتا ہے
قربتوں کی خوشبو کا آبشار بہتا ہے

دیکھیے کتنی چھوٹی سی نظم ہے اور کس قدر وسیع مفہوم کی حامل۔ ایک تو اس میں روانی بھی ہے دوسری اہم بات یہ کہ اس میں شگفتگی کا عنصر بھی موجود ہے۔ جو مجھے ذاتی طور پر محسوس ہوا، میں نے کہہ دیا باقی ادب کے سنجیدہ اور باشعور قاری اس کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔

غ ن ک : حنیف ترین صاحب آپ کا پہلا شعری مجموعہ کب اور کہاں سے شائع ہوا ہے؟ مزید یہ بھی بتائیں کہ اس تک آپ کی کل کتنی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

حنیف ترین: میرے پہلے شعری مجموعے کا نام 'رباب صحرا' ہے جو 1992 میں مالیگاؤں سے توازن پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ 'رباب صحرا' کا اجرا انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی میں ملک کے اس وقت کے وزیر اعظم آئی کے گجرال کے ہاتھوں ہوا تھا۔ 'رباب صحرا' کی اشاعت میں میرے استاذ مرحوم عتیق احمد عتیق صاحب کی کرم فرمائیاں شامل رہیں۔ اردو زبان سیکھتے سیکھتے میرے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ اس کے بعد بھی میں اردو کی لغات کا کثرت سے مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مجھے آج بھی اردو زبان صحیح نہیں آتی کیونکہ زبان پر مکمل عبور ہونا چاہیے۔ اس میں الفاظ کا بڑا مسئلہ ہوتا ہے، اس کی ادائیگی اہم ہوتی ہے اور اس کا سامع پر مثبت اثر پڑنا بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

غ ن ک : آپ برسوں سعودی عرب میں مقیم رہے ہیں اس لیے وہاں کے پورے ادبی منظرنامے سے متعلق آپ یقیناً جانکاری رکھتے ہوں گے۔ وہاں کی اردو زبان کی صورتِ حال اور امکانات پر روشنی ڈالیے؟

حنیف ترین: سعودی عرب میں ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی اور دیگر ایشیائی ممالک کے بے شمار مہاجر آباد ہیں۔ ہندوستان سے زیادہ تر لوگ نارتھ انڈیا کے رہنے والے ہیں۔ جن میں بیشتر لوگوں کے بچے اردو پڑھتے ہیں، بولتے ہیں اور سیکھتے ہیں۔ اس لیے سعودی عرب میں جہاں جہاں ہندوستانی اور پاکستانی مہاجرین کی بستیاں آباد ہیں وہاں انڈین اور پرائیوٹ اسکولوں میں اردو بطور ایک مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو وہاں کی شہریت مل گئی ہے۔ شہریت ملنے سے سعودیوں اور مہاجرین لوگوں میں یکجہتی

تعارف نامہ: حنیف ترین

نام: ڈاکٹر حنیف شاہ خان ترین **تخلص:** حنیف **قلمی نام:** حنیف ترین

والد کا نام: (مرحوم) حبیب شاہ خان، **تاریخ پیدائش** : یکم اکتوبر 1951، سرائے ترین سنبھل (یوپی)

تعلیمی قابلیت: ایم۔ڈی (ماسٹر آف میڈیسن)، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 1981، ایم بی بی ایس، یونیورسٹی آف کشمیر (سرینگر) 1975، **پیشہ:** طبابت

ملازمتیں:۔ • چیف میڈیکل آفیسر، Hefco Medicare and Research Centre، بھرت نگر، نئی دہلی۔ 15 جنوری 2015 تا حال • 9 مارچ 1982 تا 2007 تک سعودی عرب کی منسٹری آف ہیلتھ میں مختلف عہدوں پر فائز رہے • 10 اگست 2008 سے 9 اگست 2014 تک Apollo دہلی میں کام کیا۔

تصانیف:۔ رباب صحرا (1992)، کتاب صحرا (جنوری 1995)، کشتِ غزل نما (جنوری 1999)، زمین لاپتہ رہی (2001)، ابابیلیں نہیں آئیں (2004)، میں نے زلزال کو لفظوں میں اتر کر دیکھا (2006)، روئے شمیم سے نزہت عشق کی بہتی ہے (جون 2011)، لالۂ صحرائی (جنوری 2014)، پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں (جنوری 2016)، The Truth of Terrorism (انگریزی زبان میں نظموں کا مجموعہ) 2009، بعید عن الوطن (عربی سے اردو ترجمہ)، لم تنزل الابابیل (عربی سے اردو ترجمہ)، ظہیر غازی پوری فن اور شخصیت (ترتیب)، حنیف ترین: شخصیت اور شاعری (2004)

زیر طبع کتابیں: ستیہ ے جے تے (ہندی مجموعہ)، دلت کویتا جاگ اٹھی ہے (ہندی مجموعہ)، ہے گوماتا (ہندی مجموعہ)، فلسطین (نظم)

اعزازات: • اردو اکادمی (دہلی)، اردو اکادمی (یوپی)، اردو اکادمی (بہار) وغیرہ سے کئی انعامات • بانی 'مرکز عالمی اردو مجلس' دہلی • رسالہ سہ ماہی 'دانش' زیر ترتیب

اور بھائی چارگی پیدا ہورہی ہے۔ جن کے بچے ایک ساتھ کھیل رہے ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ بچے عربی بول رہے ہوتے ہیں اور بعض اردو زبان۔ جس سے وہاں ایک نئی زبان کا ظہور ہورہا ہے اور وہ ہے اردو اور عربی کے بیچ والی زبان۔ اگر وہاں ہندوستان کے مسلمان ایک بینر کے تلے جمع ہوکر اردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے کی ڈیمانڈ کریں تو ایسا ممکن ہوسکتا ہے اور اگر ایسا ہوا تو اردو کی تہذیب ان تمام مسلمان ملکوں میں ابھرے گی جہاں ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔

غ ن ک : سعودی عرب میں ستائیس برس رہ کر آپ نے اردو زبان کے فروغ کے لیے کیا کیا؟

حنیف ترین: میں نے جاتے ہی 'بزم ارباب سخن عرعر' قائم کی۔ اس کے بعد اسی بزم کے بینر تلے وہاں پہلا مشاعرہ کیا جس میں پانچ شاعروں نے شرکت کی۔ وہ سب شعرا حیدرآباد کے تھے جس میں ایک تک بند تھا اور باقی الٹی سیدھی شاعری کرتے تھے۔ بہرحال رفتہ رفتہ لوگ جڑتے گئے اور کارواں بنتا گیا۔ اس مشاعرے کی رپورٹ کئی اخبارات میں آئی۔ پھر ہم نے سروے کیا اور نزدیک کے مختلف شہروں اور علاقوں سے اردو شعرا و ادبا کو تلاش کیا اور انہیں انجمن کے پروگراموں میں آنے کی دعوت دی۔ جو لوگ آتے تھے تو رات بھران کے ٹھہرنے کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ بیس برس تک یونہی جاری و ساری رہا۔ بعد ازاں دہلی آیا اور Apollo میں کام کرتا رہا۔ چار سال تک دہلی میں قیام کرنے کے بعد پھر سعودی چلا گیا جہاں میں نے ایک اور انجمن 'بزم رباب صحرا' کی بنیاد ڈالی۔ یہ انجمن چھ سال تک متواتر اپنی فعالیت کا ثبوت دیتی رہی۔ میں نے ہندوپاک کے بڑے بڑے شہروں سے ادبا و شعرا کو بلایا اور بین الاقوامی سطح کے پروگرام منعقد کروائے۔ میری کئی کتابوں کا اجراء سعودی میں ہی ہوا۔ اس طرح کے پروگراموں پر میں نے کافی پیسہ خرچ کیا۔ اس کے پس پشت میرا اوّلین مقصد اردو زبان کی ترقی تھی۔

غ ن ک : کیا سعودی عرب میں شعرا و ادبا کی تخلیقات کی اشاعت کا کوئی وسیلہ تھا؟

حنیف ترین: جی ہاں صاحب! میری نظمیں اور غزلیں اردو نیوز میں شائع ہوتی تھیں۔ ان کا ایک میگزین بھی نکلتا تھا۔ جس کی اشاعت پر بعد میں حکومت نے پابندی عائد کردی۔ ایک پاکستانی صحافی محمد نسیم صاحب نے بھی ایک رسالہ جاری کیا تھا جس میں میری تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔ یہ رسالہ کافی وقت تک شائع ہوتا رہا۔

غ ن ک : کیا آپ اردو کی تیسری بستی میں ہورہی اردو سرگرمی سے متفق ہیں؟

حنیف ترین: 50-50 فی صد صورتِ حال ہے جس سے بہت حد تک متفق ہوں اور مطمئن بھی۔ اگر اردو کی

انٹرویو

میں برسوں سعودی عرب میں رہا ہوں اور شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا جب مجھے اپنے وطن کی یاد نہ آئی۔وطن کی دوری کا کرب اور اس سے محبت کا احساس آپ کو ہماری شاعری سے بخوبی ہوگا۔ذرا غور سے اشعار میں جھانکیں آپ کو بے شمار ایسے اشعار ملیں گے جن میں وطن کی سرشاری موجود ہے۔میری کتاب 'پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں' دیکھیے جس کاایک پورا باب ہجرت رنگ پر مشتمل ہے۔

تیسری بستی میں کام نہیں ہوتے تو کیونکر لوگ یہاں سے اپنی کتابیں شائع کرواتے، کیونکر وہ یہاں اپنی کتابوں کا اجراء کراتے یا اس کے برعکس دیکھیے۔ جو یہاں سے جا کر لوگ وہاں اپنی کتابوں کا اجرا کراتے ہیں، مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ خود ہی اندازہ کر لیجیے اگر صورت حال خراب ہوتی تو کیا یہ سب کچھ ممکن تھا۔

غ ن ک: شاعری میں آپ کا پسندیدہ موضوع کیا رہا ہے اور کیوں؟

حنیف ترین: مزاحمت! مزاحمتی شاعری۔

غ ن ک: مزاحمتی شاعری ہی کیوں؟

حنیف ترین: اس لیے کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے اس میں دو قسم کے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ایک وہ لوگ جن کے پاس ہے اور ایک وہ لوگ جن کے پاس نہیں ہے۔ یعنی جن کے پاس ہے وہ چھینتے رہتے ہیں ان لوگوں سے جن کے پاس نہیں ہے۔ اس کو انگریزی میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں Those Who Have and Those Who Have Not۔ اس کے لیے جبر کا طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ یہاں ایک امیر ہے اور دوسرا غریب، ایک ظالم ہے اور دوسرا مظلوم اور ایک طاقت ور ہے اور دوسرا کمزور۔ مگر یہ لوگ دنیا میں مختلف شکلوں میں جنم لیتے رہے ہیں اور جب تک دنیا کا وجود ہے یہ لوگ آتے رہیں گے۔ شاعر آئے ہیں، ستیہ میو جے تے کہنے والے سادھو لوگ آئے ہیں، آرٹسٹ آئے ہیں جنھوں نے قوم، وطن، مذہب اور انسانیت کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ بات ہوئی تھی مزاحمت اور مزاحمتی شاعری کی اور یہ اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ جس سے مزاحمت نے جنم لیا ہے۔ کیونکہ مزاحمت ہے برائی کے خلاف، مزاحمت ہے اس بے حساب طاقت کے خلاف جو دوسروں کو نقصان پہنچا رہی ہے، مزاحمتی شاعری میری ہے غم کے خلاف، درد کے خلاف اور پستی کے خلاف۔ میری شاعری میں اولوالعزمی ہے، ولولہ ہے، وہ حوصلہ عطا کرتی ہے۔ میں ہمیشہ یہ شعر دہراتا ہوں:

ہو حوصلے کی اگر فوج ساتھ میداں میں
اکیلی ذات بھی جم غفیر لگتی ہے

آپ اس قسم کے پچاسوں شعر میرے شعری مجموعوں میں پائیں گے۔ کیونکہ میں پستی، غربت، محرومیت، غم، دکھ، درد، لاچاری، مظلومیت، بے بسی، کمزوری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ چیزیں میری روح پر خنجر کی طرح وار کرتی ہیں، مجھے اذیتیں پہنچاتی ہیں۔ میرے ذہن وقلب کو تب سکون میسر ہوگا جب ایک انسان ان چیزوں سے باہر نکل کر مردانہ وار طریقے اور حوصلہ مندی سے دنیا اور دنیا کے مسائل و مصائب کا سامنا کرے گا۔ جس سے وہ باقیوں کے لیے جینے کا سلیقہ، زندگی کی قدر و قیمت، اہمیت اور معنویت کو سمجھے گا۔

غ ن ک: حنیف ترین صاحب کیا آپ موجودہ تنقید سے مطمئن ہیں؟

حنیف ترین: نہیں! مطمئن نہیں ہوں کیونکہ شاعری کی تنقید کا واجب حق ادا نہیں ہو رہا ہے۔ یہاں آج بھی گروپ بندی کا دور رائج ہے۔ اپنے اپنے لوگوں کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ سو شاعروں کے کلام کا انتخاب چھپتا ہے جس میں حنیف ترین کا نام کہیں نہیں ہے۔ اوروں سے کیا گلہ شکوہ کریں ہمیں تو اپنوں نے فراموش کر دیا۔ سنبھل جہاں کا میں رہنے والا ہوں وہاں سے اب تک کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جس میں حنیف ترین کے بغیر باقی سارے نام ہیں۔ اس بات کا اظہار میں نے وہاں ایک پروگرام میں بھی کیا تھا۔ واجب حق تب ادا ہوتا جب متوازن انداز نقد کا طریقہ کار اپنایا جاتا۔

غ ن ک: عرب اور مغربی ممالک میں مقیم مشرقی مہاجرین شعرا پر آج کل سخت تنقید کی جاتی ہے۔ ان پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کی شاعری ہجرت کے کرب اور ملک کے جذبے سے عاری نظر آتی ہے۔ کیا آپ ہماری اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں؟

حنیف ترین: نہیں! یہ سراسر غلط ہے بلکہ سب کو برابر اپنے وطن کی یاد آتی ہے۔ اس تجربے سے میں گزرا ہوں یا وہ لوگ جو یہاں رہ کر باتیں کر کے مزہ چکھتے ہیں۔ میں برسوں سعودی عرب میں رہا ہوں اور شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا جب مجھے اپنے وطن کی یاد نہ آئی۔ وطن کی دوری کا کرب اور اس سے محبت کا احساس آپ کو ہماری شاعری سے بخوبی ہوگا۔ ذرا غور سے اشعار میں جھانکیں آپ کو بے شمار ایسے اشعار ملیں گے جن میں وطن کی سرشاری موجود ہے۔ میری کتاب 'پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں' دیکھیے جس کا ایک پورا باب ہجرت رنگ پر مشتمل ہے۔

غ ن ک: حنیف ترین صاحب آپ اردو کے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس سلسلے میں آپ نے کوئی پہل کی ہے؟

حنیف ترین: اردو کے لیے مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ میرے بہت سے ارمان ہیں جو ان شاء اللہ بہت جلد پورے ہو جائیں گے۔ میں ایک اردو اکادمی قائم کرنے جا رہا ہوں جس کا عمل جاری ہے۔ بہت جلد اس خواب کی بھی تکمیل ہوگی۔ اس کے علاوہ ایک سہ ماہی رسالہ 'دانش' عنقریب شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس وقت ایک انجمن 'مرکز عالمی اردو مجلس' کا صدر ہوں جس کے تحت پچھلے تین مہینوں سے مسلسل تین مشاعرے منعقد کیے گئے ہیں۔ جہاں ہم مختلف ادبا و شعرا کا استقبال کرتے ہیں اور ان کے اعزاز میں محفل مشاعرہ بھی رکھتے ہیں۔ اس انجمن کی تینوں نشستیں کامیاب رہی ہیں اور لوگوں سے حوصلہ افزا پیغامات بھی موصول ہو رہے ہیں۔

غ ن ک: آپ کس شاعر کو پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

حنیف ترین: اختر الایمان! میں اختر الایمان کو ہی پسند کرتا ہوں اور انہی کی شاعری کا زیادہ مطالعہ کرتا ہوں۔ جی ہاں! مجھے متاثر بھی اختر الایمان کی شاعری نے ہی کیا ہے۔

غ ن ک: آپ کس قسم کی کتابیں پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں؟

حنیف ترین: قرآن شریف کی قرأت کو معمول کی زندگی میں اوّلین ترجیح دیتا ہوں۔ مزید اردو میں شاعری، فکشن اور نثر تینوں اصناف پر مشتمل کتابیں پڑھنے کا شوق رکھتا ہوں۔

غ ن ک: آپ اردو کے کس شاعر کی کتاب پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں؟

حنیف ترین: زمین زمین (اختر الایمان)۔

غ ن ک: اب اخیر میں آپ اپنے قارئین کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

حنیف ترین: ایمانداری، جوش، جذبے، جنون، حوصلے، لگن اور محنت سے کام کریں۔ جس کام کی ٹھان لیں وہ دل سے کریں کامیابی آپ کے قدم ضرور چومے گی۔

■

Ghulam Nabi Kumar
P-98, 4th Floor, Lane-2, Batla House
New Delhi-110025
kumarnabi.gnk@gmail.com
Mob:-7053562468 7006748304

مسلم خواتین کی تعلیمی پسماندگی

نجمہ سلطانہ

تعلیم

تعلیم انسان کے فروغ کے لیے بنیادی آلہ ہوتا ہے اسی کے ذریعے انسان میں معلومات اور مہارت کا اضافہ ہوتا ہے۔

(Education of women empowermen2011,p104)

تعلیم کا عمل انسان کی پیدائش سے ہی شروع ہو جاتا ہے اس طرح سماج میں سیکھنے اور سکھانے کا عمل ہی تعلیم ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہی انسانوں کو زندگی کے مسائل سمجھنے اور چیزوں کی نوعیت کو جاننے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ تعلیم بہتر زندگی گزارنے میں کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے انسان کا شعور بیدار ہوتا ہے اور وہ روشن خیال اور وسیع النظر ہوتا ہے۔

تعلیم نسواں

خواتین کی ترقی سے ملک کی ترقی وابستہ ہوتی ہے کوئی بھی ملک اس وقت تک ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتا جب تک وہاں کی خواتین تعلیم یافتہ نہیں ہوں کیونکہ خواتین ہی ملک کی بنیاد ہوتی ہیں۔ عورت نسل انسانی میں اہم رول ادا کرتی ہے خواتین ہی خاندان کی دیکھ بھال اور تربیت کرتی ہیں خواتین کے وجود کو الگ کرکے ترقی کی منزلوں کو طے نہیں کیا جا سکتا اور ترقی حاصل کرنے کے لیے خواتین کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

بقول پنڈت جواہر لال نہرو:

''کسی ملک کی کارکردگی کا اندازہ اس ملک کی عورت کی حیثیت سے لگایا جا سکتا ہے۔''

(Discovery of India, 1946, p 42)

عورت کا ترقی یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے خواتین کو ترقی کے دھارے میں لانے کے لیے عورت کو تعلیم یافتہ بنایا جائے کیوں کہ عورت سماج کا نصف حصہ ہوتی ہے اور اس نصف حصے کو بھی ترقی کے دھارے میں شامل کرنا چاہیے۔ تعلیم سے آراستہ خاتون کو خاندان میں خودمختاری ملتی ہے۔ خواتین زندگی کے مختلف میدانوں میں مردوں کے مقابلے میں پیچھے سمجھی جاتی ہیں اس کی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔

عصر حاضر میں اتنی ترقی کے باوجود خواتین کا استحصال ہوتا ہے جس میں جرم اور گناہ کی شکار کوئی ایک صنف ہوتی ہے۔

صنف

صنف سے مراد سماج کے بنائے ہوئے مخصوص کردار ہوتے ہیں جو زندگی کی ہر سطح پر عورت اور مرد میں تخصیص پیدا کرتے ہیں۔ (عورت اور سماج، ص 68)

صنف کی بنیاد پر پوری دنیا میں ہر تیسری خاتون تشدد اور ظلم کا شکار ہے۔ خواتین جو سماجی تشدد کا شکار ہوتی ہیں ان میں صنفی امتیاز، بچپن کی شادی، جنین کشی، جہیز کے لیے تشدد، جبری شادی، جنسی تشدد، جنسی ہراسانی، اس کے علاوہ تعلیم حاصل کرنے میں صنفی امتیاز۔

زندگی کے ہر میدان میں خواتین کو اس صورت حال سے گزرنا پڑتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اگر خواتین کا جائزہ لیا جائے تو دنیا میں دو تہائی کام کا بوجھ اٹھاتی ہیں۔ وہ معاشی سرگرمیوں سے ہمیشہ متاثر ہوتی ہیں، ان کے پاس مواقع کم ہوتے ہیں اور دوسرے جو وہ کام کرتی ہیں وہ شمار نہیں کیا جاتا۔ اگر تعلیم نسواں کا جائزہ لیا جائے تو مردوں کے مقابلے میں خواتین کی تعلیم بہت کم ہے۔

2001 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں تعلیم کی شرح 64.8% اس میں مرد 75.3% اور خواتین کا تعلیمی فیصد 53.7% ہے۔ ہندوستان کے تمام صوبوں میں شرح خواندگی میں جنسی تفریق موجود ہے۔''

(Strastical handbook)

پرائمری سطح تک تعلیم حاصل کرنے والے جملہ افراد کی تعداد 146740047 ہے جس میں مرد 8352450 اور 63214597 خواتین ہیں۔ خواتین کا تناسب 43.07% ہے میٹرک اور یا ثانوی سطح تک جملہ افراد 79229721 جس میں مرد 51201516 اور خواتین 28028205 ہیں اس میں خواتین کی شرح خواندگی 35.37% ہے۔

ہائر سکنڈری/سینئر سکنڈری تک تعلیم حاصل کرنے والے جملہ افراد کی تعداد 37816215 ہے اس میں مرد 24596339 اور خواتین 13219876 ہے اس میں خواتین کا فیصد 34.95% ہے گریجویشن میں خواتین کا فیصد 20.88% ہے۔ (2001 مردم شماری)

پی جی میں خواتین کا تعلیمی فیصد 36.30% ہے۔ انجینئرنگ اور ٹکنالوجی میں 18.65% خواتین تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ میڈیسن کی تعلیم حاصل کرنے والی خواتین کا فیصد 30.37% ہے۔ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والی خواتین کا تناسب 43.91% ہے۔

2011 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں تعلیم کی شرح 74.04% ہے اس میں مردوں کا تناسب 82.14% ہے جب کہ خواتین 65.46% ہے۔ ہندوستان میں شرح خواندگی میں جنسی تفریق موجود ہے مرد و خواتین میں سب سے کم فرق ریاست کیرالا میں ہے۔ پرائمری سطح سے کم تعلیم حاصل کرنے والی خواتین کا تناسب 46.59% ہے۔ مڈل کلاس تک تعلیم حاصل کرنے والی خواتین 42.02% ہیں۔ میٹرک یا ثانوی سطح تک تعلیم حاصل کرنے والی خواتین 39.80%۔ انٹرمیڈیٹ میں 40.36% خواتین شامل ہیں۔ گریجویشن اور اس سے آگے کی تعلیم حاصل کرنے والی خواتین 38.32%، انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کی سطح تک تعلیم حاصل کرنے والی خواتین 28.14% اور میڈیسن کی تعلیم کرنے والوں میں 39.23%۔ (2001 مردم شماری)

2001 سے 2011 کی مردم شماری میں خواتین کی شرح خواندگی میں 9.24% کا اضافہ ہوا ہے۔ اس کا اثر اعداد و شمار سے ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ جملہ ہندوستان کی سینسس کے حوالے سے مرد و خواتین کی تعلیمی حالت کو مختصراً لکھا گیا۔

اقلیت:

دستور ہند کے مطابق مسلمان قوم کو بھی ترقی کے مساویانہ مواقع اور حقوق حاصل ہیں جتنے کہ اس ملک کی دوسرے شہریوں کو حاصل ہیں۔ مگر مسلمانوں کی حالت اتنے مواقع ہونے کے باوجود بھی بہت ہی افسوس ناک ہے خاص کر تعلیمی میدان میں ان کا معیار کافی حد تک گرا ہوا ہے اور خاص کر مسلم خواتین تو بہت ہی پسماندہ اور ترقی کے نشانے سے بہت دور ہیں۔

مسلم خواتین میں غریبی بہت زیادہ ہے۔ اور تکنیکی مہارت میں کمی ہے جس کے نتیجے میں ان کی گھر کی آمدنی بھی کم ہوتی ہے اور وہ ہنر مند بھی نہیں ہوتیں اور خاص کر مسلم خواتین حکومت کے بنائے گئے پروگرام و پالیسیز سے بالکل ناواقف ہوتی ہیں۔ ان کا محور صرف گھر تک ہی محدود رہتا ہے۔ اس لیے تعلیمی پسماندگی کا تناسب دیگر طبقات سے کم ہے اس رپورٹ نے مسلمان طبقے کے بارے میں یہ انکشاف کیا کہ 25% بچے اسکول نہیں جاتے جس میں اکثریت لڑکیوں کی ہے۔ لڑکیوں میں ترک تعلیم کا تناسب لڑکوں سے زیادہ ہے۔ 12-14 سال کے جو لڑکے لڑکیاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں ان کا تناسب لڑکے 55% اور لڑکیاں 45% ہیں۔ ان کا تناسب عمر کے ساتھ ساتھ کم ہوتا جارہا ہے جیسے 15-16 سال کے لڑکے 35% اور لڑکیاں 18% تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ (سچر کمیٹی رپورٹ)

جیسے جیسے عمر بڑھ رہی ہے ان کا تعلیمی تناسب بھی کم ہوتا جاتا ہے۔ گریجویشن آرٹس کالج میں لڑکوں کا 3% اور لڑکیوں 3.5% اور آرٹس کالج پی جی میں لڑکوں کا 1.2% اور لڑکیوں کا 1.5% اور آئی ٹی شعبوں میں 1% ہیں اور میڈیکل سائنس میں لڑکے 6% اور لڑکیاں 4% اور پی جی میڈیکل میں لڑکے 6% اور لڑکیاں 2% ہیں۔ اس کے علاوہ دینی تعلیم حاصل کرنے والوں میں 4% مسلم طبقہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائے تعلیم میں شرکت کرنے والے بچوں میں 60% سرکاری اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں اور 30% خانگی اسکولس میں زیر تعلیم ہیں۔" (سچر کمیٹی رپورٹ)

ہندوستان میں خواتین کی تعلیم و ترقی میں بہتری ملک کی آزادی کے بعد آئی۔ 1971 میں صرف 22% ہندوستانی خواتین تعلیم یافتہ تھیں لیکن 2001 کے اختتام کے دوران ان کی شرح 54.18% ہوگئی۔ ہندوستانی سماج کے بہت سے شعبوں میں خواتین کے ساتھ امتیاز بڑھتا جارہا ہے۔ سروس سیکٹر میں خواتین کی موجودگی صرف 7.6% ہے اور پارلیمنٹ میں 8.0%، حالانکہ حکومت نے خواتین کو ریزرویشن فراہم کر رکھا ہے لیکن زیادہ تر خواتین تعلیم کی کمی کی وجہ سے اپنے حقوق سے ناواقف ہیں جس کی وجہ سے وہ معاشی طور پر کمزور پائی جاتی ہیں خاص کر مسلم خواتین میں تعلیم کی بہت زیادہ کمی ہے۔ وہ دوسرے طبقوں کی بہ نسبت بہت زیادہ مفلوک الحال ہیں اور پسماندہ زندگی گزار رہی ہیں۔

آج بھی خاص کر لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے میں کئی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے کم عمر کی شادی، گھر کے کام کی ذمہ داری کا بوجھ، چھوٹے بھائی بہن کی دیکھ بھال، صنفی امتیاز، زنانہ اسکول و اساتذہ کی کمی، گھر کے قریب اسکول نہ ہونے کی وجہ سے بلوغت کے بعد گھر سے اکیلے باہر بھیجنے کے لیے رکاوٹ، والدین کی معاشی پریشانی، اور اس کے علاوہ سب سے اہم رکاوٹ والدین کی ناخواندگی وغیرہ ہیں۔

معاشی پریشانیوں کی وجہ سے بھی کئی والدین لڑکیوں کو تعلیم نہیں دلواتے، تعلیم کا خرچ، شادی کا خرچ وہ برداشت نہیں کر سکتے، اس لیے اعلیٰ تعلیم میں مسلم خواتین صرف 1.5% ہی شامل ہیں۔

(National Commission for religious and linguistics, Vol: II)

اس کے علاوہ آبادی کا زیادہ تر حصہ مزدوری پر منحصر ہے، چاہے وہ زرعی ہو یا صنعتی، پسماندہ والدین اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلوانے کے لیے پیسہ خرچ نہیں کر سکتے۔ بعض گھرانوں کی گزر بسر صرف بچوں اور خواتین کی اجرت پر ہوتی ہے، اس کے علاوہ اگر اسکول میں مخلوط تعلیم ہو تو بلوغت کے فوراً بعد لڑکی کا اسکول ترک کروا دیا جاتا ہے۔

سماجی نظریات، سماجی مسائل، صنفی امتیاز کا راست اثر لڑکیوں کی تعلیم پر پڑ رہا ہے، اس کے علاوہ پدرسری نظام بھی مسلم خواتین کی ترقی میں رکاوٹ بنا ہوا ہے اور کم عمری کی شادی بھی ایک سنگین مسئلہ بنا ہوا ہے۔ مسلم سماج میں ہمارے ملک میں بچپن کی شادی پر امتناع عائد ہے لیکن اس کے باوجود اس قسم کے بے شمار واقعات پیش آتے ہیں۔ 1998 کے یونیسف کے سروے کے مطابق ہندوستان میں بچپن کی شادی کی شرح 47% ہے اور 2005 کی رپورٹ میں 30% بتائی گئی۔ خواتین کو تعلیم یافتہ اور خود مختار بنانے میں حکومت نے بھی بہت سے پروگرام اور پالیسیز بنائے ہیں اور اس کے علاوہ سچر کمیٹی کے انکشافات سے مسلم خواتین کی زبوں حالی کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے بعد مشرا کمیشن رپورٹ نے بھی خاص کر مسلم خواتین کی تعلیمی اور معاشی حیثیت کا تفصیلاً خاکہ پیش کیا۔ مشرا کمیٹی رپورٹ نے بھی مسلم خواتین کی پسماندگی اور معاشی طور پر مفلوک الحال بتایا ہے۔ اس سے پہلے بھی 1999 میں مسلم ویمن ان انڈیا میں سیما قاضی اس رپورٹ میں مسلم خواتین کی حیثیت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی سماجی، معاشی اور تعلیمی صورت حال پیش کی، مسلم خواتین کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے اپنی سفارشات میں کہا کہ تعلیم ہی ایک ذریعہ ہے جس سے مسلم خواتین کی ترقی ممکن ہو سکتی ہے اور انھوں نے یہ بھی سفارش کی کہ خاص مسلم خواتین کی ترقی کے لیے پالیسیز بنائی جائیں۔

سیدہ سیدین کی رپورٹ میں 2000 میں بے آوازوں کی آواز ہندوستان میں مسلمان عورتوں کی سماجی حیثیت قومی کمیشن برائے خواتین، اس کمیشن نے سروے کر کے اپنی رپورٹ میں مسلمان عورتوں کی حیثیت کا جائزہ لیا کمیشن کے مطابق عورتوں کی ساری مصیبتوں کی وجہ تعلیم کی کمی ہے۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے مسلم خواتین اپنے آپ کو کم تر سمجھتی ہیں اور ان کے اندر خود اعتمادی نہیں ہوتی جس کی وجہ سے وہ نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو جاتی ہیں، ان کی صلاحتیں ابھر کر سامنے نہیں آتیں اور پدرسری نظام نے ان کو غیر اہم قرار دے کر انھیں حاشیہ پر کھڑا کر دیا۔

جس سماج میں عورت کو برابر کا درجہ نہیں دیا جاتا اور وہ غیر محفوظ ہوتی ہیں اور اس کو برابر کے حقوق نہیں ملتے وہ سماج اور ملک کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا، ملک کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے مسلم خواتین کو بھی اعلیٰ تعلیم کی سہولیات میسر ہونی چاہیے اور سماجی معاشی و سیاسی حیثیت میں بہتری لانا ضروری ہے۔ تعلیم ہی واحد علاج ہے مسلم خواتین کی حیثیت کو بہتر بنانے کے لیے۔

حوالہ جات:

(1) سنسس 2001
(2) سنسس 2011
(3) Shariff Abdusaleh, Socia economic hindus and Muslims 1995
(4) Education of women empowerment 2011, Dr. Anil Kumar
(5) Unequal Citizen women 2004, Ritu minon & Zoha Hasan
(6) Syeda Saiydian hamed, My voice shall be heard of Muslim women forum 2003
(7) بے آوازوں کی آوز، سیدہ سیدین
(8) سیما قاضی، Muslim women in India, 1999

■

Najma Sultana
Ph.D Research Scholar (Dept of Women Education), Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad - 500032 (Telangana)

سرسید شناسی

سرسید کے خطابات

شمس بدایونی

انسانی زندگی میں اعتراف خدمات اور مرتبہ شناسی کی ہر دور میں علاحدہ علاحدہ صورتیں رہی ہیں۔ سرکاری سطح پر اعزازی عہدے، مناصب، ڈگریاں، فیلوشپ اور خطاب وانعام دیے جاتے ہیں۔ عوامی سطح پر جشن وخطابات کے ذریعے اپنے ممدوح کو خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں تک خطابات کا تعلق ہے، سرکاری سطح پر یہ کسی وصف خاص کے سبب عطا کیے جاتے ہیں اور عوام الناس کی طرف سے بھی یہ ایک طرح کے وصفی نام ہی ہوتے ہیں۔ یہ خطابات مثبت نوعیت کے بھی ہوتے ہیں اور منفی نوعیت کے بھی یعنی تحقیری، طنزیہ یا استہزائیہ۔ مثلاً حکیم الامت، شاعر مشرق، محسن الملک، مصور جذبات، کرستان، نیچری وغیرہ۔

سرسید احمد خاں (1817-1898) کو تین خطابات مثبت اور دو خطابات منفی نوعیت کے ملے۔ منفی خطابات وقتی ثابت ہوئے، لیکن مثبت خطابات ان کے نام کا حصہ بن کر آج تک زندہ ہیں۔ زیر نظر مضمون میں ان کے انھیں خطابات پر گفتگو مقصود ہے۔

سرسید بقول حالی 37 (حیات جاوید، مولانا حالی، ترقی اردو بیورو دہلی، 1990 ص 60) اور بقول شافع قدوائی 39 برس [1837 تا 1876] سرکاری ملازمت میں رہے۔ (سوانح سرسید ایک بازدید، شافع قدوائی، دہلی 2017، ص: 100) انھوں نے ملازمت کا آغاز اسی سال یعنی 1837 میں کیا جو بہادر شاہ ظفر اور ملکہ وکٹوریہ کا سال جلوس ہے۔ ملازمت کے دوران وہ اپنی حسن کارکردگی، ذمے داری، حب الوطنی، انگریزوں اور ملکی باشندوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے اور انگریزوں سے نفرت دور کرنے کے سبب انگریز حکمرانوں کے منظور نظر بن گئے اور مختلف اوقات میں 'تمغۂ حسن خدمت' کے مجاز قرار پائے۔ انھوں نے سررشتہ داری سے ملازمت کا آغاز کرتے ہوئے 1841 میں منصفی کا امتحان پاس کر کے 24 دسمبر 1841 کو مین پوری میں بحیثیت منصف چارج لیا اور صدر الصدور کے عہدے تک ترقی کی اور اسی عہدے سے قبل از وقت کالج کی مصروفیات کے سبب جولائی 1876 میں پنشن لے لی۔

اس دوران وہ سرکاری اداروں اور کمیٹیوں کے اعزازی ممبر بھی رہے۔ 4 جولائی 1864 کو انھیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کا اعزازی ممبر نامزد کیا گیا (حیات جاوید 68) ملازمت کے بعد جولائی 1878 میں وہ وائسرائے قانون ساز کونسل کے ممبر بنائے گئے۔ 1881 میں اس کے دوبارہ ممبر نامزد کیے گئے۔ (حیات جاوید: 224) 1882 میں امپیریل ایجوکیشن کمیشن کے رکن بنا دیے گئے (سوانح سرسید 122) 1887 میں پبلک سروس کمیشن کے ممبر نامزد ہوئے۔ (حیات جاوید 251)

ملازمت کے دوران ہی وہ اپنی قومی وملی خدمات کے سبب حکومت وقت اور اپنی قوم کے روشن خیال حلقے میں [جو بہت محدود تھا] مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ حکومت ان کی ذہانت وذکاوت اور ملک کی اقلیت یعنی مسلمانوں سے متعلق مسائل پر ان کی دانشورانہ فکر سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اور ان کے ذریعے مسلمانوں میں اپنا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنا چاہتی تھی۔

1857 سے پیشتر سرسید کی انگریز دوستی اور ان کی مذہبی فکر اختلاف کے دائرے میں نہیں آئی تھی۔ مغل دربار سے بھی ان کا تعلق خاندانی برقرار تھا۔ اسی تعلق کی بنیاد پر انھوں نے مئی 1839 میں 'جام جم' کے نام سے فارسی میں ایک کتاب رقم کی جس میں خاندان تیمور کے تقریباً 43 حکمرانوں سے متعلق [سترہ خانوں میں گوشوارے کی صورت میں] اہم تاریخی معلومات آگئی ہیں۔ یہ کتاب مئی 1840 میں اکبر آباد سے چھپ کر 26 صفحات پر شائع ہوئی۔ جس پر مصنف کی حیثیت سے ان کا نام 'منشی سید احمد خاں دہلوی' لکھا ہے۔ اسی سلسلے کے تحت آثار الصنادید (مطبوعہ سید الاخبار دہلی بار اول 1847) [جس کے دوسرے باب میں قلعۂ معلی کا تذکرہ ہے اور آخر میں بہادر شاہ کی مدح کی گئی ہے۔] سلسلۃ الملوک، دہلی 1852 اور آئین اکبری دہلی 1856 کی تصحیح واشاعت کو شامل کیا جاسکتا ہے۔

سرسید کے خاندان کی مغل دربار سے وابستگی اور وفاداری اور خود سرسید کی خاندان تیمور کے حکمرانوں کی تاریخ وآثار پر تصنیف وتالیف کا تقاضا تھا کہ مغلیہ حکومت کے فرماں روا ان کو خلعت وخطاب سے سرفراز کریں۔ 10 جنوری 1842 کو جب سرسید مین پوری سے تبادلہ ہو کر فتح پور آئے تو چند روز کے لیے دہلی بھی پہنچے۔ بقول حالی:

اسی زمانے میں بہادر شاہ نے سرسید کو ان کا موروثی خطاب عنایت کیا..... اگرچہ سرسید کے دادا کا خطاب صرف 'جواد الدولہ' تھا اور یہی خطاب لکھ کر حکیم احسن اللہ خاں نے پیش کیا تھا، مگر بادشاہ نے اس میں 'عارف جنگ' کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر کے" جواد الدولہ سید احمد خاں عارف جنگ" کا خطاب، سرسید کو عنایت کیا اور خطاب ملنے کی تمام رسمیں حسب قاعدہ ادا کی گئیں۔

(حیات جاوید 63)

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ سرسید کے دادا سید محمد ہادی اور ان کے بھائی سید محمد مہدی کو بالترتیب مغلیہ دربار سے جواد علی خاں، اور قباد علی خاں کا خطاب ملا تھا۔ سرسید نے 'جام جم' (اکبر آباد 1840) میں لکھا ہے کہ ان کے والد کو خطاب خانی عطا ہوا تھا اور وہ محمد اکبر شاہ دوم [عہد حکومت 1806 تا 1837] کے مقربین میں تھے۔ (ص 13) لیکن حالی نے لکھا ہے کہ سرسید کے والد سید محمد متقی نے باوجود بادشاہ سے قربت کے خطاب و

خِلعت لینا اپنے صوفیانہ مذاق کے سبب خلاف مصلحت سمجھا، (حیات جاوید 33) لیکن قلعۂ معلیٰ سے ان کی تنخواہ مقرر تھی۔ (سر سید درون خانہ/ افتخار احمد خاں/علی گڑھ 2006 ص16) سر سید کے نام کے ساتھ 'خاں' اور 'بہادر' کا لاحقہ دراصل ان کے دادا کے خطاب کی یادگار ہے۔ انھیں علاحدہ سے 'خان بہادر' کا خطاب نہیں ملا تھا۔

عمار فاروقی نے اپنی انگریزی کتاب ظفر اینڈ دا راج (دہلی 2013 ص 82-59) میں لکھا ہے: سید احمد مغل خاندان کی گروہ بندی سے بچنا چاہتے تھے اور ان کے والد کی بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر دوم سے قربت تھی اس لیے وہ دلی سے باہر چلے گئے اور یہ اعزازات [مراد خطاب وخلعت] ان کے غائبانے میں دیے گئے۔ (بحوالہ فکر ونظر علی گڑھ سر سید نمبر مارچ 2017 ص 270) مجھے اس بیان میں صداقت نظر نہیں آتی؛ کیونکہ سر سید نے 'سر' کا خطاب اور 'ڈاکٹر' کی اعزازی ڈگری کے حصول کے باوجود اپنے نام کے ساتھ مغلیہ خطاب کے اندراج سے احتراز نہیں کیا بلکہ وہ بعض جگہ بالخصوص اس کا اندراج کرتے ہیں۔ تفصیل آگے آئے گی۔

1857 کے بعد جب ملکۂ وکٹوریہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں سے ہندوستان کی حکومت پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لی، تب 23 فروری 1861 کو انھوں نے ہندوستان کے اعلیٰ ترین طبقات کے لیے تین خطابات جاری کیے:

G C S I Knight Grand Commander of the Star of India

K C S I Knight Commander of the order of the Star of India

C S I Companion of the order of the Star of India

یہ خطابات: صلۂ خدمت، ثمرۂ لیاقت، طرۂ ریاست اور ہدیۂ محبت کے طور پر دیے جاتے تھے۔ ان خطابات میں سے دو سر سید کو ملے۔

پہلا خطاب سی ایس آئی، انھیں سفر لندن کے دوران 6 اگست 1869 کو ملا۔ سر سید سفر لندن کے لیے یکم اپریل 1869 کو روانہ ہوئے تھے اور 2 اکتوبر 1870 کو بمبئ واپس آگئے تھے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس سفر کی غرض وغایت کیا تھی۔ اس خطاب کے ذریعے وہ اپنے نام کے ساتھ 'ستارۂ ہند' یا 'نجم الہند' لکھنے کے مجاز قرار دیے گئے۔ چنانچہ 'آثار الصنادید' کے نولکشوری ایڈیشن 1876 پر سر سید کا نام اس طور لکھا ہے": سید احمد۔ خاں صاحب بہادر۔ عارف جنگ۔ سی ایس آئی۔ ماتحت جج، شہر بنارس"

1875 کو مدرسۃ العلوم قائم ہوگیا، 1877 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنیاد رکھ دی گئی، سر سید کے ذریعے مسلمانوں کی تعلیم وتہذیب اور ان کی مذہبی اصلاح کا کام پورے انہماک اور توجہ سے جاری ہے، مسلمانوں کا ایک طبقہ ان سے ناراض اور ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہے، لیکن انگریز سرکار ان کی ہندوستانی قوم خصوصاً مسلمانوں کے لیے تعلیم وترقی کی اصلاح کی کوشش و کاوش اور ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کے استحکام میں تعاون کو محسوس کرتی ہے اور انھیں یکم جنوری 1888 میں" کے سی ایس آئی" کے خطاب سے سرفراز کرنے کا اعلان کرتی ہے۔ اب وہ اپنے نام کے ساتھ 'سر' کا لفظ لگانے کے مجاز ہوں گے۔ [یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ "سر" اصلاً کوئی خطاب نہیں بلکہ علامتِ خطاب ہے۔ جو شخص اپنے نام سے پہلے اس کو لکھنے کا استحقاق رکھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ نائٹ کا خطاب رکھتا ہو] حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ ان کے نام کے ساتھ ایسا پیوست ہوگیا ہے کہ بغیر اس کے ان کی پہچان ممکن نہیں۔ ان کا اصل نام 'سید احمد' تھا، ان کے بڑے بھائی کا نام "سید محمد' تھا۔ ان کے خاندان میں دو جز کے نام رکھنے کی روایت رہی ہے۔ حالی نے ان کے والد کا نام سید متقی اور دادا کا نام سید ہادی لکھا ہے بعد کے لوگوں نے ان ناموں پر بعض دوسرے مآخذ کی مدد سے محمد کا سابقہ لگایا ہے، لیکن سر سید کا نام بالاتفاق سید احمد ہی تھا۔

اس خطاب کے اعلان کے بعد انگریز ڈپٹی کلکٹر کے ایما پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کے ہال (موجودہ دواخانہ طبیہ کالج) میں ایک عالی شان پروگرام آراستہ کیا گیا جس میں سر سید کو سرکاری طور پر 'گارڈ آف آنر' پیش کیا گیا اور ای ایچ ریڈ یچی اسسٹنٹ مجسٹریٹ نے دو فرمان شاہی [مکتوبہ یکم جنوری، و 11 فروری 1888] جو ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے تھے پڑھ کر سنائے، بعد میں مسٹر کینڈی ڈپٹی کلکٹر نے سر کا تمغہ [Medal] ان کے سینے پر لگایا اور فیتے کو مع بَیج [Badge] ان کے گلے میں پہنایا۔ اس تقریب کی پوری روداد اور ملکہ ٔوکٹوریہ کے فرمان 'حیات جاوید' میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس موقع پر کلکٹر بہادر نے سر سید کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا، اس کا کچھ حصہ حالی نے نقل کیا ہے۔ یہ مختصر سی تقریری عبارت سر سید اور انگریزوں کے مابین تعلق کی اصل نوعیت، کیفیت اور انگریزوں کی نظر میں ان کی قدر وقیمت کو بخوبی اجاگر کرتی ہے۔ مسٹر کینڈی نے اپنی تقریر میں کہا:

اہل فرنگ اور اہل ہند نے سید صاحب کی وسیع عقل اور روشن حب الوطنی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔.... ان میں نوجوانی سے دو وصف برابر پائے گئے ہیں، ایک علم کی محبت، دوسرے وطن کی محبت، کہ یہ دونوں ایک جگہ بہت کم پائی جاتی ہیں.... انھوں نے اہل فرنگ اور اہل ہند کے درمیان معقول واقفیت پیدا کرنے کے لیے وہ مدد دی جو بہت کم لوگوں نے دی ہے۔ سید صاحب وسیع ہمدردی، دانشمندانہ صلاح، تجربہ کاری، سرگرمی، مستعدی، مستقل مزاجی اور حب الوطنی کی مثال ہیں۔ نیز وہ، وہ شخص ہیں، جنھوں نے اپنے واسطے کبھی کچھ تلاش نہیں کیا بلکہ ہر چیز اپنے ملک کے واسطے چاہی اور اس لیے ان کے ملک کے لوگ اور ملکۂ معظّمہ ان کی عزت کرتی ہیں اور ہم لوگ محبت اور تعظیم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ (حیات جاوید ص 268)

یہاں یہ جان لینا بھی دلچسپ ہوگا کہ ملکۂ وکٹوریہ کے دونوں فرمان انگریزی واردو دونوں زبانوں میں پڑھ کر سنائے گئے جبکہ مسٹر کینڈی کی تقریر اردو زبان میں تھی۔ 19 مئی 1888 کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ [علی گڑھ میں پی۔ایم۔ ڈبلو نے گزٹ کی پہلی سرخی طبقۂ ستارۂ ہند یعنی The order of the Star of India قائم کی اور ایک طویل مقالہ اس خطاب کے بارے میں اردو و انگریزی میں لکھا۔ بعد ازاں Investiture of Sir Syed Ahmad کی سرخی قائم کرکے سر سید کو تمغا عطا کیے جانے کی روداد نقل کی۔ اس روداد میں خِلعت کا مذکور نہیں۔ 'جیکس ریفرینس بک' کے مطابق اس خطاب کے ساتھ حسب ذیل چیزیں خطاب یافتہ کو پیش کی جاتی تھیں:

1۔ گلوبند: جس کی کڑیاں سرخ وسفید گلاب اور نیلوفر کے پھول کی شکل کی ہوتی تھیں۔ وسط میں تاج انگلستان مع تصویر بادشاہ، جس میں تمغا لٹکتا تھا۔

2۔ تمغا: یعنی طلائی ستارا نما تمغا 52 شعاعوں والا، جس کے اندر ایک پانچ شعاعوں والا ستارا۔ ستارے کے ارد گرد گولائی میں سجع: Heaven's Light Our Guid یعنی" آسمانی روشنی ہماری رہنما ہے"

3۔ چوغہ: ہلکی نیلی ساٹن کا جس میں سفید ریشم کا استر، بائیں جانب کڑھا ہوا ستارہ ممکن ہے مذکورہ بالا تمام چیزیں سر سید کو بھی پیش کی گئی ہوں لیکن 'روداد' اور 'حیات جاوید' میں سب کا مذکور نہ ہوسکا ہو۔ حالی کا ماخذ یہی روداد ہے، لیکن حالی کا یہ لکھنا کہ ملکۂ وکٹوریہ کے فرمان بہ زبان اردو تھے، درست نہیں۔

سی ایس آئی، کے سی ایس آئی کے تمغے اور ایل ایل ڈی کی ڈگری، سر سید ہاؤس، مولانا آزاد لائبریری اور موسیٰ ڈاکری میوزیم (علی گڑھ) میں موجود نہیں ہیں۔ یہاں کا عملہ ان کے یونیورسٹی کلکشن میں ہونے سے انکار کرتا ہے۔ سر سیدیات کے ماہرین، ڈاکٹر شان محمد، پروفیسر افتخار عالم

خاں، پروفیسر اصغر عباس، پروفیسر شافع قدوائی وغیرہ سے راقم الحروف نے استفسار کیا؛ انھوں نے بھی یونیورسٹی میں ان کی موجودگی سے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ: ایسا لگتا ہے کہ سرسید کی یہ چیزیں ان کی ذاتی ملکیت رہی ہوں اور ان کی وفات کے بعد ان کے پس ماندگان نے بھی اسے ذاتی ملکیت سمجھا اور یونیورسٹی میں جمع کرنا ضروری خیال نہ کیا ؛ بایں سبب یہ سرسید میوزیم کا حصہ نہیں بن سکیں۔

مولانا آزاد لائبریری کے بعض ملازمین کا یہ خیال ہے کہ فیض دروازے کے دونوں ستون پر جو تمغے جڑے ہوئے ہیں وہ دراصل سرسید کے تمغے ہیں۔ راقم الحروف نے ان کو دیکھا اور اصل سے مشابہ پایا۔ اگرچہ ان کی طلائی پالش اُڑ چکی ہے اور ستون کا لال رنگ [یعنی ٹیرا کوٹا] ان پر جم چکا ہے۔ ان تمغوں کو دیکھ کر یہ سوالات بھی ذہن پر دستک دینے لگے کہ: کیا واقعی یہ سرسید کے تمغے ہیں؟ ان تمغوں کے ساتھ کس مصلحت کے تحت یہ سلوک کیا گیا؟ یہ کب اور کس کے حکم سے وہاں لگائے گئے اور وہاں لگانے میں ان کا مقصد کیا تھا؟ کیا زمانۂ قدیم کی اس رسم کا اعادہ کیا گیا ہے جس میں گھر کی چوکھٹ پر گھوڑے کی نعل ٹھونک دی جاتی تھی؟ سردست میرے پاس ان سوالوں کا جواب نہیں تھا؛ بظاہر یہ محسوس ہوا کہ اگر یہ حقیقتاً سرسید ہی کے تمغے ہیں تو اِنھیں غلامی کی یادگار سمجھ کر یونیورسٹی سے باہر کا راستہ دکھا دیا گیا۔ تحریک ترک موالات (1921) کے زمانے میں سیاسی جماعتوں کے علاوہ اردو کے بعض صحافیوں اور بڑے قلم کاروں کی طرف سے بھی برٹش حکومت کی ملازمت اور خطابات واپس کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر (ف 1931) کے ساتھی اور 'ہفتہ وار کامریڈ' (اجرائے دہلی 12 اکتوبر 1912) میں ان کے معاون مدیر میر محفوظ علی بی اے علیگ (ف 1943) جو 1895 یعنی عہد سرسید کے گریجویٹ تھے، انھوں نے 'ملا جی' کے فرضی نام سے ایک پُرزور مقالہ' خطاب' کے عنوان سے لکھا جو، ظفر الملک علوی (ف 1946) کے دیباچہ کے ساتھ کافی عرصے کے بعد الناظر پریس لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے برٹش حکومت کے جملہ خطابات کو عیسائیوں کے تبلیغی مشن کا حصہ بتاتے ہوئے ان کی شرعی حیثیت پر گفتگو کی تھی اور ان کے استعمال کو ناجائز قرار دیا تھا۔ ممکن ہے ان تمغوں کو ذخیرۂ سرسید سے علاحدہ کرنے میں ایسا بھی کوئی جذبہ کارفرما رہا ہو۔ یہ قیاس بھی محض اس لیے کرلیا گیا تھا کہ ان تمغوں کے ساتھ کا وہ حصہ جس میں کہ بادشاہ وقت یعنی کوین وکٹوریہ کی تصویر اور تاج انگلستان تھا، ندارد تھا۔ اِنھیں ستون سے عکس حاصل کرکے مسلم یونیورسٹی کے سال رواں کے کلینڈر میں سرسید کے فوٹو کے برابر میں ایک میڈل کا بھی فوٹو دیا گیا ہے اور فوٹو کے نیچے انگریزی عبارت لکھ کر اس امر کو پختہ کردیا گیا ہے کہ یہ سرسید کا ہی، کے سی ایس آئی کا میڈل ہے۔

پروفیسر علی اطہر کی کتاب History on Stones [ناشر: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 2016] میں 'فیض گیٹ' عنوان کے تحت گیٹ کی رنگین تصویر اور دروازے پر نصب دونوں میڈل کے رنگین عکس دیے گئے ہیں۔ تعارف کے تحت یہ بھی لکھا ہے:

It also Contains the Medals of"Knight Hood" of Sir Sayed and Nawab Faiz Sb. (P 13)

پہلے میری بھی یہی رائے تھی کہ یہ سرسید کے، سی ایس آئی اور کے سی ایس آئی کے تمغے ہیں، جو علی گڑھ کے ایک سمینار میں بہ صدارت ماہر سرسیدیات، پروفیسر افتخار عالم خاں پیش کی گئی تھی، لیکن پروفیسر طارق چھتاری کے توجہ دلانے پر میں نے اس عوامی روایت پر از سرِ نو غور کیا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ستون پر نصب کتبے کے مطابق یہ دروازہ 1876 میں تعمیر ہوا تھا اور اس کی تعمیر کے لیے پندرہ سو روپے، ممتاز الدولہ، سر محمد فیض علی خاں بہادر کے سی ایس آئی رئیس پہاسو ضلع بلند شہر (ف 1894) نے عطا کیے تھے۔ (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی اور اس کے ممبران، ساجد نعیم، علی گڑھ، 2014 ص 96) اس کی پہلی شہادت وہ پتھر ہے جو دروازے پر نصب ہے۔ دوسری شہادت سرسید کا یہ بیان ہے:

نواب ممتاز الدولہ محمد فیض علی خاں بہادر نے اپنی جیب خاص سے واسطے تعمیر ایک دروازہ احاطۂ مدرسۃ العلوم کے روپیہ مرحمت فرمایا ہے پس وہ دروازہ جو جانب گوشۂ مشرقی تعمیر ہونا قرار پایا ہے، وہ فیض علی خاں دروازے کے نام سے موسوم ہو اور ایک کتبہ ان کے نام نامی کا جس پر تمغائے اسٹار آف انڈیا بھی منقش ہو اس پر لگایا جائے۔ (روداد 20 نومبر 1875 ص:4، بحوالہ سرسید اور فن تعمیر، افتخار عالم خاں، علی گڑھ 2001 ص 65)

سرسید کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کتبہ پر 'اسٹار آف انڈیا' منقش دیکھنا چاہتے تھے، لیکن یہ کتبے کے بجائے دروازے کے دونوں ستون پر جُڑے ہوئے ہیں۔ یہ تمغے اصلی نہیں بلکہ یہ دھات پر بنی ان کی منقش صورت یعنی نقلی ہیں، وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ یہ تمغے بقول پی ایم ڈبلو اصلاً طلائی تھے اور درمیان میں چاندی کا اسٹار تھا جس کے اردگرد گولائی میں سجع، جرمن حرفوں میں لکھا تھا جس کے حروف ہیرے کے تھے، یہ ہیرے تعداد میں تقریباً ایک سو بیس تھے۔ (انسٹی ٹیوٹ گزٹ 19 مئی 1888)

لہذا، اتنے قیمتی میڈل کو یوں دیوار میں جڑ وادینا گویا چوروں کو دعوت دینا تھا؛ لیکن اس بیان سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ میڈل کس کے تھے؟ قوی امکان یہ ہے کہ یہ ممتاز الدولہ نواب سر محمد فیض علی خاں کے [جن سے یہ دروازہ موسوم ہے] تمغے کی نقل ہوں، اور دروازے کی تعمیر 1876 کے دوران عہد سرسید ہی میں یہ اس کے ستونوں پر جڑ دیے گئے ہوں۔ پروفیسر افتخار عالم نے صحیح لکھا ہے:

فیض گیٹ جنوری 1877 سے پہلے بن کر مکمل ہوگیا تھا اور اس پر محمد فیض علی خاں صاحب بہادر کے نام کا کتبہ لگانے کے ساتھ ساتھ سرسید نے اپنے وعدے کے مطابق اس دروازے کے ستونوں پر ''تمغائے اسٹار آف انڈیا'' بھی منقش کروادیا۔ ابھی حال میں سرسید اکیڈمی کے اسٹاف نے برسوں سے جمی پلاسٹر اور پینٹ کی پرتوں کے نیچے دبے دھات کے ڈھلے اس خوبصورت ''ستارۂ ہند'' کے نشان کو صاف کیا تو اس کے اوپر منقش یہ عبارت پڑھنے میں آسکی

Heaven's Light Our Guide

(سرسید اور فن تعمیر ص 115)

یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحب سے میری گزارش ہے کہ وہ ان تمغوں کو [جو نقلی ہی سہی] باب فیض کے ستونوں سے فوری طور پر ہٹوا کر میوزیم میں داخل کروائیں، ورنہ امتدادِ زمانہ سے ان کے نقوش معدوم ہوجائیں گے۔

پی ایم ڈبلو کی روداد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ 'نائٹ' [Knight] کا درجہ حاصل کرنے والوں کی تعداد کبھی 72 سے تجاوز نہیں کرتی تھی اور یہ خطاب موروثی بھی نہیں تھا۔ اس لیے نایٹ کی وفات پر میڈل اور بَیج فوراً حکومت کو واپس کردیا جاتا تھا۔ اس صورت، میں سرسید کے نائٹ ہُڈ تمغے کی تلاش کار عبث ہے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ دستور کے مطابق اسے واپس کردیا گیا ہوگا۔ پی ایم ڈبلو لکھتا ہے:

''جو شخص آیندہ اس تمغے کو پہنیں گے [پہنے گا] جو اب علی گڑھ میں پہنچا ہے وہ اس بات پر خاص کر خوش ہوں گے [ہوگا] کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ اور علی گڑھ کالج کا تمغا ان کو پہنچا ہے۔'' (انسٹی ٹیوٹ گزٹ 19 مئی 1888)

مولانا حالی نے اِسی، کے سی ایس آئی خطاب کے سلسلے میں مزید لکھا ہے:

سرسید کے واسطے اس اعزاز کے ملنے کی بہت دن سے تجویز ہورہی تھی، مگر چونکہ اس تمغے کے پانے والوں کی تعداد محدود ہوتی ہے، یعنی کبھی 72 سے زیادہ نہیں ہونے پاتی، اس لیے جب تک نائٹ کمانڈر کا عہدہ خالی

نہیں ہوتا، دوسرے شخص کو تمغا نہیں مل سکتا۔ چنانچہ لارڈ لٹن نے دربار قیصری کے بعد اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ بسبب خالی نہ ہونے کسی نائٹ کمانڈر کے عہدے کے، اُس وقت سرسید کو یہ اعزاز نہیں مل سکا۔

(حیات جاوید 269)

یہاں اس امر پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ حکومتوں کی جانب سے اعزازات و خطابات، سرکاری تقاریب اور مرکز میں دیے جاتے ہیں، کیا وجہ تھی کہ یہ ایوارڈ علی گڑھ میں خود سرسید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ، اور سائنٹفک سوسائٹی کی چہار دیواری کے اندر دیا گیا؟ پی ایم ڈبلو نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے ''شاید وہ [سرسید] خود حضور وائسرائے بہادر کے ہاتھ سے دارالسلطنت میں تمغے کا ملنا پسند کرتے ہوں لیکن ہم اس بات سے نہات خوش ہیں کہ ہم کو علی گڑھ میں اس رسم کے دیکھنے کا استحقاق حاصل ہوا''

اگر غور کیا جائے تو یہ میڈل سرسید کے علمی، ادبی اور سیاسی قد وقامت، نیز اس دور کے مسلم طبقے میں ان کا قائدانہ کردار اور دانشورانہ حیثیت سے کم تر تھا[البتہ اعلا درجے کی سرکاری تقریبات اور شاہی رسمیات میں نائٹ ہونے کے سبب ان کی نشست مخصوص ہوگئی تھی اور انھیں Most Exalted کا درجہ حاصل تھا]لیکن اس کی تلافی بہت جلد کی گئی۔ 'اسباب بغاوت ہند' کی تصنیف سے سرسید انگریزوں کی نظر میں ایک بالغ نظر قانون داں، مفکر، قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کے واقف کار، اور ملک کے قانونی ڈھانچے کو عوام الناس سے قریب تر کرنے اور اس کے مضمرات پر فاضلانہ نظر رکھنے والے ایک فرد کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ان خطابات کے بعد جولائی 1889 میں ایڈنبرگ یونیورسٹی [Edinburgh University]انگلینڈ نے ڈاکٹر آف لاز [Doctor of Laws] کی اعزازی ڈگری ''ایل ایل ڈی'' [L.L.D] بھی عطا کی۔ یہ سند ترجیحی بنیاد پر دی گئی، ورنہ ڈاکٹر آف فلاسفی یعنی پی ایچ ڈی کی ڈگری سے بھی کام چل سکتا تھا۔

سرسید کی حیات میں جو کتابیں ان کی اپنی سعی و کوشش سے طبع ہوئیں، ان پر درج ناموں میں سرسید نے ان خطابات کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ چند مثالیں:

1۔ جلاء القلوب بذکر المحبوب صلی اللہ علیہ وسلم/ جوادالدولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ/ دہلی 1843

2۔ آثار الصنادید/تصنیف :جواد الدولہ، سید احمد، خان بہادر، عارف جنگ، منصف دار الخلافہ شاہجہان آباد، ابن سید محمد متقی، خان بہادر مرحوم، ابن، جواد الدولہ، جواد علی خاں بہادر مرحوم۔ نبیرہ، نواب دبیر الدولہ، امین الملک، خواجہ فرید الدین، خان بہادر، مصلح جنگ/مطبع سید الاخبار دہلی/ستمبر 1847

3۔ آئین اکبری/ جوادالدولہ، سید احمد، خان بہادر، عارف جنگ۔ صدر امین ضلع بجنور/ دہلی 1856

4۔ سیرت فریدیہ/ ڈاکٹر، سر، سید احمد، خان بہادر، ایل ایل ڈی، کے سی ایس آئی۔ موروثی خطابِ شاہی جواد الدولہ سید احمد خان بہادر، عارف جنگ/ مفید عام آگرہ 1896

سرسید کی وفات کے تقریباً پانچ سال بعد ان کے مقبرے کے دروازے پر نواب زین العابدین کے اہتمام سے پتھر کا ایک بڑا کتبہ لگوایا گیا، اس پر بھی سرسید کے نام کے ساتھ سارے خطابات اور اعزاز استعمال کیے گئے:

مقبرہ، جَوادالدولہ، عارف جنگ، ڈاکٹر، سر، سید احمد، خان بہادر، کے سی ایس آئی، ایل ایل ڈی، ابن سید متقی رضوی دہلوی

اسی کے ساتھ ان کا شجرہ نسب بھی بڑی تختی پر کندہ کرا کر مزار کی باہری دیوار پر نصب کرادیا گیا۔ مذکورہ بالا خطابات کا سرسید کی کتب وتحریروں میں کثرت سے استعمال، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُس دور کا دستور یہی تھا۔ حسب ونسب کا اعلان اور خطابات واعزازات کے اظہار کو سماجی منظوری حاصل تھی اور ان کے اندراج کو کسی قسم کے احساس کمتری کا نتیجہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس طرح کے خطاب واعزاز کا اندراج اس دور کے بڑے بڑے علما اور مشائخ کی کتابوں پر ان کے نام کے شروع اور آخر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

سرسید جس درجہ حکومت وقت کی نظروں میں مقبول تھے اسی درجہ اپنی قوم میں بعض مذہبی افکار کے سبب ناپسندیدہ بھی تھے، اور قوم کے کچھ لوگوں نے انھیں کفر و ارتداد کے قریب لا کھڑا کیا تھا۔ ضیاء الدین لاہوری نے اپنی کتاب 'خود نوشت حیات سرسید'(لاہور، 2005، ص: 98-297) میں تہذیب الاخلاق ج/ 2 ص: 30-529 کے حوالے سے سرسید کی بعض عبارتیں نقل کی ہیں، جن میں خود سرسید نے لکھا ہے کہ انھیں نیچرلسٹ، دہریہ، کافر، ملحد زندیق، عیسائی اور لامذہب کہا گیا ہے۔ خود مولف نے ان الفاظ کو 'لقب' سے موسوم کیا ہے۔ 'اردو لغت تاریخی اصول پر' میں 'لقب' کو 'خطاب' کا مرادف لکھا ہے۔ اس دوران مخالفوں کی جانب سے اخبارات میں انھیں دو خطابات سے نوازا گیا؛ پہلا 'کرسٹان' اور دوسرا 'نیچری'۔ بعض اور ناموں سے بھی انھیں موسوم کیا گیا پیر طریقت، تہذیب نو کا چندا ماموں وغیرہ، لیکن نیچری، سرسید مخالف تحریروں میں کثرت سے استعمال کیا گیا۔ ان کے مذہبی افکار کو مذہب نیچریت کا حصہ شمار کیا گیا۔ ڈاکٹر شائستہ خان نے سرسید مخالف کتب ورسائل کا جو اشاریہ اپنی کتاب ''سرسید اور علی گڑھ تحریک'' ج/1 علی گڑھ 2015 ص: 157 تا 160) میں دیا ہے، اس میں نیچریت کے نام سے پانچ رسائل مذکور ہیں اور ان رسائل کے لکھنے والوں میں دو سید جمال الدین افغانی، اور محمد عبدہٗ بین الاقوامی حیثیت کے قلم کار ہیں۔ محمد عبدہٗ نے جمال الدین افغانی کے رسالے کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ ان کی اپنی رائے سرسید کے بارے میں بہتر تھی۔ رسائل کے نام حسب ذیل ہیں:

1۔ حقیقت مذہب نیچری و بیان حالِ نیچریاں (فارسی) سید جمال الدین افغانی، مرتب محمد واصل، حیدرآباد 1880

2۔ ردِ نیچریہ، ناصر الدین احمد، مطبع تائید الاسلام دکن، 1881

3۔ رد نیچریت، شیخ محمد عبدہٗ، 1884

4۔ جواہر مُضیہ فی رد نیچریہ، مولوی غلام دستگیر قصوری، لاہور 1887

5۔ رد نیچریہ، مرزا محمود بیگ دہلوی، مطبع مجتبائی دہلی، سنہ ندارد

اکبر الہ آبادی کے یہ اشعار بھی اس خطاب کے عمومی استعمال کی مثال میں پیش کیے جاسکتے ہیں:

'نیچری' وعظ مہذب کو لیے پھرتے ہیں
شیخ صاحب جو ہیں مذہب کو لیے پھرتے ہیں
ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں
ہم تو اک شیر شکرلب کو لیے پھرتے ہیں

کتا جیسے بہ فکر جیفہ دوڑے
یوں دہر پہ 'نیچری' خلیفہ دوڑے
جب مرکے چلے ہیں سوئے جنت سید
لٹھ لیکے امام ابو حنیفہ دوڑے

کہا 'پیر طریقت' نے اکڑ کر اپنی ٹم ٹم پر
یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا

لیکن یہ تمام خطابات از کار رفتہ ہوگئے اور بقول اکبر:

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں، سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے، کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی، میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

■

Dr. Shams Badauni
58, New Azad Puram Colony
Izzat Nagar
Bareilly - 243122 (UP)

واجدہ تبسم
اردو کی ایک معتوب افسانہ نگار

شمع اختر کاظمی

عصمت چغتائی کے بعد واجدہ تبسم ہمارے عہد اور فکشن کی تاریخ کی ایک ایسی فنکارہ ہیں جنھوں نے حقیقت کو خیال کی آرائش اور جذبے کی آنچ سے ایک نیا آہنگ بخشا اور نام نہاد ملمع ساز اخلاقیات کو برہنہ کرنے کا حوصلہ دکھایا۔ بخیہ ادھیڑی— تہذیب و معاشرے میں بیگمات سے لے کر لونڈیوں، باندیوں، کنیزوں، خادماؤں اور طوائفوں تک کی کسک اور کرب کو واجدہ تبسم نے اپنی تحریروں میں سمویا۔ یہ اس اخلاق آلودگی میں ملوث تہذیب کا نوحہ تھا جسے ضبط تحریر میں لانے کے لیے خاصی جرأت درکار تھی۔ تحریروں کی سچائی، برجستگی اور حقیقت پسندی نے منافق مرد معاشرے میں کھلبلی مچا دی تھی۔ جس تہذیبی روایات اور جن سسکتی سچائیوں کی وہ آواز بن گئی تھیں۔ وہ تقاضا تھا اسی انداز تحریر کا، زبان و بیان کا۔ سیاہ راتیں ہی نہیں تاریک دن بھی تھے تب قلم کو اس کی ترجمانی کا سلیقہ واجدہ تبسم ہی بخش سکتی تھیں۔

واجدہ تبسم نے 1960 کے آس پاس لکھنا شروع کیا ان کے فن کی عظمت ان کے فکر و فن، دردمندی اور بے ساختگی میں پوشیدہ ہے۔ مگر سماج کی دیوث فطرت نے ان کی تحریروں میں موجود دردمندی اور حقیقت نگاری کو پس پردہ ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہی الزام ان کی شناخت پر حاوی ہوگیا۔ ایک وبال ان کے سر آچکا تھا۔ کاغذ پر باغی قرار دی گئی فنکارہ نقادوں کے فرمودات سے نہ دلبرداشتہ ہوئیں اور نہ معاشرے کے بد خلق انسانوں کے خلاف حق کے اظہار میں کسی سے ڈریں اور نہ ہی اپنی تحریری جسارتوں پر وہ آزردہ تھیں۔ اپنے قلم کو بدستور زندہ رکھا اور کسی کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا۔ ادب اگر سچا اور زمانے کا ترجمان ہو تو وہ خود کو ہر دور میں پڑھوا لیتا ہے اس کی اہمیت اور انفرادیت کو کوئی کم نہیں کرسکتا۔ واجدہ تبسم کے خلاف نبرد آزما ایک زمانہ رہا لیکن انھوں نے نہ اپنا اصول حیات بدلا نہ اسلوب بدلا ہمیشہ اپنے قاری پر بھروسہ کیا ان کا کہنا تھا۔

''معاشرے کی بداعمالیاں اور بدخوہی ان سے کہانی لکھواتی ہے۔''

روایتی مردانہ کردار کا عکس اردو ادب میں بہت واضح نظر آتا ہے۔ ان صفحوں پر سانس لیتی عورتیں مرد کی بالادستی میں محکوم نظر آتی ہیں۔ مصر میں کھدائی کے دوران برآمد ہونے والے کاغذ پر لکھی کہانیاں ہوں یا جدید تہذیب کی کہانیاں، افسانے سب ہی مرد کے خودمختار، حاکم اور زور آور ہونے کے قصے ہیں۔ الف لیلہ کی شہزاد کی جان اس شہریار کے ہاتھ رہی جو ہر صبح رات کی دلہن کو قتل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا لیکن شہزاد اپنی ذہانت اور ہر بار نئی مگر نامکمل کہانی سنانے کے ہنر کو آزماتے ہوئے اپنی جان بچالیتی ہے۔ الف لیلہ کی وہ کہانیاں جو شہزاد نے بیان کیں ان میں بھی مرد کی بالادستی جھلکتی ہے۔ جبکہ عورت اپنی ذہانت اور بصیرت کے ذریعے مشکل مرحلے طے کرتی نظر آتی ہے۔ تمثیلی قصے کہانیاں ہوں یا زندگی کے سچے کڑوے واقعات 'عورت اپنی زندگی سے لے کر ادب کی آرٹ گیلری تک لٹکائی گئی چاہے وہ ناانصافی کی شکار ہو یا کہانی کار۔

فکشن نگاری میں قرۃ العین حیدر اور عصمت چغتائی کے بعد جس خاتون افسانہ نگار نے اپنے عہد کو سب سے زیادہ متاثر کیا اُن میں واجدہ تبسم کا نام سرفہرست ہے۔ واجدہ تبسم اس گنہگار قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں جن پر کہانیاں لکھنا کسی جرم سے کم نہیں وہ بھی مرد اساس معاشرے کی منافقت کو سچ کا آئینہ دکھانا اور تیرگی میں ڈوبے طبقۂ اناث کی سماجی حقیقتوں کو فکشن کا موضوع بنانا۔ ادب کا کردار دراصل ادیب کا کردار ہوتا ہے۔ وہ اپنے قلم اور اپنی فکر کی رو کے ساتھ آزاد ہوتا ہے۔ اگر واجدہ تبسم نے اس آزادی کا برحق استعمال نہ کیا ہوتا تو وہ سچ اور حقیقی کردار گمنامی کے دھندلکوں میں کب کے گم ہو چکے ہوتے اور ایک جہان ان کے حالات سے بے خبر رہتا اور سچائیاں ان موٹی موٹی دیواروں کے پیچھے سسکیاں بھرتی قبروں میں اتر جاتیں۔ خوابگاہوں راہداریوں سے سرگوشیاں نکل کر سماعتوں سے ضبط تحریر تک آئیں تو گویا دنیائے ادب میں زلزلہ سا آگیا۔ انھوں نے معاشرے کی خباثت کو قلم بند کیا لیکن روایتی مفاہمت سے درگزر کیا۔ اپنی راہ نکالی، اپنے موضوعات کا انتخاب کیا، اپنے اسلوب خود تراشے اس پر حیدرآبادی زبان و بیان اور لہجے کا طلسم ان کی تحریروں کو دوآتشہ بناتا رہا۔ واجدہ تبسم نے قاری کو ایک نئے افسانوی جہان' اچھوتے احساس اور زبان کے نئے انداز تخاطب سے ہی آشنا نہیں کیا بلکہ زمانے اور زمینی حقائق کی نقش گری بھی کی' افسانوں کے فنکارانہ دروبست کی اور معنیاتی رموز کی تفہیم کے ساتھ ذہنوں پر حکمرانی کی اپنا قاری بنایا، کچھ بند دروازے کھولے، کچھ انجانے مناظر سے روشناس کرایا اور کچھ ہیجان انگیز حجروں سے قاری کو ایک پُرشوق سیاح کی طرح سیر کرائی۔

اس زمانے کی ذہنیت آج کے دور میں بھی کچھ روحوں میں سرایت کرتی ہے۔ عصمت چغتائی نے خاتون تخلیق کاروں کے گرد باندھے گئے حصار پر پہلے ہی دھاوا بول دیا تھا اور 'لحاف' کی کپاس کو دھن کر رکھ دیا تھا۔ باوجود اس کے عصمت کی تحریروں کو فن کے درجے پر رکھا گیا اور واجدہ کو افسانوی بصیرت اور تقاضے سے بے بہرہ سمجھا گیا۔ معاصرانہ چشمک ایک ایسی ذہنی اور روحانی

بیماری ہے جس سے نہ کوئی عہد نہ زمانہ مبرّا رہا۔ سیاست معاشرت غرض یہ کہ ہر شعبۂ حیات یہاں تک کہ حلقۂ ادب میں بے شمار فتنے جمے اور رقابت کی آگ بھڑکائی۔ بے پر کی اڑائی گئی غالباً تلوار کی دھار پر اتنا لہو نہ بہا ہوگا جتنا قلم کی نوک نے دل کا لہو کیا۔

شاہد پرویز اور عتیق الرحمان کو دیے انٹرویو میں تنقید نگاروں سے متعلق یہ واقعہ جسے واجدہ تبسم نے کہا۔ ''لطیفہ سنیے۔ ذرا غور سے سنیے گا۔ ایک صاحب پاکستان سے آئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ آل احمد سرور صاحب جب پاکستان آئے تو ان سے پوچھا گیا کہ واجدہ تبسم آپ کے خیال میں کیسی رائٹر ہیں۔؟ تو وہ پوچھنے لگے۔ واجدہ تبسم کون ہیں۔؟ پھر وہ صاحب پوچھنے لگے کہ۔ ''کیا ایسا ممکن ہے کہ آل احمد سرور نے ایسا کہا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''یہ آل احمد سرور کون ہیں۔؟

بہر حال میں آپ سے اتنی بات بتادوں کہ میں نقادوں کی دعوتیں کرکے انہیں فلیٹر یا پلیز کرکے اپنے لیے مضمون لکھوانے کے حق میں نہیں ہوں۔ نہیں لکھتے۔ نہ لکھیں۔ اس سے میری صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ مجھے نہ کسی نقاد کی ضرورت ہے نہ کسی دانشور کی۔ میرے عوام میرے لیے کافی ہیں۔''

ادبی معاصرانہ چشمک سے متعلق سر دست ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یقیناً قارئین نے بھی پڑھا ہوگا۔ ''میر تقی میر سے کسی نے پوچھا کیوں حضرت آج کل شاعر کون ہے۔؟ فرمایا ایک سودا اور دوسرا یہ خاکسار اور آدھے خواجہ میر درد۔ کسی نے پوچھا میر سوز۔؟ چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔ ''میر سوز بھی کوئی شاعر ہیں۔؟'' اس نے کہا نواب آصف الدولہ کے استاد ہیں۔ کہا خیر یہ بات ہے تو پونے تین سہی!

واجدہ تبسم کا افسانہ 'اترن' شائع ہوا تو انہیں سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ اس طرز کی کہانیوں میں 'شہر ممنوع'، 'نتھ اترائی'، 'ذرا ہور اوپر'، 'نتھ کا بوجھ' جیسی ہیجان خیز کہانیاں دلچسپ پیرایۂ بیان کے ساتھ قاری کی سماعت کے حوالے کیا۔ ان افسانوں پر بڑی ہائے توبہ مچی۔ مورد عتاب بنیں، خوب وبال مچا جن پرچوں میں کہانیاں شائع ہوئیں وہ پرچے جلائے گئے، احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ ان کہانیوں کا مجموعہ 'اترن' کے پیش لفظ میں وہ لکھتی ہیں۔

''لوگ مجھ سے بھی کہتے ہیں گڑے مردے کیوں اکھاڑتی ہو۔ اور اس کا فائدہ کیا ہے۔ گڑے مردے اکھاڑنے کا جہاں تک سوال ہے میں نہ لکھتی کوئی اور لکھ دیتا۔ بہر حال زمین میں دفن خزانے نمودار ہوتے ہیں۔؟ کچھ زرگل کی صورت میں، کبھی قلمی شہ پاروں کی صورت میں۔ نام بدل جانے سے کیا ہوتا ہے۔ واجدہ نہ لکھتی کل کوئی لکھتا، لیکن کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ساری کہانیاں یوں ہی سوئی رہتیں؟

''یہ میرا یقین ہے کہ دنیا میں ہر جرم، ہر گناہ روز اول سے ہوتا آیا ہے۔ ہوتا رہے گا لیکن پھر بھی ان کہانیوں کو پڑھ کر ظلم سہنے والوں کے دل میں اگر بغاوت کی ہلکی سی آنچ ایک ہلکی سی لہر بھی جھلکا لیتی ہے تو یہ میری معراج ہے۔ میں نے کہانیاں لکھ کر ظلم سہنے والوں کے خلاف ایک جہاد کیا ہے۔''

میری کہانی میں واجدہ تبسم خود لکھتی ہیں۔ ''انہی دنوں میری کہانی 'تین جنازے' چھپ کر آئی تھی۔ نانی اماں پرچہ لے کر آئیں اور ڈٹ گئیں کہ ''میں تو یہ کہانی ضرور سنوں گی۔ بتا تو کیا لکھتی ہے۔ اب جناب یہ مصیبت کہ جہاں میں نے قلم کاغذ ہاتھ میں لیا نانی اماں آن موجود ہوتیں بتا کیا لکھ رہی ہے۔؟ سنا کیا لکھ رہی ہے۔؟ نانی اماں پڑھی لکھی نہیں تھیں مگر انہیں چلا دینا بڑا مشکل کام ہے۔'' یہ مصیبت رہی کہ ایڈیٹروں کے جو خطوط آتے اور جاتے سب کو نانی اماں سینسر کرتیں تھیں۔''

ان کی تنبیہ جاری ہی رہتی تھی کہ الا بلا نہ پڑھا کرو لیکن یہ مناہی ابھی ختم نہ ہی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا۔

ہماری ماما غائب ہوگئی۔ کھانے پکانے کی سخت مشکل جاری تھی۔ نانی اماں ہر کسی سے کہا کرتیں کہ ایک ماما لا دو مجھ سے تو اتنے سارے بچوں کی دیکھ بھال ہی نہیں ہوتی کھانا کیسے پکاؤں۔؟

مامائیں لائی جاتیں اور کسی نہ کسی وجہ سے ریجیکٹ کر دی جاتیں۔ ایک دن مغرب کے بعد نانی اماں صحن میں میتھی کی بھاجی توڑتی بیٹھی تھیں۔ بھیا لوگ تخت پر ہوم ورک کرتے بیٹھے تھے۔ بہنیں پڑھ رہی تھیں۔ اور میں سطرنجی پر سر نیہوڑائے پینسل منہ میں دبائے بہت انہماک سے بیٹھی حساب حل کر رہی تھی۔ اسی دم کسی نے ایک ماما کو باہر سے بھجوایا۔ نانی اماں حسب معمول جرح میں مشغول ہوگئیں۔ میں نے یونہی ایک بار سر اٹھا کر دیکھا ماما کی گود میں ڈیڑھ دو برس کا بچہ بھی لٹکا ہوا تھا میں پھر کاپی پر جھک گئی۔

نانی اماں نے ادھر ادھر کے مختلف سوالوں کے بعد پوچھا۔

''تمہارا مرد کیا کام کرتا ہے۔؟

''مرد تو چار سال ہوئے مر گیا۔''

میں لیمپ کی روشنی سے نگاہیں ہٹا کر ماما کو دیکھا۔ کاپی بند کی، پینسل نیچے رکھی اور برآمدے میں آ کر بڑے معتبر انداز میں بولی۔

کیوں جی! تمہارا مرد تو مر گیا، پھر یہ کہاں سے آیا۔'' (میری عمر اس وقت آٹھ نو سال رہی ہوگی۔)

پتہ نہیں اس سوال میں کون سے دھماکے کا اثر تھا۔ نانی اماں ایک دم بھوچک رہ گئیں۔ پہلے تو انہوں نے دیدے ٹپ ٹپا کر اپنے نواسوں کو دیکھا پھر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں پھر چلا کر کہا اور پڑھنے دوا سے رسالے۔''

''شمع جیسا اُردو کا اشاعتی ادارہ گرچہ بند ہوا لیکن یہ حقیقت ہے کہ واجدہ تبسم کے افسانوں کے حصول کے لیے شمع کے ذمے داران ایڈوانس چیک انھیں ارسال کیا کرتے تھے۔ حقائق تلخ ہوا کرتے ہیں اور اس کی تلخی کم و بیش اُردو کے قارئین اور دکن کے نوابین کے متاثرین نے بھی محسوس کی لیکن واجدہ تبسم کے طرز کے افسانے لکھنے اور چھپنے کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ جن موضوعات پر متواتر لکھنے کے لیے واجدہ تبسم اردو کے افسانوی حلقوں میں کچھ مخصوص لوگوں کی جانب سے معتوب قرار دی گئیں اور واجدہ کی کہانیاں لکھنے کا سلسلہ دم توڑنے لگا۔ اسی اثناء میں شہوار گل نامی ایک غیر معروف افسانہ نگار نے واجدہ تبسم سے دو قدم آگے بڑھ کر ایک افسانہ 'ٹینک پنچے' لکھ مارا جو رحمان نیر کی ادارت میں شائع ہونے والے رسالہ 'روبی' (دہلی) میں شائع ہوا تھا۔ لیکن اس کے بعد حیدرآبادی مخصوص پس منظر میں نہ واجدہ تبسم کا کوئی دوسرا افسانہ شائع ہوا نہ شہوار گل کا البتہ معروف افسانہ نگار شبیر احمد (پٹنہ) کا ایک افسانہ 'شاہ بلوط' ماہ نامہ 'روبی' دہلی میں شائع ہوا جو ان معنوں میں بڑی اہمیت کا حامل تھا جس میں نوابین حیدرآباد کے بلند کردار کی عکاسی کی گئی تھی۔ جس میں افسانہ نگار شبیر احمد نے یہ ثابت کیا تھا کہ واجدہ تبسم اور شہوار گل کے قلم سے نکلے افسانے کچھ اوباش فطرت کے عکاس تھے جبکہ سچائی یہ ہے کہ نوابین دکن اعلیٰ ظرف، بلند کردار، نازک دل اور پاک طینت تھے۔ لوگوں کی تکلیف اور پریشانیوں کو دیکھ کر وہ ایسے ٹوٹ جایا کرتے تھے جیسے معمولی سی تیز و تند ہوا چلنے پر شاہ بلوط کا پیڑ ٹوٹ جاتا ہے۔

واجدہ تبسم کے تہلکہ خیز افسانوں کے بعد ان کا ناول 'قصاص' شائع ہوا جو ان کے افسانوں سے بھی زیادہ دھماکے دار ثابت ہوا۔ غالباً واجدہ کا آخری افسانہ 'ماتم' 1982 میں اختر کاظمی کی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی رسالہ 'تخلیق نو' (بھیونڈی) میں شائع ہوا اس کے بعد نہ جانے کب انہوں نے چپی سادھ لی۔

قرۃ العین حیدر، منٹو اور عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری پر مضامین اور موٹی موٹی کتابیں لکھنے والے ناقدین پر لازم ہے کہ وہ واجدہ تبسم جیسی حقیقت پسند افسانہ نگار کی تخلیقات کے ساتھ انصاف کا معاملہ کریں۔

■

Shama Akhtar Kazmi
12/14, Sai Nagar
Bhiwandi - 421302 (MS)
Mob.:09284690949

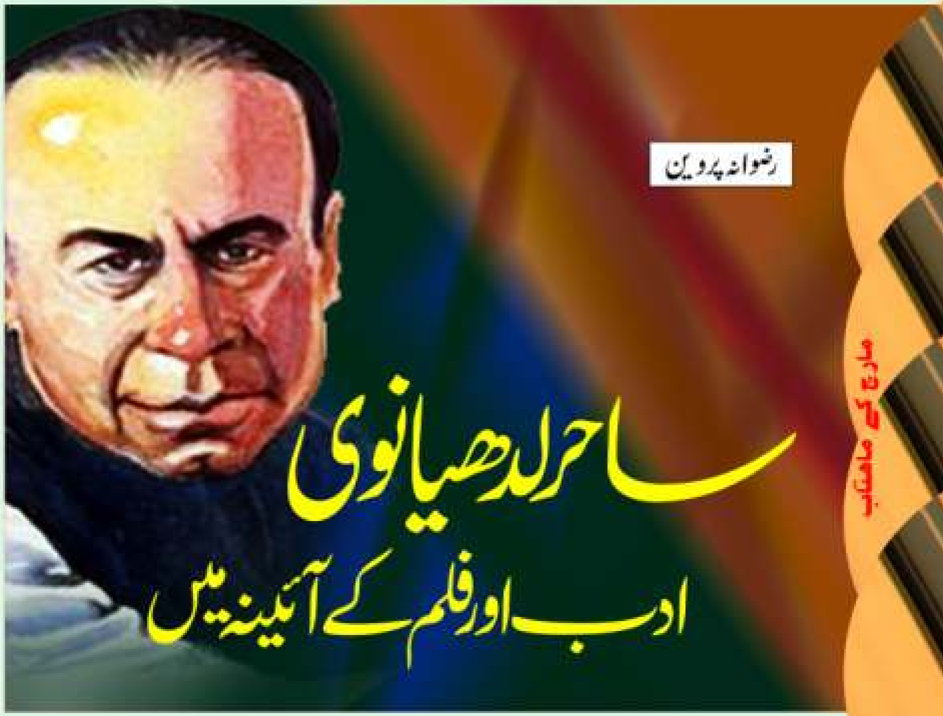

مارچ کے ماہتاب

ساحر لدھیانوی

ادب اور فلم کے آئینہ میں

رضوانہ پروین

ساحر لدھیانوی کی ولادت 8 مارچ 1921 کو لدھیانے کے ایک زمیندار خاندان میں ہوئی۔ ساحر کے والد کا نام فضل محمد اور والدہ کا نام سردار بیگم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید سے دیکھ کر والد نے ساحر کا نام عبدالحی رکھا تھا۔ اس لحاظ سے ساحر کا اصلی نام عبدالحی اور قلمی نام ساحر لدھیانوی ہوا۔ ساحر لدھیانوی ایک زمیندار خاندان کے واحد چشم و چراغ ہونے کے باوجود عام انسانوں سی سادہ زندگی گزاری۔ اس کا سبب ان کے والد کا تعیش پسندانہ اور حاکمانہ مزاج تھا۔ ساحر لدھیانوی کی ابتدائی تعلیم لدھیانے میں بڑے ہی غیر محفوظ ماحول میں ہوئی۔ اپنے والد کے غیر قانونی اقدام کے تحت ساحر کی والدہ کے عدم تحفظ کا احساس جب مستحکم ہوتا گیا تو اس کا براہ راست اثر ساحر لدھیانوی کی زندگی پر پڑا۔ ساحر کی پرورش اور تعلیم اُن کی والدہ کے زیر سایہ ہوتی رہی۔ والد کی محبت و شفقت انھیں نہ ملی۔ اسکول میں مولانا فیاض ہریانوی کی تربیت میں انھوں نے اردو فارسی کا علم حاصل کیا۔ پنجابی ان کی علاقائی اور مادری زبان تھی اور انگریزی زبان اسکول میں لازمی تھی۔

ساحر بچپن ہی سے بڑے ذہین تھے۔ چوتھی جماعت میں ہی وہ اپنے ماموں کے وسیلے سے علامہ اقبال کی بال جبریل مکمل پڑھ چکے تھے۔ 1937 میں میٹرک کا امتحان دینے کے بعد فرصت کے اوقات میں شعر گوئی کی جانب راغب ہوئے۔ ابتداً انھوں نے نظمیں کہیں۔ میٹرک پاس کر لینے کے بعد 1938 میں ساحر گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں منتقل ہوگئے۔ اس کالج میں گزرے پانچ سال ساحر کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کالج کے زمانے میں ہی ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی طلبہ تنظیم آل انڈیا اسٹوڈنٹ فیڈریشن سے ساحر کے روابط استوار ہو چکے تھے۔ اس طرح ساحر کو اپنے احساسات و خیالات و جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ مل گیا تھا۔ ساحر اپنی نوعمری میں ہی اشتراکی نقطۂ نظر سے نا صرف متاثر ہوئے بلکہ بڑھ چڑھ کر اس نقطۂ نظر کی ترسیل کی۔ اپنی نظموں اور تقریروں میں بھی۔

ساحر پہلے شاعر نہیں جن کا تعلق زمیندار خاندان سے ہو، لیکن وہ پہلے شاعران معنوں میں ضرور ہیں جس نے زمیندار خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے باوجود کھرے کھوٹے انداز میں اس ماحول و معاشرت کی دھجیاں اڑائی ہوں۔

ساحر لدھیانوی یوں تو کالج کے دنوں میں نعرے لگانے اور پوسٹر لکھنے جیسے جذباتی کاموں میں پیش پیش رہتے ہی تھے لیکن 1939 سے اُن کی تحریریں باضابطہ رسائل میں شائع بھی ہونے لگی تھیں۔ اُن کی ایک نظم 'شعلۂ نوائی' 1939 میں ہفتہ وار 'افغان' بمبئی میں شائع ہوئی تھی، جو کافی مقبول ہوئی۔ ساحر ابتداً اے ایچ ساحر کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ ساحر نے اپنے لیے تخلص کا انتخاب علامہ اقبال کے لکھے ہوئے مرثیہ 'مرثیہ داغ' کے اس شعر سے کیا:

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی

اس طرح وہ چودھری عبدالحی سے ساحر لدھیانوی ہوگئے۔ ساحر نسباً اور مزاجاً پورے پنجابی تھے۔ وہ لدھیانے میں پیدا ہوئے اور زندگی کے تئیس چوبیس سال اس شہر میں گزارے۔ یہ دور ساحر کی شخصیت اور تعمیر کے لحاظ سے تشکیلی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی دیار میں انھوں نے ہوش سنبھالا، تعلیم حاصل کی، عاشقی کی، شاعر ہوئے اور عملی زندگی میں بھی قدم جمانے کے لیے جد و جہد کی۔ انسان اور شاعر کی حیثیت سے جو چھاپ پنجاب نے ساحر پر لگائی وہ انمٹ اور مستقل ثابت ہوئی۔ جس کا اظہار ساحر نے اپنی ایک نظم ''اے نئی نسل!'' میں بخوبی کیا ہے:

یہیں منکر بنے روایت کے
یہیں توڑے روایت کے اصنام
یہیں نکھرا تھا ذوق نغمہ گری
یہیں اترا تھا شعر کا الہام
میں جہاں بھی رہا یہیں کا رہا
مجھ کو بھولے نہیں ہیں یہ در و بام
نام میرا جہاں جہاں پہنچا
ساتھ پہنچا ہے اس دیار کا نام

یہ نظم دراصل ساحر نے اپنی مادر علمی گورنمنٹ کالج لدھیانہ کی گولڈن جبلی تقریب کے لیے لکھی تھی۔ اس تقریب میں ساحر کو گولڈ مڈل سے بھی نوازا گیا تھا۔ درج بالا اشعار سے شاعر کی اپنی مادر علمی کے ساتھ ساتھ اُس کی والہانہ وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کی کامیاب اور مقبول نظم 'تاج محل' ہے جس کے سبب ساحر راتوں رات شاعر بن گئے۔ اس نظم کا آخری بند قابل توجہ ہے جس نے ہر کس و ناکس کی توجہ اپنی جانب کھینچی اور یہ نظم ساحر کی مقبولیت کا اولین زینہ بنی ملاحظہ ہو:

یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارا یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

(تاج محل)

1944 میں ساحر لدھیانوی کا پہلا شعری مجموعہ 'تلخیاں' شائع ہوا۔ اس مجموعے پر قومی جنگ (نیا زمانہ بمبئی) میں تبصرہ بھی شائع ہوا۔ اور بہت پذیرائی ہوئی۔ اسی زمانے میں ساحر نے 'ادب لطیف' کی ادارت سنبھالی۔ ادب لطیف کے اداریے اور تبصرے کی بدولت ساحر ادباء و شعرا میں کافی مقبول ہوئے اور ان کا حلقہ بڑھتا گیا۔

اکتوبر 1945 میں حیدر آباد میں ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کل ہند کانفرنس کا انعقاد ہوا تو ساحر کو مقالہ نگار کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ ساحر نے 'اُردو کی جدید انقلابی شاعری' پر اپنا مقالہ پیش کیا جسے بہت پسند کیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ معتبر اور مقتدر ترقی پسندوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ چنانچہ کانفرنس کے اختتام پر ساحر ترقی پسند ادبا کی ایما پر لاہور کے بجائے بمبئی چلے آئے۔ بمبئی جو اُس زمانے میں ترقی پسند ادباء اور شعراء کا مستقر بنی ہوئی تھی۔ وہاں ساحر کو ذریعہ معاش کی تلاش اور فلموں سے وابستہ ہونے کا موقع ملا۔

بمبئی پہنچنے کے بعد ساحر کرشن چندر کے یہاں

ٹھہر کر فلموں کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔ قسمت نے ساتھ دیا اور بہت جلد موسیقار ایس ڈی برمن کی سفارش پر فلم 'آزادی کی راہ' کے لیے پہلا بریک ملا۔ اس فلم کے لیے جو نغمہ ساحر نے لکھا اُس کے بول تھے 'بدل رہی ہے یہ زندگی' ان کی دوسری فلم 'نوجوان' تھی جس کے نغمے کے بول تھے 'ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں' اس کے بعد فلم بازی کا مقبول و معروف نغمہ 'تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے اپنے پہ بھروسہ ہے تو داؤ لگالے' لکھا۔ اس نغمے کی کامیابی کے بعد پھر ساحر نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ یہ وہ دور تھا جب ساحر فلمی نغمے لکھنے میں اس قدر منہمک ہو گئے تھے کہ اُن کے پاس تخلیق ادب کے لیے زیادہ وقت نہ تھا۔ اُن کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے فلمی نغموں کو ایک معیار عطا کیا۔

اُس وقت شاعری میں آرزو لکھنوی، شکیل بدایونی، پریم دھون، مجروح سلطان پوری اور راجندر کرشن وغیرہ فلمی گانوں کو ادبی معیار کے قریب لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

بیسویں صدی کے پانچویں دہے میں ساحر نے نہ صرف عوام اور فلمی اور غیر فلمی ہستیوں کو شاعری کی عظمت کا احساس دلایا بلکہ نغمہ نگاروں کے حقوق کی بحالی کے لیے جو قابل رشک کارنامہ انجام دیے اس کے لیے نغمہ نگاران کے منت کش رہیں گے۔ ساحر سے قبل فلمی پوسٹروں پر صرف موسیقار کے نام لکھنے کی روایت تھی ساحر نے اس حق تلفی کے خلاف آواز بلند کی۔ اس زمانے میں ریڈیو سے نشر ہونے والے نغموں میں صرف موسیقار اور گلوکار کا نام ہی لیا جاتا تھا بعد میں ساحر کی کوششوں سے نغمہ نویس کا نام بھی شامل کیا جانے لگا۔

ساحر لدھیانوی کی شعری تصانیف کی تعداد کل چار ہے جن میں تلخیاں، پرچھائیاں، گاتا جائے بنجارا اور آؤ کہ کوئی خواب بنیں، شامل ہیں۔

'تلخیاں' ساحر لدھیانوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو 1944-45 میں ہی شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے تیئس جائز اور ناجائز ایڈیشن شائع ہوئے۔

ساحر لدھیانوی کی نظم 'پرچھائیاں' بین الاقوامی امن کے موضوع پر لکھی گئی ایک طویل نظم ہے۔ یہ پہلی دفعہ 1955 میں کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ اب یہ نظم ساحر کے دوسرے مجموعہ کلام 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' میں مستقل طور پر شامل ہے۔

'گاتا جائے بنجارا' ساحر کا مشہور و مقبول فلمی نغموں کا مجموعہ ہے، جسے ساحر نے خود ترتیب دیا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت 1958 میں ہوئی۔ یہ کتاب اُردو شاعری میں پہلی مثال ہے کہ کس نغمہ نگار نے اپنے فلمی نغموں کو کتابی صورت عطا کی ہو۔ بہر حال ساحر کے چوتھے مجموعہ کلام 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' کا پہلا ایڈیشن 1971 میں منظر عام پر آیا اور تیسرا اور آخری ایڈیشن 1979 میں شائع ہوا۔

ساحر کے یہاں جدت کا جو رجحان ہے وہ فلم 'بازی' میں اور نمایاں ہوا۔ 'جو تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے' اور 'گجر کے گانے' سے مترشح ہے۔ ساحر کی فلمی شاعری کا زمانہ جاگ اٹھا ہندوستان (فلم: آزادی کی راہ پر) 'ٹھنڈی ہوائیں لہرا کے آئیں' (نوجوان 1955) سے 'لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں' (انصاف کا ترازو 1980) تک کم و بیش تیس سالوں پر محیط ہے۔ ان تیس برسوں میں ساحر نے کبھی بھی اپنے نظریات اور مسلک سے گریز نہیں کیا۔ بلکہ وہ ہے، گیت، نظم، غزل میں زندگی اور سماج سے متعلق مختلف موضوعات کو سمیٹا ہے۔

اُردو میں ساحر لدھیانوی واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں تخلص کا استعمال کہیں نہیں کیا ہے۔ ساحر کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری، کو ایک منفرد انداز عطا کیا۔ عربی فارسی کے ادق الفاظ سے پرہیز کر آسان الفاظ کا انتخاب جس سے اُن کی شاعری خاص و عام کے لیے یکساں دلچسپی کا سامان بنی۔ زبان کی سلاست کے سبب اُن کی شاعری میں جمالیاتی حسن و نکھار پیدا ہوا۔ سادگی، رعایت لفظی، اسلوبیاتی جدت نے اُن کی شاعری کو ایک منفرد انداز عطا کیا۔

ساحر لدھیانوی ایک خوش مزاج، خوش باش اور خوش پوش شخصیت کا نام ہے۔ خوش گفتاری اور مہمان نوازی اُن کی شخصیت کے اہم پہلو ہیں۔ وہ ایک سادہ معصوم اور بامروّت انسان تھے۔ سادگی اُن میں اس قدر تھی کہ وہ ہمیشہ سفید براق قمیص اور پتلون میں ملبوس نظر آتے تھے۔ اُن کی گاڑی کا رنگ بھی سفید ہی تھا۔ کوئی میل اُن پر چڑھی ہی نہ تھی۔

ساحر لدھیانوی اُن گنے چنے نامور شعراء میں ہیں جسے اپنی زندگی میں ہی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔ بہر حال ساحر کے نغموں میں جہاں ناکام محبت کا درد اور محبوب سے والہانہ محبت کی کسک نظر آتی ہے وہیں ان کے یہاں احتجاج، تلخی، اور کڑواہٹ بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ دردمند دل کے مالک تھے لہٰذا انسانیت اور انسانی حقوق کی پامالی کے سبب ان کے قلم سے وہ کڑواہٹ اور ترش اشعار اور بعض اوقات نغمے کی صورت میں نکلیں جس سے فلمی دنیا ہی نہیں بلکہ ادب میں بھی ایک مقام و مرتبہ حاصل ہوا۔ چونکہ ساحر کو دنیا میں تلخیوں کا سامنا ہوا تھا۔ انھیں محبت میں ناکامی ملی تھی۔ ذات اور مذہب کے نام پر انھیں اپنی محبت قربان کرنی پڑی اور دل پر پتھر رکھ کر انھیں یہ کہنا پڑا۔

چلو ایک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں
نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دل نوازی کی

اور کبھی سنجیدہ ہو کر زندگی کے فلسفے کو یوں بیان کرتے ہیں۔

ایک پل کی پلک پر ہے ٹھہری ہوئی یہ دنیا
ایک پلک جھپکنے تک ہر کھیل سہانا ہے

ساحر نے نہ صرف مقبولیت بلکہ دولت بھی خوب کمائی۔ نیز بے شمار انعامات و اعزازات سے نوازے گئے۔ 1972 میں مہاراشٹر حکومت نے انھیں جسٹس آف دی پیس نامزد کیا۔ اُن کے مجموعہ کلام 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' پر 1972 میں اردو اکادمی مہاراشٹر اسٹیٹ لٹریری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ جواہر لال نہرو (ہندوستان کے سابق وزیر اعظم) کی وفات پر لکھی گئی ساحر کی نظم کو ان کے مجسمے کے نیچے نصب کیا گیا۔ 1977 میں حکومت پنجاب نے ساحر کو شرومنی اُردو ساہتیہ کار قرار دیتے ہوئے گولڈ میڈل، ابھی نندن گرنتھ سرو پال (شال) اور نقد رقم سے نوازا۔ اُن کے انتقال کے بعد پنجاب زراعتی یونیورسٹی لدھیانہ نے ایک خوبصورت پھول کا نام گل ساحر رکھا۔ وفات سے قبل انھیں پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

ساحر لدھیانوی کی مقبولیت کا ایک اہم ثبوت ہے اُن کے کلام کے مجموعوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور مقبول ہوئے۔ انھیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ اُن کی شاعری کے نہ صرف ہندوستان کی کئی زبانوں بلکہ انگریزی، فرانسیسی، چیک، روسی، فارسی و عربی جیسی بین الاقوامی زبانوں میں ترجمے کیے گئے اور مقبول ہوئے۔

بمبئی میں رہتے ہوئے ساحر لدھیانوی ادبی اور فلمی دونوں دنیا میں بے حد مقبول و معروف ہوئے۔ یہ ضرور ہے کہ زندگی کے ان ایام میں دولت و شہرت نے بڑھ کر ان کی قدم بوسی کی۔ لیکن وہ اپنی نجی اور خانگی زندگی سے بڑی حد تک بے زار رہے۔ اپنے مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کرنے کا انھیں موقع ہی نہ ملا۔ ممکن ہے کہ اپنے والدین کے انتہائی تلخ اور ازدواجی تعلقات اور خود پچھلے ناکام معاشقوں اور تجربات کے زیر اثر ساحر گھر بسانے اور دنیا میں اپنا خاندان یا اپنی نسل چھوڑ جانے کی فطری انسانی خواہش کو پورا کرنے کی طرف مائل نہ ہوئے اور یوں وہ پوری عمر مجرد اور کنوارے ہی رہے۔

25 اکتوبر 1980 کی شب میں دس بجے بمبئی کے ورسوا میں اپنے فیملی ڈاکٹر کپور کے گھر علاج کی غرض سے آئے ہوئے تھے اور وہیں دل کے دورے کا خدشہ ہوا اور انتقال کر گئے۔

■

Dr.Rizwana Perween
D\o Mohammad Anwar
Alamganj peerwais market maidan,
Post: Gulzarbagh, Dist: Patna-800007 (Bihar)
Email:rperween101@gmail.com

جائزہ

2017 کا فکشن اور فکشن تنقید

اسلم جمشید پوری

ہر سال جنوری کے مہینے کے آنے پر ہم نئے سال کا جشن مناتے ہیں۔ گذشتہ سال کا محاسبہ کرتے ہیں۔ نئے نئے منصوبے بناتے ہیں اور نشانے طے کرتے ہیں۔ ہم میں سے بعض منصوبے ہی بناتے رہتے ہیں اور سال خموشی سے گذر جاتا ہے۔ بعض اپنے اہداف سے بھی زیادہ عمل کر لیتے ہیں۔ بہر حال، زمانہ اور وقت یوں ہی لمحہ لمحہ، صبح سے شام، رات اور پھر نئے دن کی شروعات، سے گزرتے ہوئے دن، ہفتے، مہینے اور پھر 12 مہینوں کے بعد سال، تبدیل ہو کر وقت نامی سمندر میں محض ایک بوند کی طرح سما جاتا ہے۔ سال کی ابتدا میں بارہ مہینوں اور 365 روز کا سال خاصا طویل نظر آتا ہے لیکن یہ کس برق رفتاری سے گذر جاتا ہے، اس کا احساس دسمبر کے آخری ہفتے میں شدید ہوتا ہے۔ اسی ہفتے، پورے سال کا محاسبہ کر کے نفع و نقصان کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ادب میں بھی یہ سلسلہ قائم ہے۔ ہر سال نئے ادب کی آمد ہوتی ہے اور متعدد تحریریں پس پردہ چلی جاتی ہیں۔ کئی نئے ادیب جلوہ گر ہوتے ہیں اور متعدد، ہم سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک 2017 کے فکشن کا تعلق ہے تو کئی ناول، افسانوی مجموعے، فکشن تنقید کی کتب نے اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔

2017 کے ناول :

اس برس ہند و پاک میں متعدد ناول شائع ہوئے۔ اماوس میں خواب (حسین الحق)، خواب سراب (انیس اشفاق)، ہم جان (فارس مغل)، بے رنگ پیا (امجد جاوید)، خزاں کے بعد (نوشابہ خاتون)، دکھ دان (اسلام اعظمی) جج صاحب (اشرف شاد) میرے ہونے میں کیا برائی ہے (رینو بہل) اینکر (وقاص عزیز) خلش (سفینہ بیگم)، یہ راستہ کوئی اور ہے (اقبال حسن خاں)، کوہ گراں (خالد محمد فتح)، سائے (محمد عامر رانا)، ڈیوس، علی اور دیا (نعیم بیگ)، غلام باغ (مرزا اطہر بیگ) ہندوستان میں پہلی بار شائع ہوا۔

جہاں تک اردو ناول کی سمت و رفتار کا تعلق ہے تو یہ بات قابل اطمینان ہے کہ گذشتہ کئی برسوں سے ناولوں کی اشاعت مسلسل ہو رہی ہے۔ 2017 میں بھی یہ رفتار اور تسلسل قائم رہا ہے۔ اس سال جن ناولوں نے خاصی شہرت حاصل کی ان میں حسین الحق کا ناول 'اماوس میں خواب' ہے۔ حسین الحق کا یہ نیا ناول ایک طویل خاموشی کے بعد آیا ہے۔ اس سے قبل ان کے دو ناول 'بولو مت چپ رہو' اور 'فرات' شائع ہو چکے ہیں۔ 1970 کے بعد کی نسل میں آپ کا شمار سنجیدہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اماوس میں خواب ان کا اس سال شائع ہونے والا تازہ ترین ناول ہے۔ یہ 2017 میں شائع ہونے والا ایک دھماکہ خیز ناول ہے۔ ناول تقسیم کی کوکھ سے جنم لینے والے ایسے انسان کی کہانی ہے جو تہذیب کی شکست و ریخت سے نہیں بلکہ تہذیب کے ہر پل بدلتے منظر نامے سے پریشان ہے، جو اپنے آپ کو 47 سے موجودہ عہد 2016 تک کے زمانے میں کہیں فٹ نہیں کر پاتا ہے۔ یہ ایسا انسان ہے جو مسلمان ہی نہیں، اسماعیل ہی نہیں، رمیش بھی ہے، نہال سنگھ بھی، نائلہ بھی ہے، اسماعیل، جو ناول کا مرکزی کردار ہے، در اصل خواب اور تعبیر کے درمیان ہچکولے کھانے والے شخص کا نمائندہ ہے، جس کے اپنے خواب ہیں، تمنائیں اور آرزوئیں ہیں۔ لیکن اس کے خواب، خواب ہی رہ جاتے ہیں، انہیں حقیقت کی زمین نہیں ملتی، کیونکہ حقیقت کی زمین تو ممبئی کے واقعات سے لے کر بہار اور پھر دلی کے جے این یو تک تہذیب کے بدلتے منظر نامے میں گم ہوگئی ہے اور اس کے خواب چکنا چور ہوئے ہیں، ورنہ اسمٰعیل کے خواب بھی، رنگین تھے، ان میں بھی زندگی کی تمام تر رعنائیاں موجود تھیں۔ اسمٰعیل کے خواب میں شریک ہو کر قاری بھی تھوڑی دیر کے لیے خوابوں کی حسین وادی میں پہنچ جاتا ہے۔

اسی سال ایک اور بہت خوبصورت اور عمدہ ناول شائع ہوا 'خواب سراب' انیس اشفاق کا یہ خوبصورت ناول بھی حسین الحق کے خواب کی طرح کبھی خواب، کبھی حقیقت اور کبھی دونوں، سراب کی صورت سامنے آتے ہیں۔ انیس اشفاق، اس سے قبل 'دکھیارے' لکھ کر ناول کی دنیا میں تہلکہ مچا چکے ہیں، جسے معروف فکشن نگار انتظار حسین نے کافی سراہا تھا۔ انیس اشفاق افسانے بھی عمدہ لکھتے ہیں۔ تنقید میں بھی انیس اشفاق کا نام خاصا معروف ہے۔

انیس اشفاق کا ناول 'خواب سراب' ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اس ناول میں انیس اشفاق نے لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کو Preserve کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ انھوں نے مرزا ہادی

رسوا کے ناول 'امراؤ جان ادا' کے قصے سے قصے کو جوڑ کر لکھنؤ کی تہذیب کے باقیات اور موجودہ عہد میں سانس لیتی زندگی کو فنی چابک دستی سے ناول میں پرویا ہے:

''میں اندر داخل ہوا تو دیکھا ایک بڑے کمرے میں جو کبھی بیٹھکے کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہوگا، چاروں طرف تخت بچھے جن پر طرح طرح کے پرانے سامان قرینے سے رکھے ہیں۔ ان سامانوں میں نقشی پاندان، حقے، جربیں، خاص دان اور سرمہ دانیاں، قد آدم آئینے، اگالدان، چلمنیں، اچکنیں اور زرکار دوشالے، سلفچیاں، آفتابے، سماور اور میر فرش، بہت عمدہ نقاشی والے چینی کے برتن اور نایاب نگوں والی انگوٹھیاں تھیں۔ تختوں کے پیچھے لکڑی کی دو بڑی میزیں تھیں جن میں سے ایک پر موٹی موٹی جلدوں والی بہت سی جہازی سائز کی کتابیں اور دوسری پر چھوٹے بڑے سائز کی جلد اور بغیر جلد والی کتابیں رکھی تھیں۔ انہیں میزوں سے کچھ دور پر کرم خوردہ کتابوں کے کئی بنڈل رکھے ہوئے تھے۔''

(خواب سراب، انیس اشفاق ص 19)

انیس اشفاق کا یہ ناول، ہماری روایت کو استحکام بخشتا ہے۔

اس سال ڈاکٹر رینو بہل کا ناول 'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' بھی منظر عام پر آیا ہے۔ ناول کا موضوع بہت نیا نہیں تو عام بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل نے بڑی فن کاری سے مرد، عورت کے علاوہ تیسری جنس کو موضوع بنا کر ایک خوبصورت ناول تحریر کیا۔ شنکر نامی بچے کو جب آٹھ نو سال کی عمر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ تیسری جنس سے تعلق رکھتا ہے تو اس کی زندگی کتنی بھیانک اور خطرناک ہو جاتی ہے۔ گھر، محلے کے افراد اور دوست احباب حتی کہ خونی رشتوں میں جو رویے کی تبدیلی آتی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ انھیں سب سے راہ فرار حاصل کر کے شنکر، شکھا بن جاتی ہے۔ ناول سماج کی ایک دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے سماج کی گندی ذہنیت کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ پاکستان کے ناقد ڈاکٹر ریاض احمد لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر رینو بہل نے جس پیرائے میں یہ ناول لکھا ہے، اسے پڑھنا، شروع کر کے ختم کیے بغیر چھوڑنا آسان نہیں۔ آخر میں وہ قارئین کی سوچ، رہنمائی اور عمل کے لیے اسی مجبور اور بے قصور فرد کی زبان میں ایک سوال چھوڑ جاتی ہے کہ میرے ہونے میں کیا برائی ہے۔''

(میرے ہونے میں کیا برائی ہے، ڈاکٹر رینو بہل)

'ڈیوس علی اور دیا' عکس پبلی کیشنز، لاہور کے ذریعے شائع ہونے والا نعیم بیگ کا ایک اہم ناول ہے۔ نعیم بیگ موجودہ وقت میں پاکستان کے اہم فکشن نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے مذکورہ ناول میں موجودہ سیاسی اور سماجی صورت حال کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ ناول میں اگر سیاسی معرکے، دھوکے بازیاں اور طوطا چشمی موجود ہے تو حسن و عشق یعنی رومان بھی موجود ہے۔ زمینی حقائق کو اپنے دامن میں سمیٹے 'ڈیوس علی اور دیا' ایک ایسا ناول ہے جس میں دلچسپی، حیرت اور واقعات و شخصیات کا ایسا تصادم ہے کہ پڑھنے والا ایک بار ناول شروع کرے تو پھر ختم کر کے ہی دم لے۔ ناول میں سارہ، نعمان علی، دیا وغیرہ اہم کردار ہیں جو ہمارے آج کو پیش کرتے ہیں۔

خالد محمد فتح کا نیا ناول 'کوہ گراں'، ناول کے قارئین کے لیے نیا پہلو لے کر آیا ہے۔ خالد محمد فتح یوں بھی منفرد فکشن نگار ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں نے بھی چونکایا تھا۔ 'کوہ گراں' میں خالد محمد فتح نے پانی کی قلت اور بحران کو کچھ اس طور موضوع بنایا ہے کہ وہ انسانی زندگی کی حقیقت بن گیا ہے، فاطمہ، گڈو، ویسو وغیرہ اس کے اہم کردار ہیں۔ ناول کی زبان متاثر کرتی ہے۔

سفینہ بیگم کا پہلا ناول 'خلش' نے خاتون ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے کا کام کیا ہے۔ 'خلش' میں چار لڑکیوں کے کردار ہیں جو اپنی اپنی قسمت سے مختلف النوع زندگی گذارتی ہیں۔ مرد اساس سماج میں خواتین کے کردار کا کیا مقام و مرتبہ ہے، 'خلش' میں بہتر طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ناول میں پلاٹ، کردار، مکالمے اور تصادم وغیرہ ناول نگار کی فن پر دسترس کے غماز ہیں۔ پروفیسر عقیل احمد صدیقی ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان لڑکیوں میں بعض کی تقدیر مرد اساس معاشرے کے تشدد سے لکھی جاتی ہے، جس میں ایک نمایاں پہلو استحصال بھی ہے اور جس کے خلاف مصنفہ نے اخلاقی جرأت کا اظہار کرتے ہوئے ان لفظوں میں احتجاج کیا ہے کہ عورت جیت کر بھی نہیں جیت پاتی اور مرد ہار کر بھی جیت جاتا ہے۔''

(خلش، سفینہ بیگم، فلیپ کور، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس)

محمد عامر رانا کا ناول 'سائے' نے بھی اپنی موجودگی درج کرائی ہے، لاہور کی زندگی، عام زندگی کے کرب اور رشتوں کے نشیب و فراز کو عمدگی سے ناول میں سمویا گیا ہے۔

2017 کا افسانہ

جہاں تک 2017 کے افسانوں کا معاملہ ہے تو اس سال افسانوی مجموعے کچھ کم شائع ہوئے۔ پھر بھی 'پورٹریٹ' (اقبال حسن آزاد) اضطراب (افشاں ملک)، اب میں وہاں نہیں رہتا (دیپک بدکی)، جہاں گم گشتہ (نگہت سلیمی)، بات کہی نہیں گئی (تیمیں کرن)، کھویا ہوا جزیرہ (عبدالقیوم خالد)، دعا کی قبولیت (حسن نظامی کیراپی) آئینہ گر (منزہ احتشام)، لہو لہو منظر (سلیم خان)، آخری بوند (توصیف احمد) کلیشے (خرم بقا)، خاک کی مہک (ناصر عباس نیر)، فرشتہ نہیں آیا، (ناصر عباس نیر)، اب صبح نہیں ہوگی (ابو اللیث جاوید)، ٹوٹی ہوئی سڑک (محمد جمیل اختر)، پرانے کپڑوں کا سوداگر (عبدالمتین جامی) کی اشاعت نے امید کو باقی رکھا ہے۔

اقبال حسن آزاد کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ ان کا تازہ افسانوی مجموعہ 'پورٹریٹ' کی اشاعت نے ادبی حلقوں میں خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ اقبال حسن آزاد کے اس سے قبل دو افسانوی مجموعے 'قطرہ قطرہ احساس' 1977 اور 'مردم گزیدہ' 2007 میں شائع ہو چکے ہیں۔ اب اقبال حسن آزاد نئے مجموعے کے ساتھ حاضر ہیں۔ 'پورٹریٹ' میں 23 افسانے شامل ہیں۔ اقبال حسن آزاد کے افسانے عام سماج اور عام آدمی کی عکاسی کرتے ہیں۔ مجموعے کے کئی افسانے پورٹریٹ، گملے میں اگی ہوئی زندگی، جلتی ریت پر ننگے پاؤں سفر، بریکنگ نیوز، محبت، حصار، پھر کب آؤ گے، عمدہ افسانے ہیں۔

ڈاکٹر افشاں ملک کا شمار نئی نسل کی ان خاتون افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے بیسویں صدی کے اواخر میں اپنا سفر شروع کیا اور نئی صدی میں استحکام حاصل کیا۔ افشاں ملک کا پہلا مجموعہ 'اضطراب' شائع ہوتے ہی، ایوان ادب میں چھا گیا، 'اضطراب' میں افشاں ملک کے 16 / افسانے شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں اور فلیپ کور پر معروف افسانہ نگار اور اسکالرز نے افشاں ملک کی افسانہ نگاری پر عمدہ تجزیے کیے ہیں جن میں نجمہ محمود، شموئل احمد، نعیم بیگ، طارق چھتاری اور انجم عثمانی نے افشاں کے افسانوں کو موجودہ عہد کے افسانے کے لیے نیک فال بتایا ہے۔ مجموعے کے کئی افسانے 'کاٹھ کے گھوڑے'، یاجوج ماجوج، گود لی ہوئی ماں، کلنک، گورغریباں، سونے کا ڈھکن، سمندر، جہاز اور میں ایسے افسانے ہیں جو چونکاتے ہیں۔ یہ افسانے مستقبل میں افشاں ملک کی شناخت بنیں گے۔

بزرگ افسانہ نگار مرحوم حسن نظامی کیراپی کا مجموعہ 'دعا کی قبولیت' کی اشاعت بھی گذشتہ برس ہوئی۔ حسن نظامی کیراپی کا تعلق جمشید پور سے تھا۔ ان کا شمار بزرگ افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ وہ ایک خاص قسم کے افسانے تحریر کرتے تھے، جو حق پرستی اور حق و صداقت کو منظر عام

پر لانے کا کام کرتے تھے۔ مذکورہ مجموعہ ان کا آخری مجموعہ ہے۔ اس سے قبل 'تحفہ' اور 'انشاء اللہ' نام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'دعا کی قبولیت' میں تقریباً 46 افسانے اور 22 افسانچے شامل ہیں جب کہ صفحات 144 ہیں۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ افسانچوں کی طرح افسانے بھی مختصر ہیں۔ دراصل یہ سب حالات حاضرہ اور انسانی اخلاق وکردار کے عکاس ہیں۔ زیادہ تر افسانے، افسانہ نگار کے آس پاس وقوع پذیر ہونے والے سیاسی اور سماجی واقعات وحادثات کا موثر اظہاریہ ہیں۔

'لہو لہو منظر' سلیم خان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ 'نیم چندن اور کوئل' شائع ہو چکا ہے۔ سلیم خان کے زیادہ تر افسانے موجودہ سماج پر گہرا طنز ہیں۔ وہ چھوٹے افسانے لکھنے کے عادی ہیں۔ یوں بھی مختصر افسانے تحریر کرنا کوزے میں سمندر بھرنے کے مصداق ہے۔ مجموعے میں ان کے تقریباً 20 افسانے شامل ہیں۔ ان میں کئی ایک تو یاد رہ جانے والے افسانے ہیں۔ لہو لہو منظر، آخری قبر، مٹی کا رشتہ، بدنام گلی، سمجھوتا، خارزار کا مسافر وغیرہ۔ حقانی القاسمی نے ان کی افسانہ نگاری پر بجا لکھا ہے:

''سلیم خان کی یہ مختصر کہانیاں آج کے عہد کے مسائل سے مکمل مکالمہ ہیں، یہ سیاست، سماج کی بے چہرگی، قدروں کے زوال، قدری ترجیحات کی تبدیلیوں کا مکمل بیانیہ ہے، مہنگائی، بے روزگاری، تشدد، بدعنوانی، سیاسی مکرو فریب جو آج کی عصری زندگی کا لازمہ بن چکی ہیں۔ یہ تمام موضوعات ان کی کہانیوں کا حصہ ہیں۔''

(حقانی القاسمی، فلیپ کور، لہو لہو منظر، 2017، جلگاؤں، مہاراشٹر)

'اب صبح نہیں ہوگی' ابواللیث جاوید کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ ابواللیث جاوید اصلاحی فکر کے معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے انفرادیت کے حامل ہیں۔ اسلامی فکر، اخلاق وکردار، اسلامی طرز معاشرت پر ابواللیث جاوید نے متعدد عمدہ افسانے تخلیق کیے ہیں۔ اس سے قبل بھی ان کے تین مجموعے 'کانچ کا درخت'، کنارے کٹ رہے ہیں، جاگتی آنکھوں کا خواب، منظر عام پر آ چکے ہیں۔ مجموعے کے کئی افسانے مثلاً 'چراغ کی لو، زبان یار من ترکی، نصیب دشمناں، اب صبح نہیں ہوگی، سناٹا بولتا ہے، بیچ تھری وغیرہ نہ صرف لیک سے ہٹ کر ہیں بلکہ ابواللیث جاوید کی شناخت بھی ہیں۔ 'بیچ تھری' میں سپریم کورٹ کے ذریعے ہم جنسی کو غیر قانونی قرار دیے جانے کے بعد ہم جنس جوڑے کے ردعمل کو موضوع بنایا گیا ہے۔

گلزار جاوید اپنے طرز کے انوکھے افسانہ نگار ہیں۔ بے باکی اور سلیقے سے بات کہنا، ان کا خاصہ ہے۔ ان کا تازہ افسانوی مجموعہ 'وہی خدا ہے' ابھی شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل ان کے مجموعے 'خود ساختہ ناخدا' کی اشاعت نے گلزار جاوید کی انفرادیت کا سکہ جما دیا تھا۔ گلزار جاوید، گذشتہ کئی دہائیوں سے 'چہار سو' کے ذریعے ادب کی بے بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔ 'وہی خدا ہے' کے افسانے اپنے پس منظر اور پیش منظر کے مطابق بولی اور زبان میں کچھ اس طور گندھے ہوتے ہیں کہ وہ ہر شخص کی کہانی معلوم ہوتے ہیں۔ معروف فکشن نگار شوکل احمد گلزار جاوید کی افسانہ نگاری کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''گلزار کے افسانے ذہن وشعور کی فنی جہت کی بازیافت کرتے ہیں۔ خارجی اور باطنی حقیقت کی عکاسی میں یہ افسانے گرد وپیش کی دنیا کے آئینہ دار ہیں۔''

(شوکل احمد، فلیپ کور، وہی خدا ہے)

'سنو کہانی، سنو کہانی' کے عنوان سے ایک بے حد خوبصورت کتاب دو جلدوں میں منظر عام پر آئی ہے۔ اس کتاب کو جامعہ ملیہ کے استاد ڈاکٹر ندیم احمد اور ان کی ریسرچ اسکالر غزالہ فاطمہ نے مرتب کیا ہے۔ بچوں کے لیے تحریر کردہ کہانیوں کے اس جامع انتخاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اردو والوں کی بچوں کے ادب کی طرف رغبت میں اضافہ ہو۔ بچے ان کہانیوں کو پڑھیں تو ان کی اخلاقی تربیت عمل میں آئے۔ دونوں جلدوں میں معروف قلم کاروں، منشی پریم چند، احمد جمال پاشا، مشیر الحق، سراج انور، غلام حیدر، عبد اللہ ولی بخش، اطہر پرویز، مسعودہ حیات، رشید احمد صدیقی، خلیق انجم اشرفی، زکی انور، عبد الستار صدیقی، آصفہ مجیب، صالحہ عابد حسین، سلام بن رزاق، مرزا ادیب، محمد مجیب، فیض احمد فیض، اشفاق حسین، حامد علی خاں، قاضی سلیم، شمیم حنفی، محمد طیب، صہبا لکھنوی، سیدہ سیدین، سید منیر الحسن، جیلانی بانو، دولت خانم، غلام ربانی، خواجہ احمد عباس، راشد الخیری، مولوی عبد الحق، رابندر ناتھ ٹیگور، بیگم سلطانہ حنفی، آمنہ ابوالحسن، رام لال، سری نواس لاہوتی، یوسف ناظم، مناظر عاشق ہرگانوی، عبد الحلیم ندوی، حیات اللہ انصاری وغیرہ تقریباً 144 مصنفین کی 195 کہانیوں کو جمع کیا گیا ہے۔ کہانیوں کے انتخاب میں ترتیب زمانی کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ ویسے یہ کتب طالب علموں خصوصاً بچوں کے ادب پر کام کرنے والوں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے۔

معروف افسانہ نگار مرحوم نیر مسعود کا افسانوی مجموعہ 'گنجفہ' جسے پہلے ہی شہرت دوام حاصل ہو چکی ہے۔ عرشیہ پبلی کیشنز نے اسے نئے گیٹ اپ، خوبصورت سرورق اور کم وزن کاغذ پر شاندار طریقے سے شائع کیا ہے۔

2017 **فکشن تنقید**

گذشتہ برس فکشن تنقید کے معاملے میں اچھا رہا ہے۔ اس سال کئی اہم کتب شائع ہوئیں۔ متعدد مونو گراف تحریر ہوئے۔ فکشن نگاروں اور فکشن ناقدین پر بھی کتابیں اور رسالوں میں خصوصی گوشے شائع ہوئے۔ متعدد انتخابات بھی سامنے آئے۔

'کلیات سہیل عظیم آبادی' کی شکل میں بہار اردو اکادمی کا ایک فخریہ کارنامہ سامنے آیا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم گذشتہ کئی برسوں سے اس پروجیکٹ پر کام کر رہے تھے۔ اس کا سب کو بے صبری سے انتظار تھا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سہیل عظیم آبادی کے بھی افسانے تین جلدوں میں جمع کیے ہیں ساتھ ہی ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں سہیل عظیم آبادی کے افسانوں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو فنی بصیرت سے قلم بند کیا ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی ایک اور کتاب 'سہیل عظیم آبادی کے منتخب افسانے' ادبی حلقوں میں ستائش کی نظروں سے دیکھی گئی۔ دراصل یہ کتاب نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے شائع کی ہے۔ کتاب میں پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سہیل عظیم آبادی کے 28 افسانے شامل کیے ہیں۔ ارتضیٰ کریم نے اس کتاب سے سہیل عظیم آبادی کے تعلق سے کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان پر خواہ مخواہ ہمارے ناقدین نے پریم چند سے کلی طور پر متاثر ہونے کا دعویٰ کیا یا یہ کہہ دیا کہ پریم چند اگر پورے ہندوستان کے گاؤں کی تصویر پیش کر رہے تھے تو سہیل عظیم آبادی بہار کی دیہی زندگی کو اپنے افسانے کا موضوع بنا رہے تھے، اس لیے انہیں پریم چند کا پیروکار اور بہار کا پریم چند بھی کہا گیا۔ جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ بات جزوی طور پر درست ہو سکتی ہے کلی اعتبار سے نہیں۔ یہ سچ ہے کہ انھوں نے بہار اور چھوٹا ناگپور کو اپنی تحریروں میں نمایاں جگہ دی ہے مگر ان کی کہانیوں میں پورا ہندوستان اور پورا انسان چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے۔''

(سہیل عظیم آبادی کے منتخب افسانے، ارتضیٰ کریم، این بی ٹی، 2017)

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی دونوں کتابیں، سہیل عظیم آبادی کے تعلق سے نہ صرف تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کرتی ہیں بلکہ سہیل عظیم آبادی کے فکشن کی تفہیم وتعبیر میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

فکشن تنقید میں بشیر مالیرکوٹلوی کی کتاب 'گستاخی معاف' نے خاصا ہنگامہ برپا کیا۔ کتاب کے عنوان سے واضح نہیں ہوتا کہ یہ فکشن پر تنقید ہوگی۔ بشیر مالیرکوٹلوی

نے اردو کے معروف افسانوں 'بو، ٹھنڈا گوشت، پھوجا حرام دا شہید سازی، بابو گوپی ناتھ، موذیل (سعادت حسن منٹو) پیتل کا گھنٹہ (قاضی عبدالستار) بین (احمد ندیم قاسمی) لاجونتی (راجندر سنگھ بیدی) لحاف (عصمت چغتائی) مہالکشمی کا پل (کرشن چندر) کے تجزیے بالکل نئے انداز میں کیے ہیں بلکہ انھیں تجزیہ نہ کہہ کر افسانوی آپریشن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور اسی مناسبت سے شاید انھوں نے کتاب کا نام 'گستاخی معاف' رکھا ہے۔ انھوں نے برسوں سے چلی آرہی ان افسانوں کی ساکھ اور عام تفہیم سے الگ، حقائق اور زبان کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے اور بعض غلطیوں، خامیوں، بعید از قیاس باتوں کی نشاندہی کی ہے۔ منٹو کے افسانوں کے ایسے متعدد گوشوں کی طرف انھوں نے واضح الفاظ میں لکھا ہے۔ ''ٹھنڈا گوشت'' کے ایک پہلو پر بشیر مالیر کوٹلوی کی رائے ملاحظہ کریں:

''تمھیں میری قسم.....بتاؤ! کہاں رہے.....؟ شہر گئے تھے.....؟'

یہ مکالمہ اپنی سمجھ سے باہر ہے۔ استاد نے (بشیر مالیر کوٹلوی، سعادت حسن منٹو کو اپنا روحانی استاد مانتے ہیں) پہلے ہی جملے میں بتا دیا کہ دونوں ہوٹل کے کمرے میں ملتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے ہوٹل جن کے کمرے رہائش کے لیے کرایہ پر ملتے ہوں، وہ شہروں میں ہی ہوتے ہیں۔ کسی گاؤں میں ہوٹل اینڈ ریسٹورینٹ بھی نہیں کہا جاسکتا وہ بھی اس دور میں، جس دور میں افسانہ سانس لے رہا ہے۔ شروعاتی جملوں میں استاد واضح کر رہے ہیں۔

''شہر کا مضافات ایک عجیب پر اسرار خاموشی میں غرق تھا۔''

یہ جملہ خود اپنے اندر ایک بڑا ثبوت ہے کہ اس وقت کلونت اور ایشر شہر میں موجود تھے۔ پھر کلونت کا یہ سوال کہ شہر گئے تھے...؟ بے معنی سا لگتا ہے۔''

(گستاخی معاف، بشیر مالیر کوٹلوی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس)

پروفیسر صغیر افراہیم فکشن تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ گذشتہ برسوں میں ان کی متعدد کتب فکشن تنقید کے حوالے سے شائع ہو چکی ہیں۔ 'پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ'' ان کی تازہ ترین کتاب ہے۔ گذشتہ سال کے آخر میں ان کی اردو ناول پر ایک عمدہ کتاب 'اردو ناول: تاریخ، تعریف اور تجزیہ' آچکی ہے۔ موجودہ کتاب پریم چند پر ان کی اہم کتاب ہے۔ یوں بھی اردو فکشن میں پریم چند پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔

پروفیسر صغیر افراہیم نے مذکورہ کتاب میں پریم چند کے افسانوں، ناولوں اور دیگر تحریروں کا اچھا محاکمہ کیا ہے۔ پریم چند کے فکشن کے متعدد گوشوں کو سامنے لانے والی اس کتاب میں صغیر افراہیم نے پریم چند کی حب الوطنی کی طرف ٹھوس اشارے کیے ہیں۔ تحریک آزادی کے لیے وہ کس طرح نوجوانوں کے جذبے کو ابھارتے ہیں:

''پریم چند نے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور وقت کے تقاضوں سے قوم کو واقف کرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ملک کے نوجوان ایک محاذ پر جمع ہو کر غلامی اور بگڑی ہوئی صورت حال کا مقابلہ کریں۔ اپنی دھرتی سے قلبی لگاؤ، آزادی کے لیے تڑپ اور لگن کا اظہار، پریم چند کے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ان کی دیگر تحریروں سے بھی ہوتا ہے۔''

(پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ، پروفیسر صغیر افراہیم علی گڑھ 2017)

'فکشن کا صغیر رحمانی (صغیر رحمانی کے افسانے)' انجم پروین کی ترتیب شدہ کتاب ہے۔ ادھر ایک صحت مند رجحان یہ شروع ہوا ہے کہ نئی نسل کے بعض معروف افسانہ نگاروں کے حوالے سے بھی کام ہونے لگے ہیں۔ صغیر رحمانی، نئی نسل کے منفرد فکشن نگار ہیں جن کے ناول اور افسانے اپنے معاصرین سے نہ صرف الگ ہوتے ہیں بلکہ ان کا اسلوب انہیں بالکل واضح شناخت عطا کرتا ہے۔

انجم پروین نے صغیر رحمانی کے 15 افسانوں کا انتخاب کیا ہے اور ایک طویل اور بھرپور مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ مقدمے میں انجم پروین نے صغیر رحمانی کے معاصرین کا بھی مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ صغیر رحمانی کے فکشن کے تعلق سے وہ لکھتی ہیں:

''انھوں نے جو کچھ لکھا اور جب لکھا وہ نہ تو ہوائی قلعے ہیں اور نہ محض ذہنی اختراع ہے بلکہ سماج کے ایسے کریہہ پہلو اور تلخ حقائق ہیں اور وہ غلاظت ہے جس کی بساندھ پر لوگ ناک تو بند کر سکتے ہیں اسے وہاں سے ہٹانے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ صغیر رحمانی کے قلم میں جو نوکیلی دھار، ذہن میں جو تلملا دینے والا خیال ہے جب یہ دونوں باہم ضم ہوتے ہیں تو ایسی ایسی سفاک سچائیاں اور دلدوز واقعات و حقائق بے نقاب ہوتے ہیں کہ انسانی ضمیر بھی چند ثانیوں کے لیے جھنجھنا اٹھتا ہے۔''

(صغیر رحمانی کا فکشن، انجم پروین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2017)

راقم کی کتاب 'اردو فکشن کے پانچ رنگ' بھی اس سال شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ اور افسانچہ پر تفصیلی مضامین اور متعدد تجزیے شامل ہیں۔ پروفیسر ساغر برنی مرحوم کا تحقیقی مقالہ ''جدیدیت اردو افسانہ: بدلتی قدریں'' اردو افسانے کی تنقید کے حوالے سے ایک انتہائی اہم اور سنجیدہ کوشش کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔

'اردو کی معروف خواتین افسانہ نگار' (جلد اول) اسماء نبی کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ کتاب میں نذر سجاد حیدر، خاتون اکرم، رشید جہاں، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، شکیلہ اختر، رضیہ سجاد ظہیر، ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، ہاجرہ مسرور، جمیلہ ہاشمی، صالحہ عابد حسین سے موجودہ عہد کی افسانہ نگار جیلانی بانو، ذکیہ مشہدی، نگار عظیم، ترنم ریاض، شائستہ فاخری تک تقریباً 26 خواتین افسانہ نگاروں کے بارے میں ہر ایک پر تین چار صفحات پر مبنی مختصر نوٹ شامل کیے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہی نام ہیں جو اکثر اس طرح کی کتاب میں شامل ہو چکے ہیں۔

'حیات اللہ انصاری کی کہانی کائنات' ڈاکٹر عشرت ناہید کی مرتبہ کتاب ہے۔ حیات اللہ انصاری کا شمار اردو کے معروف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند افسانے کی عمدہ مثال حیات اللہ انصاری کے تمام افسانوں کو عشرت ناہید نے کتاب میں جمع کر کے اہم کام کیا ہے۔ اس سے حیات اللہ انصاری پر کام کرنے والوں کو سہولت ہوگی۔

'انتظار حسین: حیات و فن' ڈاکٹر نعیم انیس کے ذریعے مرتب کردہ کتاب ہے۔ یہ کتاب دراصل انتظار حسین پر مغربی بنگال اردو اکادمی کے ذریعے منعقدہ سیمینار کے مقالات کا مجموعہ ہے جس پر ڈاکٹر نعیم انیس کا بھرپور مقدمہ شامل ہے۔ کتاب میں انتظار حسین کے فکشن اور تنقید کے مختلف گوشوں پر 26 مضامین شامل ہیں۔

ڈاکٹر رضوانہ پروین کا تحقیقی مقالہ 'الیاس احمد گدی اور سنجیو کی ناول نگاری: تقابلی مطالعہ' کتابی شکل میں سامنے ہے۔ ڈاکٹر رضوانہ پروین نے بڑی محنت سے نہ صرف اردو اور ہندی کے دو ایسے ناول نگار جو ایک ہی عہد کے ہیں، کا تقابل کیا ہے بلکہ تقابلی مطالعے پر بھی خاصی بحث کی ہے۔ تقابلی تنقید کے حوالے سے ایک اچھی کتاب ہے۔

'اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار' دیپک بدکی کی ایک اہم کتاب ہے، دیپک بدکی، خود ایک معروف فکشن نگار ہیں۔ انھوں نے تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے غیر مسلم افسانہ نگاروں، پریم چند سے لے کر جوگندر پال، رتن سنگھ تک کے تمام افسانہ نگاروں کو شامل کیا ہے۔ ایک اچھی تحقیقی کتاب ہے۔

ادھر کئی اچھے مونوگراف معروف اردو فکشن نگاروں پر شائع ہوئے ہیں۔ جن میں الیاس احمد گدی (ڈاکٹر

ہمایوں اشرف)، غیاث احمد گدی (ڈاکٹر نسیم احمد نسیم) دیویندر ستیارتھی (عبدالسمیع) خاص ہیں۔ مونوگراف کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ شخصیات کا ایک مختصر اور جامع محاکمہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

'صغیر افراہیم کا تنقیدی شعور' ڈاکٹر مظفر اقبال کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو کتابی صورت میں سامنے ہے۔ صغیر افراہیم معروف فکشن تنقید نگار ہیں۔ انھوں نے پریم چند اور عہد پریم چند پر خاصا کام کیا ہے۔ ان کی دیگر متعدد کتابیں بھی انہیں بحیثیت ناقد مستحکم کرتی ہیں۔ ادھر انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں جو گذشتہ برس 'کڑی دھوپ کا سفر' مجموعے کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شخصیت اور تنقیدی کارناموں کا ڈاکٹر مظفر اقبال نے سلیقے سے احاطہ کیا ہے۔

صادقہ نواب سحر، نے گذشتہ 12-10 برسوں میں بطور فکشن نگار اپنی مستحکم شناخت قائم کی ہے۔ ان کی فکشن نگاری پر ایک ضخیم کتاب 'صادقہ نواب سحر: شخصیت اور فن، فکشن کے تناظر میں' پروفیسر میر تراب علی اور اسلم نواب نے ترتیب دی ہے۔ کتاب میں صادقہ نواب کے افسانوی مجموعے اور ناولوں پر مشاہیر کے مضامین، تبصرے، تجزیے وغیرہ شامل ہیں۔

'طارق چھتاری: کردار و افکار' نئی نسل کے معروف ناقد ڈاکٹر راشد انور راشد کی نئے طرز کی کتاب ہے۔ ڈاکٹر راشد نے بالکل منفرد انداز میں طارق چھتاری کی شخصیت اور فن کے حوالے سے کتاب تحریر کی ہے۔

'خالد جاوید: شخصیت وفن' پر نوجوان ناقد محمد نہال افروز کی نہایت خوبصورت کتاب شائع ہوئی ہے۔ نہال افروز نے سنجیدگی کے ساتھ خالد جاوید کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر اظہار خیال کیا ہے۔

اسی سال اردو افسانوں کے دو اہم عالمی انتخاب شائع ہوئے۔ رابعہ الرباء نے اردو افسانے کا عالمی انتخاب کیا۔ دو جلدوں پر مشتمل اس انتخاب'' اردو افسانہ عہد حاضر میں'' کو خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ اس پر اعتراضات بھی بہت آئے کہ اس میں بہت سارے افسانہ نگار اس لیے چھوٹ گئے کہ انہیں خبر نہیں ہوئی اور مرتب نے اپنی سی کوشش کے بعد اسے شائع کر دیا۔ لیکن اب اس کی تیسری جلد شائع ہونے والی ہے جس میں شاید فہرست مکمل ہو جائے۔ دونوں جلدوں کی مجموعی ضخامت 1700 صفحات کے قریب ہے۔

'امریکا میں اردو افسانہ' مامون ایمن کی انتہائی اہم تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے۔ مامون ایمن نے بڑی محنت سے امریکہ میں رہنے والے تقریباً 145 ایسے افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کیے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان سے ہجرت کر کے امریکا پہنچے، یا جنھوں نے طویل عرصے تک وہاں قیام کیا۔ کچھ امریکی اردو افسانہ نگاروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ویسے زیادہ تر افسانہ نگار پاکستانی ہیں۔ کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں افسانہ، افسانے کے موضوعات، کردار، پلاٹ وغیرہ کے تعلق سے بھی مامون ایمن نے خاصی بحث کی ہے۔ مامون ایمن نے افسانہ نگاروں کے احوال و کوائف کے علاوہ ان کا ایک افسانہ اور تجزیہ شامل کیا ہے۔ امریکا میں اردو افسانے کے تعلق سے یہ اولین کاوش ہے جسے مثال پبلشرز، فیصل آباد نے شائع کیا ہے۔ کتاب 1150 صفحات پر محیط ہے۔

2017 کا ایک اہم واقعہ پروفیسر بیگ احساس کو ساہتیہ اکادمی انعام کا اعلان بھی ہے۔ انہیں یہ انعام ان کے تازہ ترین افسانوی مجموعے 'دخمہ' کے لیے دیا جائے گا۔ پروفیسر بیگ احساس اردو کے معروف فکشن نگار اور رسالہ 'سب رس' کے مدیر بھی ہیں۔ بیگ احساس کے افسانے انسانی اخلاق و کردار کے عروج و زوال کا نوحہ ہیں۔ عصری حسیت کو فنی مہارت سے استعمال کرنا ان کا خاص وصف ہے۔

2017 میں ادب میں ایک نیا معاملہ بھی سامنے آیا۔ ڈاکٹر ایم اے حق نے 'افسانچۂ اطفال' کے نام سے بچوں کے لیے افسانچے لکھنے کی شروعات کی۔ افسانچے اور افسانچہ اطفال میں خاص فرق موضوعات اور اس کا طرز بیان ہے۔ شاعر نے اس پر خاص گوشہ بھی شائع کیا ہے۔

نوجوان صحافی و ناقد منصور خوشتر کی کتاب 'اردو ناول کی پیش رفت' نے بھی خاصی دھوم مچائی۔ کتاب میں اردو ناول کی موجودہ صورت حال، موضوعات، کردار اور اہم ناولوں اور ناول نگاروں پر مضامین کے ساتھ ساتھ بعض ناولوں کے تجزیے بھی شامل ہیں۔ کتاب اکیسویں صدی میں اردو ناول کے ارتقا کو سمجھنے میں خاصی معاون ہے۔

2017 میں بعض رسائل کے اہم شمارے اور گوشے فکشن نگاروں پر شائع ہوئے۔ غالب نامہ کا خصوصی نمبر 'قرۃ العین حیدر ایک منفرد فکشن نگار' شائع ہوا۔ اس میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ذریعے منعقدہ بین الاقوامی قرۃ العین حیدر سمینار کے مقالے شامل ہیں۔ یہ خاص شمارہ قرۃ العین حیدر کے فکشن کی تفہیم و تعبیر میں طلبا اور اساتذہ کے لیے خاصا مفید ثابت ہوگا۔

عالمی اردو ادب، دہلی نے انتظار حسین نمبر شائع کیا، ہماری آواز کا بھی تازہ شمارہ گوشہ انتظار حسین پر مشتمل ہے۔ مژگاں نے گوشۂ اسلم جمشید پوری شائع کیا۔ تحریک ادب کا صغیر افراہیم پر گوشہ شائع ہوا۔ زاویے کا خصوصی شمارہ مختصر افسانہ پر شائع ہوا۔ یہ رسالہ بریلی کالج کے شعبۂ اردو سے شائع ہوا ہے۔ اس کے مدیران میں ڈاکٹر انوار وارثی اور ڈاکٹر شیو یہ ترپاٹھی ہیں۔ ندائے گل پاکستان کا مائکرو فکشن نمبر شائع ہوا ہے جس میں مائکرو فکشن یعنی چھوٹی چھوٹی کہانیاں شامل ہیں۔

2017 میں ہمارے کئی فکشن نگار ہم سے دائمی طور پر رخصت ہوئے۔ نیر مسعود (لکھنؤ)، بانو قدسیہ (پاکستان)، بلراج مین را (دہلی)، احمد جاوید (پاکستان)، اشفاق احمد (پاکستان)، ارشاد امروہوی (امروہہ)، حسن نظامی کیرانی (جمشید پور) وغیرہ اردو فکشن کی خدمت کر کے ملک عدم کو روانہ ہوئے۔

سوشل میڈیا پر فکشن

2017 کو اس معنی میں مزید اہم کہا جا سکتا ہے کہ اس سال سوشل میڈیا خصوصاً فیس بک اور وہاٹس ایپ پر فکشن کی دھوم مچی رہی۔ فکشن کے فروغ کے لیے متعدد گروپ سامنے آتے رہے۔ پہلے جو اردو افسانہ فورم تھا، وہ عالمی افسانہ فورم اور افسانہ فورم کی شکل میں آگے آیا ہے۔ اردو فکشن، قصہ کہانی، کہانیاں، عالمی افسانوی کارواں، انہماک فورم، کے علاوہ اردو نیٹ جاپان، شعر و سخن، اردو سخن، عالمی پرواز، ریختہ، اردو لائف ڈاٹ کام، اردو دوست ڈاٹ کام، دید بان اور وہاٹس ایپ پر اردو فکشن، عالمی اردو پروفیسرز گروپ، دستک ادبی فورم بی ایچ یو، اردو اسکالرز گروپ، ضیائے حق اردو اسکالرز گروپ، ادب سلسلہ، نیا دور، قمر صدیقی، اردو چینل ڈاٹ ان، صرف ادبی خبریں وغیرہ پر پرانے شاہکار افسانے، ناول، موجودہ افسانے، افسانے اور ناول پر تنقید کی بھر مار ہے۔ وہاٹس ایپ پر پورے پورے ناول اپ لوڈ کیے جا رہے ہیں۔ ہندوستان میں منصور خوشتر، قمر صدیقی، راغب دیشمکھ، محمد علیم، صدف اقبال وغیرہ اور پاکستان میں اشرف شاد، سید تحسین گیلانی، حسیب اعجاز، دیگر ممالک میں صدف مرزا، سین علی، وحید قمر، اسماء حسن، رابعہ الرباء، سرور غزالی وغیرہ سوشل میڈیا پر فکشن کی تبلیغ و اشاعت میں دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ اردو فکشن کا مستقبل بہتر ہے اور مزید بہتری کی امید کی جا سکتی ہے۔

■

Dr. Aslam Jamshedpuri
HOD, Urdu
CCS University, Meerut
aslamjamshedpuri@gmail.com
09456259850

پیشکش
ایم۔ ابصار احمد

پروفیسر محمد انصار اللہ کی کہانی
خود ان کی زبانی

کہا جاتا ہے کہ ہمارا خاندان زمانۂ قدیم سے ایک معزز خاندان رہا ہے۔ ہمارے اجداد کا تعلق خورجہ، ضلع بلند شہر سے ہے۔ ہمارے جد منشی خیرات اللہ صاحب مرحوم خورجہ میں معلم تھے۔ ریاضی کے استاد کی حیثیت سے مشہور تھے۔ ان کا انتقال 1943 میں ہوا۔

والد ماجد الحاج محمد مطیع اللہ صاحب نے چند ماہ شاہجہاں پور میں ملازمت کی اور باضابطہ سرکاری ملازمت اعظم گڑھ سے شروع کی۔ مکان بنوایا، کھیت، خریدا اور وہاں کے حلقۂ اشراف میں مقبول بلکہ ہردلعزیز تھے۔

ہمارے پڑھانے کے لیے مولوی ایوب مرحوم صاحب کو مقرر کیا گیا جو کہ ہمارے گھر کی بیٹھک میں ہی رہتے تھے۔ مجھ سے بہت خوش تھے۔ ایک مرتبہ ان کے استاد شیخ مولانا عبدالغنی مرحوم تشریف لائے تو مولوی صاحب نے مجھ سے قرآن پاک سنانے کو کہا۔ حضرت سن کر بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔

بعض بزرگوں کا بیان ہے کہ میں نے بہت کم سنی میں بولنا شروع کیا اور دو سال کی عمر سے الف سے بے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اتنی بات مجھے یاد ہے کہ جن دنوں میں قاعدہ پڑھتا تھا۔ بڑے بھائی سمیع اللہ صاحب تیسواں پارہ پڑھتے تھے۔ میں نے ان کو سن کر سورہ عم یتساء لون یاد کر لی تھی اور پوری سورہ ایک دن مولوی صاحب کو سنا دی تھی۔

1942 کے وسط میں علی مظہر صاحب مرحوم ہم کو انگریزی اور ریاضی پڑھانے پر مامور ہوئے۔ والد صاحب ان کو دو روپیہ ماہوار دیتے تھے۔ 1943 میں چند ماہ کی تعلیم کے بعد ہی جولائی کے مہینے میں ماسٹر صاحب ہم کو داخلہ دلانے کے لیے لے گئے۔

شبلی کالج کے پرنسپل اس وقت بشیر صاحب تھے۔ مجھے دیکھ کر فرمایا ''کیا دودھ چھڑا کر لے آئے ہو۔'' خیر امتحان ہوا اور ہم دونوں بھائی ساتویں جماعت میں داخلے کے لائق سمجھے گئے۔ ماسٹر صاحب نے چھٹی جماعت میں میرا نام لکھایا۔ صحیح تاریخ پیدائش انھیں معلوم نہ تھی۔ 4 جنوری 1936 لکھوا دی۔ وہی سرٹیفکٹ پر چلی آتی ہے جبکہ والد صاحب کی ایک بیاض کے مطابق تاریخ ولادت 16 جولائی 1934 ہے۔

والد صاحب نے خوش ہو کر ماسٹر صاحب کی تنخواہ میں آٹھ آنے ماہوار کا اضافہ کر دیا۔ ماسٹر صاحب اس اضافے سے نہایت خوش ہوئے۔ ہمارے داخلے کے سبب ان کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ شہرت حاصل ہوئی کہ باید و شاید اب تو کیفیت یہ تھی کہ ان سے لوگ درخواست کرتے لیکن ماسٹر صاحب نہایت مشکل سے اور بڑی خوشامدوں کے بعد ٹیوشن پڑھانے کے لیے تیار ہوتے والد صاحب نے ان کو کسی محکمہ میں سپروائزر کی جگہ بھی دلا دی تھی۔ یوں ان کی بڑی آسائش کے ساتھ زندگی بسر ہونے لگی تھی۔ پہلے ماسٹر صاحب کا حال یہ تھا کہ ان کے پاس صرف ایک شیروانی اور ایک قمیص تھی جب شیروانی پہنتے تو قمیص نہ ہوتی اور قمیص ہوتی تو شیروانی ندارد رہتی۔ خدا تعالیٰ نے ان کی تنگ دستی کو دور کیا۔ سچ ہے کہ خدا جب دیتا ہے تو بے حساب دیتا ہے۔

مولوی صاحب میری گستاخیوں سے کسی قدر ناراض بھی ہو جاتے تھے چنانچہ میری بابت اکثر فرماتے تھے کہ یہ پکا دیندار ہے۔ بڑے بھائی سے خوش تھے اور ان کی بابت کہتے کہ یہ دیندار ہوگا استاد کی دعا شاید اللہ تعالیٰ نے قبول کر لی تھی۔ میرے بڑے بھائی کو دین و دنیا دونوں کی دولتوں سے سرفراز کیا۔ میرا حال یہ ہے کہ ہر وقت خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اے پروردگار تو مجھے صحیح معنوں میں مردِ مومن بنا دے آمین۔

اب 1943 میں والد صاحب اعظم گڑھ سے بستی تبدیل ہو کر گئے۔ ہمارا نام بھی شبلی کالج سے کٹوایا گیا۔ جب ٹرانسفر سرٹیفکٹ لینے کے لیے ہمارے ماسٹر صاحب تشریف لے گئے تو پرنسپل بشیر صاحب نے فرمایا کہ یہ

جس رات کی صبح کو ہمارا ہائی اسکول کا نتیجہ معلوم ہونا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں فیل ہوگیا۔ اس واقعہ نے ذہن کو نہایت پریشان کردیا۔ والد صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر فیل ہوگئے تو گھر سے نکال دیے جاؤ گے۔ اب میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ کہاں جاؤں؟ ماموں جان کی یاد آئی مگر بستی سے بلند شہر کا سفر بھی آسان نہ تھا اسی الجھن میں اٹھا سویرا ہوچکا تھا۔ والد صاحب فجر کی نماز کے بعد گھر واپس آچکے تھے۔ میں چپکے سے باہر کرسی نکال کر بیٹھ گیا۔ اپنے مستقبل کی بابت سوچ رہا تھا کہ ہمارا ایک ساتھی افتخار احمد آیا۔ مجھ سے کہا کہ بھئی تم تو فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگئے۔ میں نے کہا کہ جاؤ تم اپنا کام کرو مجھے کیوں چڑھاتے ہو میں تو فیل ہوگیا ہوں۔

لڑکے ہمارے کالج کا نام کرتے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے پرنسپل صاحب نے یہ بات کیوں کہی۔

1946 کے وسط میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد خاں صاحب بستی، تشریف لے گئے۔ موصوف علی گڑھ میں ایک میڈیکل کالج قائم کرنا چاہتے تھے اور سارے ملک سے ایسے ذہین طلبا کا انتخاب کرنا چاہتے جو اس کالج میں داخلہ لیں۔ بستی میں ڈاکٹر صاحب کے سامنے میرا نام بھی آیا چنانچہ انھیں کی ایما سے والد صاحب نے مجھے نویں جماعت میں سائنس میں داخلہ دلایا۔ افسوس کہ 1948 میں جب میں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا موصوف کا انتقال ہوگیا۔

گورنمنٹ ہائی اسکول بستی میں فارسی کے استاد مولوی نذیر احمد صاحب تھے (شعبۂ فارسی کے سابق پروفیسر اور چیئرمین اے ایم یو علی گڑھ) تھے۔ وہ نمازی آدمی تھے۔ والد صاحب سے ان کی دوستی ہوگئی۔ آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا اور والد صاحب نے خصوصیت سے مجھ کو ان کی سرپرستی اور نگرانی میں دے دیا۔ استاد نے واقعی خلوص سے تعلیم دی۔

ایک دن میں ڈبیٹ کے لیے تقریر لکھوانے مولوی صاحب کے گھر گیا۔ انھوں نے کہا کہ ''ساری زندگی میں ہی لکھ کر دوں گا جاؤ خود لکھو۔'' مایوس ہوکر میں چلا تو پھر بلایا متعلق موضوع کے بارے میں خود تقریر کی اور کہا کہ بس یہ کافی ہے۔ اس وقت میں آٹھویں جماعت میں تھا۔ واپس آگیا اور پھر کسی سے نثر و نظم کی کبھی فرمائش نہیں کی۔

جن دنوں میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ سائنس کے کلاس میں مینڈک کے Urinogenetal System کی تدریس کا موقع آیا تو ہمارے سائنس ٹیچر نے میری طرف دیکھ کر فرمایا کہ کلاس میں کچھ چھٹنکی لوگ بھی ہیں اس لیے اس باب کو تم لوگ گھر پر پڑھ لینا۔

میں کلاس میں سب سے چھوٹا تھا چنانچہ کھیل کے معاملے میں خاصا محروم رہا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول بستی میں شام کو کھیلنا ہر طالب علم کے لیے لازم قرار دیا گیا۔ مجبوراً مجھے بھی شریک ہونا پڑا۔ ہاکی کے میدان میں دوڑ دھوپ میرے لیے ممکن نہ تھی اس لیے عموماً ایک طرف کو کھڑا ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ گول پوسٹ میں کھڑا ہوگیا کہ یہاں تو گیند لازماً آئے گی۔ میرا ایک کلاس فیلو جو اسکول کی فرسٹ الیون کا کپتان بھی تھا بڑھتا ہوا آیا اور قریب آکر ایک ہٹ ماری میں نے ہاکی پر اسے روکنا چاہا گیند ہاکی سے ٹکرا کر اچھلی میرے گھٹنے سے لگی اور میں چاروں

شانے چت..... بیچارہ نہایت نادم ہوا دوڑ کر اس نے مجھے گود میں اٹھالیا۔ دیر تک مالش کرتا رہا۔

جس رات کی صبح کو ہمارا ہائی اسکول کا نتیجہ معلوم ہونا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں فیل ہوگیا۔ اس واقعہ نے ذہن کو نہایت پریشان کردیا۔ والد صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر فیل ہوگئے تو گھر سے نکال دیے جاؤ گے۔ اب میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ کہاں جاؤں؟ ماموں جان کی یاد آئی مگر بستی سے بلند شہر کا سفر بھی آسان نہ تھا اسی الجھن میں اٹھا سویرا ہو چکا تھا۔ والد صاحب فجر کی نماز کے بعد گھر واپس آچکے تھے۔ میں چپکے سے باہر کرسی نکال کر بیٹھ گیا۔ اپنے مستقبل کی بابت سوچ رہا تھا کہ ہمارا ایک ساتھی افتخار احمد آیا۔ مجھ سے کہا کہ بھئی تم تو فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوگئے۔ میں نے کہا کہ جاؤ تم اپنا کام کرو مجھے کیوں چڑھاتے ہو میں تو فیل ہوگیا ہوں۔ اسے حیرت ہوئی مجھے زبردستی ایک صاحب کے یہاں لے گیا اور اخبار میں میرا نام دکھایا۔ میں نے کہا کہ یہ تم لوگوں کا جعل ہے ... اب میرے ذہن میں شبہ پیدا ہوگیا۔ امید وبیم کی حالت میں گھر واپس آیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ اندر سے والد صاحب کی آواز آئی۔ مجھے بلا رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے اندر گیا۔ ابا جان کے قریب ہی امی جان بیٹھی تھیں۔ دونوں نہایت خوش تھے۔ ابا جان کے سامنے کاٹھ کا صندوق رکھا تھا جس میں وہ اپنے روپے رکھا کرتے تھے۔ اس منظر نے میری آنکھیں کھول دیں۔ بڑے بھائی بھی آگئے۔ ابا جان نے مجھ کو ایک روپیہ کا نوٹ اور بڑے بھائی کو پانچ روپیہ کا نوٹ دینا چاہا۔ میں نے جھپٹ کر پانچ روپے کا نوٹ چھین لیا۔ ان کو دوسرا نوٹ دے دیا گیا۔ میں نے اس انعام سے فاؤنٹن پین خریدا۔ یہ پہلا فاؤنٹن پین تھا جو میرے ہاتھ میں آیا۔

اس سال 10 دسمبر 1948 بروز جمعہ امی جان صدیقہ خاتون نے داغ مفارقت دے دیا۔ ہم کو والد صاحب نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ داخلہ کرانے ماموں جان آئے۔ آفتاب ہال کے ممتاز ہوسٹل میں ہم چار سال رہے۔ 1954 میں میں نے Geology, Botany اور Geography سے B.Sc سیکنڈ ڈویژن سے پاس کی اور یونیورسٹی کو الوداع کیا۔

دولت علم لے کے آؤں گا
نئے سرے سے تجھے سجاؤں گا
تیری دیواروں پر سکوت ہے کیوں
میں انھیں آئینہ بناؤں گا

(نظر خورجوی)

ایک مرتبہ میں عید کی نماز کے لیے جامع مسجد (سرسید ہال) میں گیا۔ میری شیروانی کے نیچے کے صرف تین بٹن بند تھے۔ نماز سے فارغ ہوکر چلا تو اتفاق سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (وائس چانسلر) کے سامنے آگیا۔ سلام کیا حضرت موصوف نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ جواب دیا۔ شیروانی کے سب بٹن جھک کر بک تک بند کیے اور پھر عید ملے۔ میرا یہ حال کہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اب قدم آگے نہ بڑھتے تھے۔ بہرحال اس دن سے پھر میری ہمت نہ ہوئی کہ کبھی شیروانی کے بٹن کھلے رکھوں۔

میں نے 1950 سے قرآن پاک کی تفسیر میں کچھ واقعات کا بیان پڑھ کر چھوٹے چھوٹے قصے لکھنے شروع کیے جو پندرہ روزہ 'الحسنات' رامپور میں چھپنے لگے۔ پہلا مضمون 'امتحان' کے عنوان سے الحسنات میں چھپا۔ اس طرح ہندوستان اور پاکستان کے متعدد رسالوں میں مضامین چھپواتا رہا۔ ہر ہفتہ میں تین چار رسالے آتے تھے۔ اب تو سب رسالوں کے نام بھی یاد نہیں۔ 1953 میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فتح پور، تشریف لائے۔ ابا جان وہاں ٹریزری افسر تھے۔ ان کے سبب مجھے بھی حاضری کا موقع ملا۔ انھیں دنوں ایک عیسائی پادری سے میرا مباحثہ کانپور کے ایک ہفتہ وار اخبار 'غریب' میں چھپا تھا۔ جس کا عنوان تھا ''بی اے کے طالب علم کا عیسائی پادری سے مباحثہ مشمولہ'' (تین قسطیں)۔ میں نے سید صاحب کو وہ دکھایا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے فرمایا کہ ''جب تمھاری عمروں میں میں تھا تو میں بھی یہی کرتا تھا۔ خیر تم خطبہ مدراس کا مطالعہ کرو۔'' ایک جلد خود عنایت کی اور بہت دعائیں دیں۔ والد صاحب جب خوش ہوتے تو کہا کرتے تھے کہ ''اس لڑکے کو سید صاحب کی دعا ہے۔''

1953 میں فتح پور کے مسلم ہائی اسکول میں اعزازی طور پر کئی ماہ تک سائنس پڑھائی۔ پھر 1954 میں مرزا پور میں بابولال جین انٹر کالج میں عارضی طور پر اردو پڑھانے پر مامور ہوا۔ یہیں پر رسالہ 'نگار' میں (نیاز فتح پوری کے رسالے میں) ذوق کے متعلق پہلا مضمون چھپا۔

1955 میں قاضی عبدالودود صاحب سے ملاقات ہوئی انھوں نے مجھے اپنا شاگرد مان لیا اور میری تحریروں کی بڑی محنت سے اصلاح کی۔ قاضی صاحب نے املا کے اصول بھی مجھے سکھائے۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب سے میں نے پوچھا کہ اردو کس طرح لکھیں تو موصوف نے جواب دیا کہ ''لکھتے رہو لکھنا آجائے گا۔'' میرے نزدیک اس سے بہتر ہدایت طالب علم کے لیے نہیں ہوسکتی۔

1956 میں ڈائرکٹریٹ آف انڈسٹریز محکمۂ صنعت، یوپی میں جونیئر انسپکٹر آف اکاؤنٹس کی حیثیت سے ملازم ہوگیا وہاں کل آٹھ برس ملازمت کی۔ اسی درمیان گورکھپور سے 1963 کو اردو میں ایم اے فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا اور عنوان مقالہ برائے ایم۔ اے ''غزلیات ذوق ردیف الف سے تدوین مع مقدمہ'' لکھا۔

اس کے بعد اردو میں Ph.D کے لیے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ''میری اوسط رشک حیات اور علمی خدمات' عنوان کے نام سے کام کیا۔

اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور خداوندانِ اردو کے احسان کے بغیر صدیق نیشنل انٹر کالج پہلی بھیت میں مجھے جولائی 1965 میں اردو کی لیکچررشپ مل گئی۔

پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی اور یکم جولائی 1967 میں ریسرچ فیلو کی حیثیت سے میں علی گڑھ آگیا۔

28 جولائی 1968 میں لکچرر ہوگیا۔ اس کے بعد یکم جنوری 1983 میں ریڈر پھر 4 جون 1993 میں پروفیسر شپ مل گئی۔ اس طرح زندگی چلتی رہی ایک دن وہ بھی آگیا کہ میں 31 جنوری 1996 میں ریٹائر ہوگیا۔

یکے بعد دیگرے آٹھ بیٹیاں اور دو بیٹے مجھ کو خدا تعالیٰ نے عنایت کیے اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ سب خوش و خرم اپنے اپنے گھر پر ہیں اور دونوں بیٹے بھی برسر روزگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مجھ کو دو حج بھی کرائے ایک حج 2001 اور دوسرا حج (حج اکبر) 2007 میں کیا۔

بڑے افسوس کے ساتھ ان کے انتقال کا حال میں ابصار احمد (بڑا بیٹا) بیان کرتا ہوں۔ اچانک 15 اکتوبر کو ان کی آواز بند ہوگئی۔ سانس لینا مشکل ہوگیا۔ کھانا بھی گلے سے اترنا بند ہوگیا تو ہم ان کو مغرب کے وقت میڈیکل کالج لے گئے۔ ایمرجنسی میں داخل کرلیا۔ رات 1 بجے CCU بھیج دیا پھر صبح 5 بجے یونیورسٹی ایمپلائز روم وارڈ نمبر 11 کے لیے روانہ کردیا۔ دو دن کے بعد ICU بھیجا گیا۔ مگر حالات صحیح ہوتے نہیں دکھائی دیے۔ آخرکار 21 اکتوبر 2017 کو رات 9:30 بجے ان کی پاک روح پرواز کرگئی اور اپنے خالق حقیقی سے جاملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس وقت ان کی بڑی بہو ریحانہ نے یٰسین شریف پڑھی اور میں نے مختلف دعائیں پڑھ کر دم کیں۔ ان کا منہ اور آنکھیں بند کردیں اور ان کو الوداع کیا۔ دوسرے دن 22 اکتوبر کو صبح 11 بجے یونیورسٹی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ ان کے دامادوں نے غسل دیا اور نماز جنازہ سرسید نگر کی مکی مسجد کے امام حافظ محمد سالم صاحب نے پڑھائی۔ جنازے میں یونیورسٹی کے بڑی تعداد میں اساتذہ کرام، عزیز و اقارب اور ان کے بھائی افتخار صاحب موجود تھے۔

■

M.Absar Ahmad
4/1172, Baitul Absar
Sir Syed Nagar, Sir Syed Road
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:9927087940

بدنام نظر

اعترافات کا شاعر
جمیل ظہیر

اردو کی بدقسمتی ہے کہ اس کے کئی مایہ نازادیب وشاعر خاموشی کے ساتھ اپنی تخلیق کرتے ہیں اور پھر خاموشی کے ساتھ چلے جاتے ہیں۔ چونکہ ان کے پاس ڈھول نہیں ہوتا جسے پیٹ پیٹ کر اپنے ہونے کا اعلان کرسکیں، نا ہی انھیں اپنے نام کے غبارے فضا میں اڑانے کافن آتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک نام جمیل ظہیر کا ہے جنھوں نے کم ازکم ساٹھ سال تک شاعری کی مگر بہت کم لوگ ان کا نام جانتے ہیں اور جو جانتے ہیں انھوں نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ ان کی شاعری کو سمجھا جائے اور برا یا بھلا اس کے مقام کا تعین کیا جائے۔ شاید ایسا کر کے کچھ لوگوں کو اپنا قد چھوٹا نظر آنے لگتا ہو۔ میں کبھی کبھی ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ شاعری سے متعلق باتیں ہوتی تھیں۔ کلاسیکیت، ترقی پسندی، جدیدیت۔ الغرض وہ تمام رجحانات یا تحریک زیر بحث آتے، جن سے اردو شاعری کا رشتہ ہے۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انھوں نے اپنی کوئی غزل سنائی ہو یا مجھ سے سنانے کی فرمائش کی ہو، بس چائے پر معاملہ ختم ہوجاتا تھا۔ ابھی غالباً دو ماہ پہلے انھوں نے مجھے اپنا مجموعہ کلام 'اعتراف' عنایت کیا۔ میں اپنے گاؤں چلا آیا اوران کے مجموعے کا مطالعہ کرنے لگا۔ قبل اس کے کہ میں اپنے تاثرات سے انھیں آگاہ کرتا وہ ہم سے اتنی دور چلے گئے کہ اب ملنے کے لیے روز قیامت کا انتظار کرنا پڑے گا۔

J.A Cuddan کی ڈکشنری کا حوالہ دیتے ہوئے جمیل ظہیر نے اپنی شاعری کو شاعر کا اعتراف سمجھا ہے اور شاید اسی لیے انھوں نے اپنے مجموعہ کلام کا عنوان 'اعتراف' دیا ہے۔ لیکن کیا یہ اعتراف کسی Confession Room یا Box کا اعتراف ہے، جہاں ایک فرد خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنے تمام گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے خدا سے معافی کا طلبگار ہوتا ہے؟ نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے، بلکہ شاعر نے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار بڑی صدق دلی کے ساتھ شعری لوازمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا ہے:

کبھی کرے گا کوئی بازگشت کو محسوس
لبِ خموش کی فریاد بے صدا ہوں میں
دوستوں کے فریب خوردہ کو
لطف دیتی ہے ناشناسائی
وہی جدائی غم و حزن اور تنہائی
یہ سوچتا ہوں ملا کیا کسی کے ملنے سے
ملحوظ ہم نے جن کی خوشی کو رکھا جمیل
مجھ سے انھیں کو کوئی نہ کوئی گلہ رہا

درج بالا تمام اشعار اعتراف ذات کا نمونہ ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ ان کی شاعری صرف اپنی ذات کا طواف کرتی ہے۔ زندگی کے مختلف مسائل پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ بھی نظر آتا ہے۔ ترقی پسندی کی گھن گرج بھی ہے۔ جدیدیت کا کرب بھی ان میں بہ آسانی تلاش کیا جاسکتا ہے، بلکہ اگر ان کی غزلوں کے ساتھ تاریخ تخلیق بھی ہوتی توان کی شاعری کو مختلف

زندگی کے مختلف مسائل پربھی جمیل ظہیر کی گہری نظر ہے۔ ان کی غزلوں میں کلاسیکی رچاؤ بھی نظر آتا ہے۔ ترقی پسندی کی گھن گرج بھی ہے۔ جدیدیت کا کرب بھی ان میں بہ آسانی تلاش کیاجاسکتاہے۔ بلکہ اگران کی غزلوں کے ساتھ تاریخ تخلیق بھی ہوتی توان کی شاعری کومختلف ادوارمیں تقسیم کیاجاسکتاتھا۔

ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا تھا:

تمہارے جور کی لذت سے آشنا ہوں میں
جو کیف دے نہ سکے تم وہ پا گیا ہوں میں

بظاہر یہ شعر بڑا روایتی سا لگتا ہے لیکن اس کے اندر جو Sadism اور Masochism کی نفسیات چھپی ہوئی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے شاعر نے ان نفسیاتی گرہوں کا مطالعہ نہ کیا ہو لیکن شعر اس بات کا غماز ہے کہ شاعر دوران تخلیق اس نفسیات کی راہ سے ہو کر گزرا ہے:

گلوں نے بہائے ہیں آنسو خوشی کے
یہ گلشن کے پتوں پہ شبنم نہیں ہے

جو وقت لگتا ہے غنچہ کو پھول بننے تک
گراں گزرتی ہے مدت وہی کلی کے لیے

بس اتنی دیر تبسم بہ لب کلی ٹھہری
قبائے گل میں جو کچھ دیر تازگی ٹھہری

گلوں پہ قطرۂ شبنم بھی بار ہو جیسے
ترے سکوتِ لبِ ناز پر کلام نہیں

درج بالا تمام اشعار روایتی انداز کے ہیں۔ الفاظ روایتی، اسلوب روایتی اور بظاہر مفہوم بھی روایتی لیکن غور کیجیے تو اس بات کا پتہ تو یقیناً چلتا ہے کہ جمیل ظہیر صاحب کی نظر کلاسیکی ادب خاص طور پر شعری روایتوں پر گہری رہی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں جنھیں اپنی تہذیب وروایات کا قطعی علم نہیں، درمیان میں کہیں بھیڑ دیکھ کر گھس گئے اور دوڑ میں شامل ہو گئے۔ ایسے بہت سے لوگ ترقی پسندی نیز جدیدیت دونوں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ جمیل ظہیر نے کلاسیکی انداز میں بھی جو نئے نئے نکتے نکالے ہیں وہ سب کے بس کا کام نہیں اتنی خوبصورتی کے ساتھ انھوں نے شبنم کو خوشی کے آنسو، غنچہ سے پھول بننے کی مدت کو کلی کے لیے گراں گزرنا، گلوں پہ قطرۂ شبنم کا بار ہونا، نظم کیا ہے کہ اشعار کی معنویت کے کئی دروازے کھل جاتے ہیں۔ زندگی کے کئی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس مسرت وغم کا اشاراتی بیان میرے خیال میں انھیں کا حصہ ہے۔

جیسا کہ میں نے شروع کی دو سطروں میں لکھا ہے کہ ان کی شاعری کم از کم ساٹھ سال کے عرصے کا احاطہ کرتی ہے۔ اس عرصے میں انھوں نے ترقی پسندی کا عروج وزوال بھی دیکھا۔ اس سے متاثر بھی ہوئے اور اپنے تاثر کا شعری اظہار بھی کیا، لیکن ان کی شاعری ''مارے ساتھی جانے نہ پائے'' یا ''مفلسی کو ووٹ دو اور بے زری کو ووٹ دو'' جیسی نعرہ بازی نہیں ہے بلکہ شعور کی آنچ میں دھیرے دھیرے گرم ہونے والا وہ جذبہ ہے جو شاعر کے ساتھ ساتھ قاری کو بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور پھر وہ اپنے اندر ایک ایسی تبدیلی پاتا ہے جو شاعر اور قاری کو ایک نقطے پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

حوصلہ چاہیے پھولوں کو بھی کھلنے کے لیے
اس کا امکاں تو بیاباں سے گلستاں تک ہے

کبھی انسان کی اک جست میں طے
حدودِ عرصۂ دوراں ہوئے ہیں

اٹھا لیا ہے اگر بار زندگی میں نے
تو زندگی میں بڑھا دی ہے دلکشی میں نے

متزلزل نہیں ہوتے رہِ دشوار میں بھی
حوصلے دل کے مگر تابہ قدم کام آئے

اسی طرح جدیدیت کے رجحان سے بھی وہ بے خبر نہیں رہے۔ اپنی ذات کے کرب اور ذات میں چھپا سماج اور ماحول کا درد اقدار کی شکست وریخت، خواب اور پھر خوابوں کی عبرتناک تعبیریں۔ امید و یاس۔ ان سبھی باتوں کا فنکارانہ اظہار جمیل ظہیر کی شاعری میں آسانی کے ساتھ تلاش کیا جا سکتا ہے مثلاً:

طلوعِ مہرِ درخشاں سے لو لگائے ہم
چراغِ شام تھے، بہر سراغ جلتے رہے

وقت کے بندلوں سے جو ادا ہو نہ سکے
اہلِ فن کرتے ہیں واضح وہی مبہم کلمات

چھوڑ آیا ہوں جس کو میں سرِ راہِ حقیقت
خوابوں کے ہر اک موڑ پہ ملتا ہوں اسی سے

میری تقدیر کی یکسانیت غم کے سوا
اس بدلتے ہوئے ہنگام کے در پردہ ہے کیا؟

ان تمام اشعار میں جدید حسیت کی کارفرمائی ہے لیکن یہ ان معنوں میں جدید نہیں کہ شاعری کو چیستاں بنا کر رکھ دیا جائے۔ دراصل اس کا سبب کلاسیکیت اور روایت سے ان کی کما حقہٗ واقفیت ہے۔

ان کے علاوہ کئی اشعار تو ایسے بھی ہیں جو بالکل اچھوتے انداز کے ہیں اور قاری کے دل و دماغ کو ایک ایسی کیفیت سے سرشار کرتے ہیں کہ پہروں ان اشعار میں ڈوبے رہنے کو جی چاہتا ہے:

گذرگاہ تمنا دل ہے، اب بھی
پرائے گھر میں جالے بن رہا ہوں

جدیدیت کے رجحان سے بھی وہ بے خبر نہیں رہے۔ اپنی ذات کے کرب اورذات میں چھپا سماج اور ماحول کادرد اقدار کی شکست وریخت، خواب اور پھر خوابوں کی عبرتناک تعبیریں۔ امیدویاس۔ان سبھی باتوں کافنکارانہ اظہار جمیل ظہیرکی شاعری میں آسانی کے ساتھ تلاش کیاجاسکتاہے۔

جو قطرہ دیدۂ نم کے لیے ہے
چراغ اک خانۂ غم کے لیے ہے

ایک عمر لگ گئی اے جمیل اسے یہاں
خارزارِ زیست میں دو قدم جو چل گیا

اسی سے اہلِ وطن اجنبی سمجھتے ہیں
کہ ہم سمجھتے ہیں سارے جہاں کو گھر کی طرح

افسوس کہ ایسے اچھوتے اشعار کہنے والے شاعر کی ہم اس کی زندگی میں قدر نہ کر سکے اور وہ ناراض ہو کر 12 جنوری 2018 بروز جمعہ عالمِ بالا کی طرف چلا گیا۔

■

Badnam Nazar
Kunda, Sheikhpura-811105 (Bihar)
Mob: 9661147635

اکیسویں صدی میں منٹو شناسی

مشتاق عالم قادری

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو میں منٹو شناسی تحقیق وتنقید کا ایک مستقل اور مستند موضوع بن چکا ہے۔ منٹو شناسی کا عمل یوں تو ان کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ وقار عظیم، ابواللیث صدیقی اور ممتاز شیریں نے 1955 میں منٹو کے انتقال سے قبل ہی منٹو کے افسانوں کا جائزہ پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن منٹو شناسی کا باضابطہ آغاز ان کے انتقال کے بعد ہی صحیح معنوں میں شروع ہوتا ہے۔ ممتاز شیریں، اوپندر ناتھ اشک اور محمد اسداللہ سے لے کر پروفیسر شمس الحق عثمانی، پروفیسر ارتضیٰ کریم، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر برج پریمی اور ڈاکٹر خالد اشرف تک نے منٹو شناسی کے حوالے سے یادگار مقالات لکھے اور کتابیں تحریر کیں۔ اکیسویں صدی کے اوائل سے اب تک منٹو شناسی کے حوالے سے کئی کتابیں، رسائل کے خصوصی نمبر شائع ہو چکے ہیں اور ہنوز یہ سلسلہ جاری وساری ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منٹو کی افسانہ نگاری کی معنویت کا شجر عہد حاضر میں بھی تروتازہ ہے۔

ادب میں تخلیقی اظہار کئی اعتبار سے مافی الضمیر کے آزادانہ اظہار سے عبارت ہے لیکن ادبی تنقید ایک ایسا ذمے دارانہ عمل ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نقاد کو فن اور فن کار کے علاوہ فن کی روایات، امکانات اور فن کار کے عہد، حالات اور مضمرات کے علاوہ عصری ادبی تقاضوں اور آئندہ کے تخلیقی دور کی تعمیر وغیرہ بہت ساری باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس زاویے سے اگر اردو میں منٹو شناسی کے حوالے سے گفتگو کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اردو تنقید اپنا فریضہ ادا کرنے سے قاصر رہی ہے۔ منٹو خواہ اس کی شخصیت ہو یا فن ابتدا سے اردو تنقید کے لیے ایک مسئلہ رہا ہے۔ منٹو نے شخصی طور پر معاشرے کی پُرفریب اخلاقی قدروں اور باحیثیت ادیب، فکشن کے فنی، فکری اور جمالیاتی نظام کو اس طرح زیروزبر کیا ہے کہ اردو تنقید ایک عرصے تک منٹو کے کل (Totality) میں اس حد تک اترنے کی کوشش نہیں کر سکی جس حد تک آج منٹو کی شخصیت اور فن کی گہرائیوں، گوشوں اور زاویوں کو کریدنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ منٹو نے اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے خود اپنے اخلاقی نظام کی تشکیل کی اور افسانوں کی شعریات بھی اس کی اپنی ایجاد کردہ ہے۔ اس دور میں ہر دو پہلو سے اردو ادبی تنقید کے لیے منٹو کو مقبولیت کا شرف بخشنا آسان نہیں تھا اس کے کئی اسباب ہیں۔ ایک بڑا سبب تو یہ ہے کہ برصغیر کی نیوکولونیل (Neo Colonial) معاشرت اور سیاست کی طرح ادب میں بھی جو طبقہ واریت، مفاد پرستی اور گروہ بندی ہے وہ منٹو جیسے خاک نشیں اور سچے کھرے اور کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دینے والے ادیب کو کہاں برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اردو تنقید خصوصاً عصری فکشن کی تنقید ایک عرصے تک پریم چند، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی تک ہی محدود رہی اور اگر کسی نے فراخ دلی سے کام لیا تو عصمت چغتائی، خواجہ غلام عباس اور احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ساتھ منٹو کے نام کی روشنائی بھی چھڑکا دی۔

منٹو کے انتقال کے بعد منٹو کے تین دوستوں نے اپنی اپنی کتابیں 1955 میں شائع کروائیں۔ پہلی کتاب منٹو کے قریب ترین دوست ابوسعید قریشی کی 'منٹو' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ابوسعید قریشی باری علیگ کے تین عزیز ترین شاگردوں میں سے ایک تھے بقیہ دو شاگرد تھے حسن عباس اور سعادت حسن منٹو، باری علیگ کے ان تین شاگردوں کے گروپ کو فری تھنکرس (Free Thinkers) کہا جاتا تھا۔ باری علیگ اپنے شاگردوں کے ساتھ منٹو کے کمرے میں انقلاب کے موضوع پر مولانا عبدالماجد دریابادی اور حسن عسکری کی اکا دکا تحریروں سے قطع نظر سچ تو یہ ہے کہ منٹو جب تک زندہ رہے نت نئے عنوان سے اردو تنقید کا عتاب ہی سہتے رہے۔ غریب الوطنی، اجنبیت، مقدموں اور فتووں کے علاوہ مالی پریشانیاں ایسی کہ صابر وشاکر خوددار اور خوش مزاج منٹو کو پاگل خانہ جانا پڑا لیکن آخرکار جب صبر کا دامن چھوٹا تو منٹو رو پڑے۔ اپنے افسانوی مجموعہ 'یزید' کے دیباچے میں منٹو دکھ اور درد کے تھپیڑے کھاتے اس طرح بے دست وپا نظر آتے ہیں۔

''میری موجودہ زندگی مصائب سے پُر ہے۔ دن رات مشقت کرنے کے بعد اتنا کماتا ہوں جو میری روز مرہ ضروریات کو پورا کر سکے۔ یہ تکلیف دہ احساس ہر وقت مجھے دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ہے کہ آج میں نے اگر آنکھیں میچ لیں تو میری بیوی بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ میں فحش نویس، دہشت پسند، سنکی، لطیفہ باز اور رجعت پسند سہی لیکن ایک بیوی کا خاوند اور تین لڑکیوں کا باپ بھی ہوں۔'' ('یزید' ص: 205)

مذکورہ بالا اقتباس زبان حال سے صاف بیان کر رہا ہے کہ خدا کی بستی میں منٹو شخص اور فن کار کی کیسی ناقدری کی گئی۔ منٹو کے انتقال سے قبل منٹو پر غالباً عبدالماجد دریابادی، حسن عسکری اور کرشن چندر کے چند ایک تاثراتی مضامین ضرور لکھے گئے لیکن منٹو کے فن سے متعلق تنقیدی تحریریں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ منٹو کی موت کے بعد منٹو کے دوست سعید قریشی کی تحریر 'منٹو' 1955 میں شائع ہوئی۔ 1955 میں ہی محمد اسداللہ کی کتاب منٹو میموریل کراچی سے شائع ہوئی لیکن یہ دونوں تحریریں دوستانہ اور

عقیدت مندانہ تھیں۔ تاثرات سچے تھے لیکن ان میں تنقید برائے نام تھی۔ اوپندر ناتھ اشک کی کتاب "منٹو میرا دشمن دوست" شائع ہوئی لیکن اس کتاب میں منٹو کے لیے چند ایک تعریفی جملے تو ہیں۔ منٹو کے افسانوں مثلاً بو، ہتک اور بلاوز وغیرہ کی تکنیک کے بارے میں کسی حد تک تنقیدی خیالات بھی ملتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اوپندر ناتھ اشک نے اپنی اس تصنیف میں اپنے آپ کو منٹو سے بڑا افسانہ نگار منوانے کی ہی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو تنقید میں منٹو شناسی کا باضابطہ آغاز ماہنامہ نقوش لاہور کے منٹو نمبر سے ہوتا ہے۔ نقوش میں شامل احمد ندیم قاسمی، وقار عظیم، ابواللیث صدیقی کے مضامین میں پہلی بار منٹو کے فن کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی۔ لیکن بحیثیت مجموعی منٹو شناسی کی باوقار شروعات ممتاز شیریں سے ہوتی ہے۔ ممتاز شیریں آندھرا پردیش کے قصبہ ہندوپور میں پیدا ہوئیں اور انتقال اسلام آباد پاکستان میں ہوا۔ منٹو پر ممتاز شیریں کی کتاب "منٹو نوری نہ ناری" یوں تو آصف فرخی نے ترتیب دے کر اس کو مکتبۂ اسلوب کراچی سے شائع کیا لیکن منٹو سے متعلق ممتاز شیریں کے بعض مضامین منٹو کی حیات میں ہی سویرا، نقوش اور ادب لطیف وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔ ممتاز شیریں نے منٹو کے انتقال سے قبل ہی منٹو کے افسانوں میں تصور انسان کے حوالے سے "نوری نہ ناری" کے نام سے ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے دو باب مقالوں کی صورت میں سویرا میں بھی شائع ہوئے تو اور لوگوں کے علاوہ منٹو نے بھی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ان مقالوں کے عنوانات تھے اول 'معاشیت، معصومیت' اور دوئم 'ترغیب گناہ'۔ ممتاز شیریں سے منٹو کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی لیکن ممتاز شیریں کے شوہر منٹو کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ آصف فرخی کے مطابق منٹو نے صمد شاہین کے توسط سے ممتاز شیریں کو اپنی کتاب بھیجی تھی اور اس پر یہ جملہ لکھا تھا "ممتاز شیریں کے نام جو مجھ پر کتاب لکھ رہی ہیں۔" ممتاز شیریں نے منٹو پر کتاب لکھنے کا منصوبہ کیوں بنایا اس کی وضاحت ممتاز شیریں نے منٹو کے انتقال سے کچھ عرصہ بعد انٹرویو میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"منٹو ایک سچا اور بے باک فن کار تھا۔ ایک آگ تھی جس میں وہ مسلسل تپتا رہتا تھا۔ منٹو کے افسانوں میں بلا کی جان ہے اور ان کا تاثر ہر سطح کے پڑھنے والے قبول کرتے ہیں۔ یوں تو میں نے بہت سے افسانہ نگاروں کا اپنے مضامین میں جائزہ لیا ہے لیکن منٹو کو ایک کتاب کا موضوع اس لیے بنایا ہے کہ میری نظر میں منٹو آج بھی ہمارا نمائندہ اور بہترین افسانہ نگار ہے۔"

یہ سچ ہے کہ ممتاز شیریں نے فکشن اور فکشن نگاروں کے بارے میں لکھا لیکن ان کے سب سے عمدہ تنقیدی مضامین وہی ہیں جو انھوں نے منٹو پر لکھے ہیں۔ یہ مضامین منٹو شناسی کے علاوہ فکشن کی تنقید کا معیار و وقار ہیں۔ خود ممتاز شیریں کو بھی اس بات کا احساس تھا کیوں کہ منٹو پر ان کے تنقیدی مضامین روایتی، تدریسی اور تاثراتی نہیں علمی اور تخلیقی ہیں۔ ان مضامین میں ممتاز شیریں نے فکشن، سماجیات، نفسیات اور ثقافت سے متعلق اپنے وسیع مطالعے اور مشاہدے اور مشرقی اور مغربی روایات و اجتہادات کی آگہی اور غیر جانبدانہ تجزیاتی شعور سے کام لیا ہے۔ خود ممتاز شیریں کو بھی منٹو پر اپنے مضامین پر اطمینان بھی تھا اور فخر بھی۔ ممتاز شیریں نے مذکورہ انٹرویو میں خود کہا ہے "عملی اور تخلیقی تنقید کے سب سے اچھے نمونے منٹو پر میرے متفرق مضامین ہیں۔ ان میں میں نے اپنے مخصوص تاثراتی انداز نقد سے ہٹ کر نفسیاتی زاویہ سے جائزے لیے ہیں۔"

منٹو کے افسانے جنسی نفسیات کے مطالعے کے لیے بہت اچھا مواد فراہم کرتے ہیں۔ چونکہ منٹو تنقید کی پہلی سیدھی اینٹ ممتاز شیریں نے ہی رکھی تھی۔ اس لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ 'منٹو نوری نہ ناری' صرف ایک عام سی کتاب ہی نہیں بلکہ ایک بہت ہی Chalanging تنقیدی منصوبہ ہے۔ ممتاز شیریں نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں جدید انگریزی ادب کا کورس کرتے ہوئے منٹو کی دریافت کا منصوبہ بنایا تھا۔ جس کا نام 'منٹو نوری نہ ناری' تھا اس منصوبے کا سرمایہ تھا 'انسان کا تصور منٹو کے افسانے میں'۔ یاد رہے کہ ممتاز شیریں نے اپنے منصوبے کا خاکہ عیسائی عقائد اور ماہرین نفسیات کی توضیحات کی روشنی میں ترتیب دیا تھا۔ لیکن اس خاکے کا مسودہ منتشر تھا۔ ممتاز شیریں کی وفات کے بعد ان کے شوہر صمد شاہین اور آصف فرخی نے کافی تگ و دو اور دیدہ ریزی کے بعد اس خاکے کو مرتب کر کے 1985 میں 'منٹو نوری نہ ناری' کے نام سے شائع کیا۔ لیکن اب اس میں ممتاز شیریں کے تنقیدی مضامین کے مجموعے معیار کے دو مضامین منٹو کا تغیر اور ارتقا اور منٹو کی فنی تکمیل بھی شامل اشاعت کر لیے گئے۔ آصف فرخی نے 'نوری نہ ناری' کے ابتدائیہ میں اور مظفر علی سید نے دیباچہ میں اس کی تفصیل پیش کر دی ہے۔ 'منٹو نوری نہ ناری' میں شامل مضامین کے عنوانات اس طرح ہیں:

(1) یہ خاکی اپنی فطرت میں
(2) ترغیب گناہ
(3) کفارہ گناہ
(4) منٹو اور بیدی پر مغربی افسانے کا اثر
(5) منٹو کا تغیر اور ارتقا
(6) ادب میں انسان کا تصور
(7) منٹو کی فنی تکمیل
(8) منٹو ایک اخلاقی فن کار اور ضمیمہ کے طور پر تین مضامین شامل ہیں۔

ممتاز شیریں اپنے مذکورہ بالا مضامین میں منٹو شناسی کے فریضے سے عہدہ برآ ہونے میں کسی حد تک کامیاب ہیں۔ اس کا جائزہ منٹو سے پہلے اور منٹو کے بعد افسانہ کی شرائط اور تقاضوں مثلاً پلاٹ، کہانی، واقعات، کردار، تکنیک اور بیانیہ کے برتاؤ کی تبدیلیوں کو بھی ذہن میں رکھتے ہوئے لینا ہوگا۔ ان تمام اسرار و رموز کی عقدہ کشائی کی کوشش کرنے والوں میں ممتاز شیریں کا نام بے حد اہم ہے۔ لیکن آج کی تاریخ میں جب وارث علوی، ڈاکٹر برج پریمی، پروفیسر سید محمد محسن، ڈاکٹر کیول دھیر، جگدیش چندر ودھا، شکیل الرحمٰن سے لے کر خالد اشرف تک نے منٹو کے جو تنقیدی مطالعات پیش کیے ہیں ان میں سے اکثر ممتاز شیریں کے معیار سے مختلف بھی ہیں، گہرے بھی اور امکانات سے پُر بھی۔ برج پریمی نے 'منٹو کتھا' میں منٹو کی شخصیت اور فن کے کم و بیش تمام پہلوؤں پر بڑی محنت سے روشنی ڈالی ہے۔ منٹو شناسی کے حوالے سے برج پریمی کی تصنیفات 'منٹو حیات اور کارنامے' اور 'منٹو کتھا' بنیادی اہمیت کی حامل تصنیفات ہیں۔ غالباً منٹو پر لکھنے والا ہر شخص برج پریمی سے استفادہ تو کرتا ہے لیکن حوالے نہیں دیتا۔ برج پریمی نے افسانہ کی ڈگر سے ہٹ کر تحقیق و تنقید کی راہ پر اچھا خاصا کام کیا ہے۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے' اردو ادب میں اہمیت کا حامل ہے۔ برج پریمی نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اردو تحقیق و تنقید کے سرمایے میں اضافہ کیا ہے۔

غرض منٹو کے بارے میں ڈاکٹر پریمی نے جس زاویے سے کام کیا ہے ادبی حلقوں میں بے پناہ پذیرائی ہوئی۔ سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے کے بعد پریمی نے اپنی تمام تر توجہات تحقیق و تنقید پر مبذول کیں۔ ان کا یہ مقالہ 1976 میں مکمل ہوا مگر اسے شائع ہونے میں تقریباً دس سال کا عرصہ لگا۔

شکیل الرحمٰن کی تحریر 'منٹو ریجڈی کی جمالیات' منٹو شناسی کے باب میں اضافے کا حکم رکھتی ہے۔ خالد اشرف نے 'فسانے منٹو کے اور پھر بیان اپنا' منٹو کی حیات،

تصانیف، نظریہ اور فنی امتیازات کی نشاندہی کرتے ہوئے منٹو کے تمیں افسانوں کے جو تنقیدی جائزے پیش کیے ہیں وہ یقیناً منٹو شناسی ہی نہیں افسانے کی تنقید میں نئی جہات کا پتہ دیتے ہیں اور ان سب سے الگ وارث علوی کی تصنیف 'منٹو ایک مطالعہ' منٹو تنقید کی سب سے بہترین مثال تو ہے ہی اردو افسانے کی تنقید کے معیار و وقار کی ضمانت بھی ہے۔ وارث علوی نے 'منٹو ایک مطالعہ' کے عنوان سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اگرچہ منٹو پر اب تک متعدد مضامین، کتابیں اور نمبر شائع ہو چکے ہیں لیکن جس طرح وارث علوی نے منٹو کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کو اپنی تصنیف میں اجاگر کیا ہے اس طرح کا کارنامہ اردو کے کسی اور نقاد نے انجام نہیں دیا۔ یقینی طور پر منٹو شناسی کا باضابطہ آغاز مشہور افسانہ نگار اور نقاد ممتاز شیریں سے ہوتا ہے۔ ممتاز شیریں کے علاوہ بھی عبدالماجد دریابادی، حسن عسکری اور اوپندر ناتھ اشک سے لے کر خالد اشرف تک کئی لوگوں نے منٹو پر لکھا ہے۔ وارث علوی نے اپنی کتاب 'منٹو ایک مطالعہ' میں منٹو کی شخصیت اور فن کا جائزہ جن زاویوں سے پیش کیا ہے انھیں منٹو شناسی کے باب میں یقیناً ایک اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں انہوں نے منٹو کے لگ بھگ تمام اہم افسانوں کا جامع تجزیہ پیش کیا ہے۔ وارث علوی ہر افسانے کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اس میں پوشیدہ معانی ومفہوم اور افسانویت کو ڈھونڈ نکالتے ہیں اور نہایت دل جمعی سے خوش گوار زبان میں اپنے تنقیدی نتائج کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کا تا اور لے دوڑی والا معاملہ نہیں ہے اسی لیے منٹو کا کوئی اہم افسانہ ایسا نہیں ہے جس پر انھوں نے ناقدانہ نگاہ نہ ڈالی ہو۔ انھوں نے منٹو پر نہ صرف تنقید کا حق ادا کر دیا ہے بلکہ آنے والے منٹو شناسوں کے لیے منٹو کے مطالعے اور افسانے کی تنقید کے لیے نئے راستے بھی ہموار کیے۔ نئے ناقدین کے لیے وارث علوی کی طرح افسانہ کے موضوع، پلاٹ، کہانی، کردار اور زبان وبیان کی باریکیوں کو ذہن میں رکھ کر کسی افسانہ یا افسانہ نگار کی فنی اور جمالیاتی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لینا بہت مشکل ہے لیکن افسانے کی تنقید بہر حال وارث علوی کے ہی طریق نقد اور دیدہ ریزی کا تقاضا کرتی ہے۔

'منٹو ایک مطالعہ' میں منٹو کی شخصیت کا خاکہ بہت ہی دل نشین ہے۔ منٹو کی زندگی کے بارے میں وارث علوی نے کچھ نہیں لکھا کیونکہ اس پر برج پریمی کی تحقیقی کتاب سامنے آچکی تھی۔ وارث علوی نے منٹو کے ادبی شعور پر لکھ کر اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے منٹو کے مضامین اور زندگی سے تفاصیل لے کر اس کے ادبی شعور کا دلچسپ خاکہ پیش کیا ہے۔ کتاب کے دوسرے باب میں 'حیات اور موت کی کشمکش' کے عنوان کے تحت ابتدا میں ہی منٹو کی افسانہ نگاری کے امتیازات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ منٹو کو عام طور پر سنسنی خیز افسانہ نگار کہا گیا ہے۔ وارث علوی نے اپنے مضمون 'منٹو اور سنسنی خیزی' میں بتایا ہے کہ سنسنی خیزی کیا ہوتی ہے اس کے بعد انھوں نے منٹو کے ان افسانوں کا ذکر کیا ہے جنھیں نقاد سنسنی خیز بتاتے تھے اور ثابت کیا ہے کہ ان افسانوں کی معنویت فی الحقیقت کیا ہے اور ان میں سنسنی خیزی کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ وارث علوی نے منٹو کے افسانوں خصوصاً 'کھول دو، ٹھنڈا گوشت، گورمکھ سنگھ، وصیت کے حوالے سے منٹو پر لگائے گئے سنسنی خیزی کے الزام کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "اگر منٹو کے یہاں سنسنی خیزی ہے تو اپنی وجہ جواز رکھتی ہے۔ نفسیاتی بھی اور فنکارانہ بھی بالکل اسی مبالغہ کی مانند جس کا جائز استعمال اپنے افسانوں اور ناولوں میں لاطینی، امریکی ناول نگار گارسیا مارکویز کرتا ہے۔ منٹو کے ایسے افسانوں سے سنسنی خیزی کا عنصر نکال دیجیے تو وہ ڈنک کے بغیر بچھو بن جائیں گے۔"

کتاب کا اگلا باب عشق ومحبت کی کہانیاں ہے۔ عنوان ایسا پارینہ اور فرسودہ ہے کہ شاید ہی کسی کو پسند آئے۔ لیکن وارث علوی نے اس عنوان کے لیے جو جواز فراہم کیا ہے وہ اس کے بحث کردہ افسانوں کے تجزیہ سے معقول اور مناسب ثابت ہوتا ہے۔ وارث علوی ان افسانوں کا ذکر کرتے ہیں جو منٹو کے مبتدیانہ افسانے ہیں جن میں کوئی بہت گہری بات نہیں لیکن اچھے افسانوں کے پس منظر کے طور پر ان کا علم بھی ضروری ہے۔ چنانچہ وہ منٹو کے ابتدائی افسانوں جیسے 'لال ٹین، مصری کی ڈلی، بیگو، نامکمل تحریر، موسم کی شرارت، میرا اور اس کا انتقام، چوہے دان وغیرہ کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اور آگے چل کر اس تعلق سے منٹو کے جو طاقتور افسانے ہیں ان کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ مثلاً دودا پہلوان، دو قومیں، کتے کی دعا، سودا بیچنے والی، جاؤ حنیف۔ سعادت حسن منٹو کے ہر مطالعہ میں جنس، عریانیت اور طوائف کے حوالے لازمی طور پر لائے جاتے ہیں اور اکثر وبیشتر ناقدین منٹو کے افسانوں میں اور منٹو کی ذات میں جنسی بے راہ روی کی موجودگی ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک آدھ افسانوں میں جنس نگاری تو کی ہے لیکن جنسی اشتعال انگیزی نہیں ہے۔

دراصل منٹو کے یہاں عورت کے احترام کا جذبہ بہت مضبوط ہے اسی لیے وہ طوائفوں کا ذکر تو کرتا ہے لیکن ان کی تذلیل نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ منٹو نے عورت کے کئی روپ اپنے افسانوں میں پیش کیے۔ وارث علوی نے اپنی کتاب 'منٹو ایک مطالعہ' میں شامل چھٹا مضمون 'منٹو کے افسانوں میں عورت' کے عنوان سے لکھا ہے۔ وارث علوی یہ تو مانتے ہیں کہ منٹو کے دل میں عورت کے لیے احترام تھا لیکن وارث علوی اس احترام اور ہمدردی کو Feminism کا نام دینے سے انکار کرتے ہیں۔ مذکورہ مضمون میں جہاں وارث علوی نے دوشیزہ لڑکی یا شادی شدہ عورت کے تصور پر بحث کی ہے وہیں سب سے طویل گفتگو طوائف سے متعلق افسانوں پر کی ہے اور اس میں ہر طوائف کے کردار کا بے حد اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔

'گنجے فرشتے' اور 'لاؤڈ اسپیکر' کے نام سے منٹو کے خاکوں کے مجموعے اردو خاکہ نگاری میں کئی اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وارث علوی نے منٹو کی خاکہ نگاری کے لیے اپنی کتاب کے کئی صفحات وقف کیے ہیں۔ وارث علوی نے مختلف خاکوں کا بیان کر کے ان کے انفرادی حسن کو ظاہر کیا ہے۔ منٹو کے خاکوں کا لطف اس بات میں ہے کہ یہ شخصیتیں افسانوی کرداروں کی صورت ہمارے سامنے آتی ہیں اور جس طرح ہر افسانے کا کردار اس افسانے کی چوکھٹے میں مکمل ہوتے ہیں۔ منٹو کے لگ بھگ تمام خاکے دلچسپ ہیں۔ ان خاکوں کا مطالعہ ہمیں ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں عجیب عجیب کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وارث علوی نے خاکہ نگاری کے انہی نقوش کو جامع انداز سے ابھارا ہے۔

مختصر یہ کہ منٹو شناسی کے عمل میں جن محققین، ناقدین اور احباب نے اپنے تجزیاتی یا تاثراتی خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی روشنی میں یہ طے کرنا ہوگا کہ منٹو جیسے عظیم فن کار کی شخصیت اور فن کی حقیقی شناخت کے عمل میں اردو کے نقادوں اور دانشوروں کو کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ منٹو کو صرف ان کے زمانے کے حالات کے پس منظر میں ہی نہیں بلکہ آج کے سماجی، ثقافتی، مذہبی اور اخلاقی تناظرات میں دیکھنا ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ اکیسویں صدی جو کہ فکشن کی صدی ہے، منٹو کے فن کی اور بھی گتھیاں سلجھیں گی اور اس بڑے فن کار کی اہمیت اور افادیت نکھر کر سامنے آئے گی۔ مجھے لگتا ہے کہ منٹو شناسی کا جب آغاز اتنا اچھا ہے تو انجام کیا ہوگا۔

■

Dr. Mushtaq Alam Qadri
Dept. of Urdu
Delhi University, Delhi - 110007

شمیم احمد صدیقی

نادر شاہجہانپوری

ہم آپ بخوبی واقف ہیں کہ جس طرح اردو زبان کی تشکیل میں ملک کی مختلف زبانوں کا حصہ رہا ہے اسی طرح اس کی ترویج اور آبیاری میں یہاں کی تمام اقوام نے بڑھ چڑھ کر ہاتھ بٹایا ہے۔

جان رابرٹ پال (نادر) کی پیدائش 26 فروری 1890 کو ضلع شاہجہانپور کے موضع راماپور میں ہوئی تھی۔ انھوں نے 1907 میں مشن ہائی اسکول شاہجہانپور سے انٹرینس یعنی ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔ والد کا انتقال محض اڑتالیس برس کی عمر میں ہوجانے کے بعد ایک صاحبِ خیر مشنری خاتون نے اُن کا داخلہ لکھنؤ کے کرشچین کالج میں کرادیا تھا لیکن وہاں طلباء کی شان وشوکت دیکھ کر آپ کو احساس کمتری ہوا لہٰذا کالج کو خیر باد کہہ کر قصبۂ تلہر میں مدرس ہوگئے۔ 1910 میں اُن کی شادی ہوئی اور 1917 میں بہتر ملازمت کی خاطر جھانسی منتقل ہوگئے اور تا حیات وہیں مقیم رہے۔ شاعری کی ابتدا دوران طالب علمی میں ہوچکی تھی۔ کچھ وقفہ پروفیسر الٰہی بخش قریں نیازی سے مشورۂ سخن کیا پھر خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی کی شاگردی اختیار کی لیکن انھوں نے 1917 میں ہی یہ خوشخبری دے دی کہ آپ کو اب اصلاح کی ضرورت نہیں رہی۔ 31 مئی 1962 کو نادر صاحب کا جھانسی میں ہی انتقال ہوا اور وہیں دفن کیے گئے۔ اُن کے انتقال کی روداد مسٹر جیسپر کی زبانی سُن کر بڑا قلق ہوا۔ نادر صاحب اپنے انتقال سے چند ہفتہ پیشتر اپنے کسی دوست کے اصرار پر اپنا مجموعہ کلام شائع کرانے کے سلسلہ میں اُس وقت کی صوبائی حکومت کے وزیر تعلیم سے ملے تھے جو بڑی سرد مہری سے پیش آئے تھے اور اُردو زبان کے سلسلے میں کچھ دل آزار کلمات بھی کہے تھے جس کے صدمہ سے نڈھال ہوکر وہ چند ہفتے کے اندر ہی جہانِ فانی سے کوچ کرگئے۔

جان البرٹ پال نادر شاہجہانپوری ثم جھانسوی کی شاعرانہ صلاحتیں خدا داد تھیں۔ اُن کے اوّلین استاد پروفیسر قریں نیازی نے ایک مرتبہ ان کی زود گوئی اور صلاحیت کا جائزہ لینے کے لیے درج ذیل مصرعے پر گرہ لگانے کی فرمائش کی۔

ہوگئے پتھر ہی پتھر زیرِ پا بالائے سر

نادر صاحب نے کچھ دیر فکر کی اور شروع میں یہ مصرعہ پڑھ کر شعر مکمل کیا۔

کوہِ غم سر پر لیے فرہاد پہنچا کوہ پر
ہوگئے پتھر ہی پتھر زیرِ پا بالائے سر

استاد مسرت سے جھوم اُٹھے اور شفقت سے گلے لگایا۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ عشرت لکھنوی نے بھی لگ بھگ ایک سال میں ہی آپ کے استاد ہونے کا اعلان کردیا تھا۔

نادر شاہجہانپوری تمام عمر درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہے اور طلباء کو حساب اور انگریزی پڑھاتے رہے لیکن وہ لیلائے اُردو کے دام میں ایسے گرفتار تھے کہ تدریسی اوقات کے علاوہ بقیہ زیادہ تر وقت سخن طرازی یا شاگردوں کی اصلاح میں گزرتا تھا۔ شاید یہ نادر صاحب کے اُردو شاعری کے تئیں والہانہ عشق کا تصرف رہا ہے کہ اُن کے بعد انگریزی درس وتدریس سے تاحیات منسلک رہنے والے الٰہ آباد یونیورسٹی کے فراق گورکھپوری، فضل الرحمٰن اسلامیہ انٹر کالج بریلی کے محمد عرفان نگینوی مرحوم اور رانچی کے وکاس ودیالیہ ریزیڈنشیل پبلک اسکول کے حیرت فرخ آبادی بھی تمام عمر انگریزی درس وتدریس کے ذریعے اپنی بشری ضروریات پوری کرتے رہے البتہ طلسم اصواتِ اردو کے ہزار رنگ سے خود کو آزاد نہ کرسکے

اور اپنی روحِ لطیف کی تسکین کے لیے گلشنِ اُردو کے گل بوٹوں کی آبیاری کرتے رہے۔ نادر صاحب ایک قلندر صفت، صوفی منش اور خوددار شخص تھے۔ تمام عمر معاشی تنگی میں مبتلا رہے، جس کی بنا پر اپنے کلام کو کتابی شکل میں شائع نہ کرا سکے۔ اُن کے تینوں مجموعہ ہائے کلام غرور تشنہ لبی، فصل شہر سخن، دیوان نادر ان کے نبیرۂ سعادتمند جسپیر آر پال کی کاوشوں سے منصۂ شہود پر آسکے۔

نادر شاہجہانپوری کی بیشتر شاعری کلاسیکل انداز کی ہے کیونکہ جس دور کی یہ تخلیقات ہیں اس وقت مضامین آفرینی یا عنوانات کے تنوع کو خاص اہمیت حاصل نہ تھی بلکہ زبان دانی اور اسلوب ہی پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ نادر نے بھی اساتذہ قدیم کی پیروی کرتے ہوئے حُسن و عشق، وصال و فراق، وفا و جفا، قفس و آشیانہ، رند و زاہد، گل و بلبل، خوشی و غم، مسجد و شوالہ، ایمان و کفر، شیخ و برہمن، نیز محبوب کے قدو سراپا، ناز و ادا اور اس کے شکوہ شکایات جیسے مضامین کو ہی اپنی شاعری کا مرکز بنایا تھا۔

ان موضوعات سے متعلق چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بہت مشکل ہے قابو اُس بت کافر پہ چل جانا
وہ پتھر دل ہے، آتا ہی نہیں اس کو پگھل جانا

دل دیا ، جان دی ، ایمان دیا اے نادر
ہائے پھر بھی نہ ہوا وہ بُتِ خود سر اپنا

اُس بے وفا کے وصل کی تدبیر کیا کروں
میری وفا سے بھی جو بہت بدگماں ہے اب

پہنے ہوئے ہے سُرخ کفن گل تو کیا عجب
بلبل کا ہے قفس کی طرف آشیاں سے کوچ

تم مجھ کو قتل کرکے پشیمان ہوگے خود
میری وفائیں یاد کرو گے جفا کے بعد

لاکھ سمجھایا کیے اُن کو فریب غیر سے
جس کا دھڑکا تھا ہمیں وہ بات بھی ہونے لگی

جیسا کہ اُس دور کی شاعری کا رواج تھا کہ اس میں رعایت لفظی، بندشِ الفاظ اور زبان کی لطافت پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی اسی لیے نادر کے اشعار میں ہم کو تشبیہات، تلمیحات، کنایات اور محاوروں کی بھرمار دکھائی دیتی ہے۔

ذیل کے چند اشعار اس تاثر کی تائید کے لیے کافی ہیں:

ہزاروں انگلیاں اٹھتی ہیں لاکھوں خون ہوتے ہیں
ترا ابرو نمونہ ہے ہلال عید قرباں کا

تری گندم نما جو فروشی سے ہوں میں واقف
کسی آنکھوں کے اندھے کو تو جاکر ، پارسا سمجھا

آنکھ جب سے لگ گئی ہے آنکھ لگتی ہی نہیں
بختِ خوابیدہ کی صورت ہم کو ترساتی ہے نیند

نادر شاہجہانپوری کی بیشتر شاعری کلاسیکل انداز کی ہے کیونکہ جس دور کی یہ تخلیقات ہیں اس وقت مضامین آفرینی یا عنوانات کے تنوع کو خاص اہمیت حاصل نہ تھی بلکہ زبان دانی اور اسلوب ہی پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ نادر نے بھی اساتذہ قدیم کی پیروی کرتے ہوئے حُسن و عشق، وصال و فراق، وفا و جفا، قفس و آشیانہ، رند و زاہد، گل و بلبل، خوشی و غم، مسجد و شوالہ، ایمان و کفر، شیخ و برہمن، نیز محبوب کے قدو سراپا، ناز و ادا اور اس کے شکوہ شکایات جیسے مضامین کو ہی اپنی شاعری کا مرکز بنایا تھا۔

اب فلاطوں بھی اگر چارہ گری کو آئے
تیرے بیمار کو ہوگی نہ شفا کی امید

کسی زہرہ جبیں کا مشتری ہوں
دماغ اپنا نہ ہو کیوں آسماں پر

کچھ تو سوچو کس لیے آنکھوں کا پانی ڈھل گیا
تم کو دنیا کیا کہے گی غیر کے گھر دیکھ کر

زبان میں ہے فصاحت، بیان پاکیزہ
ترے کلام میں نادر ہمیں کلام نہیں

تجھ کو بے دیکھے ہی تصویر اُتاری دل میں
رشکِ مانی ہوں اگر غیرت بہزاد ہوں میں

تمہاری لن ترانی کا یقین آتا نہیں
صدائے دل ہی بڑھ کر جب ندائے طور ہوجائے

نادر کے اشعار میں رعایتِ لفظی کا اس قدر اہتمام کیا گیا ہے کہ بیشمار اشعار ایسے ہیں جن میں ایک یا زائد ذو معنی الفاظ کے جوڑے سموئے گئے ہیں۔ جب ایک ہی لفظ دو مختلف معنوں کو پیش کرتا ہو تو ظاہر ہے کلام کے حسن میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

تری شبیہ کو تشبیہ دوں تو کس سے دوں
مثال دے نہ سکے گی مثال کی دنیا

جو صورت دکھائے تو میں خوب دیکھوں
شرارت سے آنکھیں دکھادینے والا

وہ ستم گر آنکھ پھیرے ہی رہا
جس کی خاطر در بدر پھیرا کیا

کسی بُت پہ مرنے سے پہلے ہی مرجا
مزا چاہتا ہے اگر زندگی کا

دم مرگ اتنا خیال آگیا
مرے حال سے اُن کو حال آگیا

مل جائیں وہ کہیں تو ذرا اتنا پوچھ لوں
مجھ کو ملا کے خاک میں تم کو ملا ہے کیا

قارئین غور فرمائیں کہ صرف 'الف' ردیف کی غزلیات میں سے منتخب کیے گئے اشعار میں ذومعنی الفاظ والے کس قدر اشعار ہیں۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مکمل دیوان میں کس قدر اشعار اس رنگ کے ہوں گے۔

رعایتِ لفظی کی ایک دوسری شکل صنعت تضاد ہے یعنی ایک ہی شعر میں متضاد الفاظ کو پرونا، واقعہ یہ ہے کہ نادر کے اس مجموعہ کلام میں شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو جس میں ایک سے زائد اشعار میں متضاد الفاظ موجود نہ ہوں۔ حد یہ ہے کہ بعض اشعار میں ایک سے زائد متضاد الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے۔ متضاد الفاظ کے دو دو جوڑوں کے حامل اشعار کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

مصحفِ رُخ ہے عجب گیسوئے کافر ہے غضب
کلمہ کیوں نہ پڑھیں شیخ و برہمن اُن کا

اُٹھا کے موت کی تلخی عدم میں ڈھونڈ اُسے
اگر جہاں میں وہ شیریں ادا نہیں ملتا

ہمارے پاس سے رہتے ہو دور تم جب تک
ہمیں حیات میں مطلق مزا نہیں ملتا

بشر مختار کامل ہو کے بھی مجبور و ناقص ہے
ہماری سربلندی سے فقط ہے عاجزی پیدا

ملے جب خاک میں ہم شیشۂ دل نے جلا پائی
ہماری خانہ بربادی نے کیا تعمیر کی پیدا

میں نقشِ کفِ پا کی طرح بیٹھ گیا ہوں
تو اپنی گلی سے مجھے اٹھوا نہ سکے گا

آس جینے کی نہیں تجھ سے کچھ امید نہیں
موت ہی کے تو مجھے کردے حوالے آجا

ہم نے نادر کی تمام غزلیات دیکھنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ گو نادر کا خاندانی سلسلۂ شاعری میر تقی میر تک پہنچتا ہے تاہم اُن کے اشعار میں میر کا رنگ برائے نام ہے البتہ انھوں نے غالب اور داغ سے خاصا کسبِ فیض کیا ہے۔ ہم صرف ایک ایک شعر بطور مثال پیش کررہے ہیں:

کیا روؤں دل کو اور کیا پیٹوں جگر کو میں
برباد کرچکا ہوں بھرے گھر کے گھر کو میں

(نادر)

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
(غالب)

اس بے وفا کے وصل کی تدبیر کیا کروں
میری وفا سے بھی جو بہت بدگماں ہے اب
(نادر)

تم کو یقیں نہیں تو نہ ہو اس کا کیا علاج
کمبخت داغ تم سے بہت بدگماں ہے اب
(داغ)

نادر شاہجہانپوری کی پوری زندگی مصائب سے بھری رہی۔ کم عمری میں والد کا انتقال ہوجانے کی بنا پر ہائی اسکول کرنے کے بعد ملازمت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور جلد شادی ہونے سے گھریلو ذمے داریاں بڑھ گئیں۔ غربت اور ناداری اس قدر تھی کہ بعض مرتبہ بھوکے رہ کر گذارا کیا۔ لیکن خودداری اور قلندرانہ صفت کی وجہ سے کبھی اپنی انا کا سودا نہ کیا۔ اُن کے کلام میں اُن کی غیرت اور تنگدستی کے خاصے اشارے ملتے ہیں۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

خدا کے فضل و کرم سے یوں تو ہر ایک فن میں ہوں طاق نادر
جہاں میں ہاں مفلسی نے بیشک مٹا دیا ہے وقار اپنا
صدا احساں ہے، فقیری میں بھی مستغنی ہوں میں نادر
زیادہ دینے والا مجھ کو کم لینے نہیں دیتا
گردشِ قسمت سے نادر اب تو جی اکتا گیا
بھاگ جاؤں میں کہاں اس رنج کی دنیا سے دور

خدا کا کرم تو ہے نادر بہت
بلا سے اگر سیم و زر کچھ نہیں
توکل نے کیا ہے مجھ کو مستغنی دو عالم سے
امیری کے مزے لیتا ہوں نادر فاقہ مستی میں

غزل کے لغوی معنی ہیں محبوب سے باتیں کرنا۔ اسی لیے کلاسیکل غزل میں نہ صرف محبوب کے حسن و جمال اور سراپا کی تعریف ہوتی ہے بلکہ اس میں محبوب کی بے وفائی، بے التفاتی اور دیگر باتوں کا شکوہ بھی بڑی شدت سے بیان کیا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نادر کی غزلیات میں بھی ہم کو یہ پہلو نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

مری جانب کبھی تو ہو توجہ
بھلا ایسی بھی مجھ سے بے رُخی کیا
آپ ہی نے تو مجھے رسوا کیا
آپ ہی کہتے ہیں ہم نے کیا کیا
محفلِ غیر میں کل خوب بناتے تھے مجھے
میں بھی گر تم سے بگڑتا تو بھلا کیا ہوتا

نادر شاہجہانپوری کی پوری زندگی مصائب سے بھری رہی۔ کم عمری میں والد کا انتقال ہوجانے کی بنا پر ہائی اسکول کرنے کے بعد ملازمت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور جلد شادی ہونے سے گھریلو ذمے داریاں بڑھ گئیں۔ غربت اور ناداری اس قدر تھی کہ بعض مرتبہ بھوکے رہ کر گذارا کیا۔ لیکن خودداری اور قلندرانہ صفت کی وجہ سے کبھی اپنی انا کا سودا نہ کیا۔ اُن کے کلام میں اُن کی غیرت اور تنگدستی کے خاصے اشارے ملتے ہیں۔

ستم تم نے کیے پیہم، شکایت میں نے کی ہر دم
وفا کی راہ میں ثابت نہ میں نکلا نہ تو نکلا
اب مری تربت پہ بن کر سوگوار آئے تو کیا
خاک میں جب مل گیا میں تم ہزار آئے تو کیا

یہ تمام اشعار ردیف 'الف' سے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے کہ پورے دیوان میں اس زمرے کے کس قدر شعر ہوں گے۔

ہمارے قدیم شعرا نے اپنی شاعری میں سیکولر رنگ کے اشعار کو بڑی اہمیت دی ہے تاکہ شاعری محض حظِ نفس کے لیے نہ ہو بلکہ مُلک میں بسنے والی تمام اقوام اور تمام مذاہب کے ماننے والوں میں ایک دوسرے کے خیالات، جذبات اور مذہبی اعمال کے تئیں رواداری، اخوت اور بھائی چارے کا فروغ ہو۔ نادر کے دیوان میں بھی ہم کو بڑی تعداد میں سیکولر رنگ کے اشعار دکھائی دیتے ہیں۔ آپ بھی ملاحظہ کریں:

دین و ایماں وہ سرِ طاق اُٹھا کر رکھ دیں
دیکھ لیں جلوہ اگر شیخ و برہمن اُن کا
عشقِ خوباں ہی سے دل کو عشقِ یزداں ہوگیا
بُت پرستی کی بدولت میں مسلماں ہوگیا
ہم جو کعبہ کو بھی جاتے تو یہ صورت ہوتی
ہر قدم پر بُت و بتخانہ بنایا ہوتا
بُتانِ سنگدل کی یاد دل میں روز لاتے ہیں
جگر دیکھو کہ ہم کعبہ کو بتخانہ بناتے ہیں

رہے گی مرے دل میں تیری ہی صورت
حرم یا کلیسا کہ بتخانہ ہوں میں
وہ کیوں جائیں کعبہ میں سر ٹیکنے کو
جو اُس بُت کے مندر میں داخل ہوئے ہیں
اپنی روش پہ سالکِ راہِ خدا ہوں میں
دیر و حرم کی قید سے نا آشنا ہوں میں
غرض ہے دین سے ہم کو، نہ کفر سے مطلب
ہمیں ہے عشق سے مطلب وہ کام کر لیں گے

ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ کلاسیکی اُردو شاعری زیادہ تر حُسن و عشق کے معرکوں کا احاطہ کرتی ہے تاہم اس کا دائرہ اتنا محدود بھی نہیں کہ اس میں انسان سے متعلق دیگر امور کو کوئی اہمیت نہ دی گئی ہو۔ وہ انسان ہی کیا جس میں انسانی اوصاف نہ پائے جاتے ہوں اور جو جہانِ آب و گِل سے گزرنے کے بعد آنے والی زندگی کو اور اپنے خالق کی رضا جوئی کو یکسر فراموش کردے یا جو اس عالم میں رہتے ہوئے اپنے جیسے دوسرے انسانوں اور محبوبِ حقیقی کی دیگر مخلوقات کے حقوق سے چشم پوشی کرے اور جس کے اندر اپنی مادرِ وطن سے محبت کا کوئی جذبہ موجزن نہ ہو۔ ہم نے دیوان نادر کے مطالعے میں یہ پایا کہ مذکورہ تمام موضوعات کو شاعر نے اپنے کلام میں سمویا ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار دیکھیں:

اگر دل ہے تو دلسوزی کیا کر
جو انساں ہی نہیں وہ آدمی کیا
وہی آساں گزر جائے گا دشت نامرادی سے
سہارا چھوڑ کر جس نے توکل کو عصا سمجھا
منزلِ مقصود پر پہنچا وہی
حرص کو جس نے شکست پا کیا
وادیٔ پُر خار عالم میں قدم رکھ دیکھ کر
ورنہ پھر گُل ہیں دونوں آنکھ کے روشن چراغ
حشر میں آبرو اگر چاہو
ہاتھ تر دامنی سے دھو لو تم

دیوانِ نادر کی غزلیات منظومات، رباعیات اور قطعات تمام مشمولات گواہ ہیں کہ باوجود اس امر کے کہ نادر نے اپنے دور کے اساتذہ کے طرز سے انحراف نہیں کیا تاہم اپنے مخصوص اسلوب، الفاظ کی عمدہ اور دلکش بندش اور اظہارِ خیال کی ندرت کی بنا پر وہ اپنی علاحدہ شناخت قائم کرنے میں بیحد کامیاب ہیں۔

■

Dr. Shamim Ahmad Siddiqui
Naseem Manzil, Madah Ganj Police Chowki
Seetapur Road, Luknow - 226020

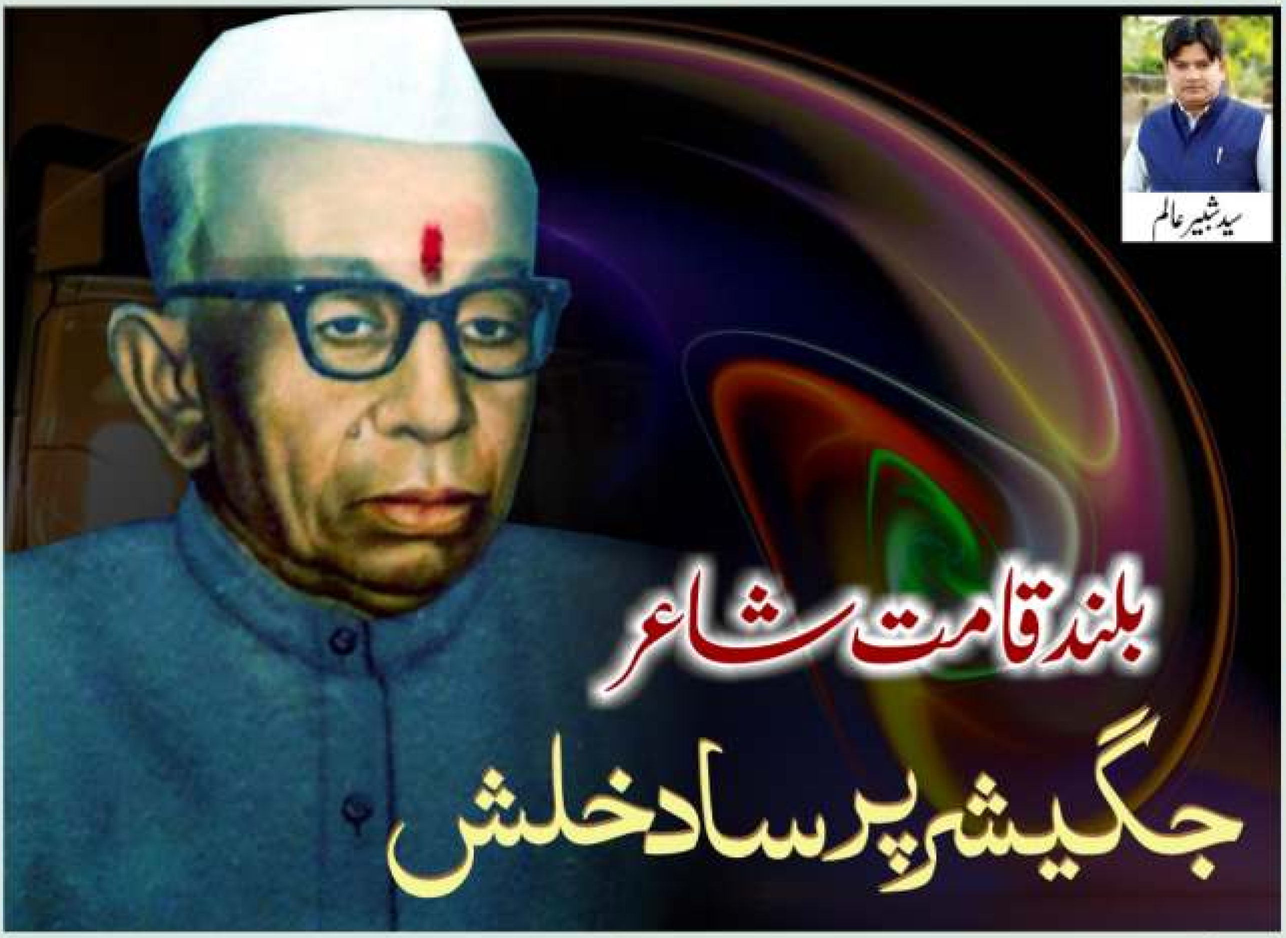

سید شبیر عالم

بلند قامت شاعر
جگیشر پرساد خلش

جگیشر پرساد خلش تحریک آزادی کے ایک سرفروش، مجاہد، کھرے اور بے باک صحافی، بلند پایہ شاعر، تذکرہ نگار اور ایک دردمند انسان تھے۔ ان کی پیدائش 8 نومبر 1894 کو گیا شہر سے تقریباً 53 کلومیٹر فاصلے پر واقع قصبہ ندرہ میں آنجہانی کانسی ناتھ کے گھر میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ عربی وفارسی کی تعلیم اپنے گاؤں کے مکتب میں معروف عالم دین فرخ حسین کی زیر ہدایت ونگرانی حاصل کی۔ گھر کی مالی مشکلات کے سبب اسکول وکالج میں تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ استاد فرخ حسین کی شاگردی میں انھیں اردو شعروشاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ گیا کی سرزمین اردو ادب کے لیے قدیم زمانے سے ہی زرخیز رہی ہے۔ وہاں کثیر تعداد میں ادیب وشاعر پیدا ہوئے، جن کی تصنیفات خدابخش لائبریری پٹنہ کے علاوہ ملک کی مختلف لائبریریوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔

خلش کی شاعری کا آغاز 1911 میں گورکھپور سے شائع ہونے والا ہفتہ وار رسالہ 'فتنہ' سے ہوتا ہے۔ جگیشر پرساد نے عبدالرؤف عشرت لکھنوی سے اپنے کلام کی اصلاح لی اور انھیں کے مشورے سے اپنا تخلص 'خلش' رکھا۔ 1912 میں شہر گیا سے ماہنامہ 'بزم سخن' جاری کیا۔ جس کی مجلس ادارت میں علامہ فضل حق آزاد، نواب امداد امام اثر اور امیر مینائی کے شاگرد کوثر خیرآبادی جیسی قدآور شخصیات شامل تھیں۔ بزم کی جانب سے ہر ماہ گیا میں مشاعرہ منعقد ہوتا تھا اور اس میں پڑھی گئی غزلیں رسالہ 'بزم سخن' میں شائع ہوتی تھیں۔ ریاست علی ندوی 'نگارش' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:

سرتاج سخن امیر مینائی کے شاگرد رشید جناب کوثر خیرآبادی کی سرپرستی میں ماہانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ گیا میں ان مشاعروں کی آخری کڑیاں ہمارے خلش جی کے ہاتھوں میں آئیں، وہ مشاعروں کی غزلیں مرتب کرکے اسے ماہنامہ بزم سخن میں بڑے اہتمام سے شائع کرتے تھے۔

بزم سخن کے مشاعروں میں شریک ہونے والے شعرا میں انجم مانپوری، شمس گیاوی، بسمل سہنساروی، علامہ سریر کابری، روش صدیقی، سید امام امداد اثر، اختر حسین قادری، سید شاہ محمد طہ استھوی اشرف، لالہ کیدار ناتھ اشک، حاجی محمد یعقوب اوج، برج کشور نارائن بے ڈھب، رسا ہمدانی وغیرہ اہم ہیں۔

اردو کے مشہور ومعروف طنز ومزاح نگار رضا نقوی واہی جگیشر پرساد کے شعری مجموعے دھوپ اور چھاؤں کے پیش لفظ میں یوں گویا ہوتے ہیں:

''1912 میں ماہنامہ 'بزم سخن' ان کی ادارت میں جاری ہوا اور اس کے ساتھ ہی گیا کی زندگی میں ایک نئی روح دوڑ گئی، جس نے یہاں تک زور پکڑا کہ 22 اگست 1916 کو ایک عظیم الشان آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہوا، جس کی مجلس استقبالیہ کے سکریٹری خلش نامزد ہوئے۔ اس مشاعرے میں لگ بھگ دو سو شعرا شریک ہوئے تھے۔''

اس کل ہند مشاعرے کی کامیابی کا سہرا خلش جی کے سر رہا۔ ان کی شخصیت اتنی فعال تھی کہ وہ مختلف جرائد وانجمن کی ادارت کرتے رہے، مثلاً تاج ماہنامہ، انجمن چشمۂ سخن ندرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو شعرا کا تذکرہ موسوم بہ 'فروغ بزم' 1930 میں مرتب کرکے شائع کیا، جو اب نایاب ہے۔

ان کی زندگی دو حصوں یعنی سیاست اور ادب میں منقسم رہی۔ وہ بہار کی واحد ہستی تھے، جو ہر شعبۂ زندگی میں یکساں طور پر مقبول اور ہردلعزیز تھے، چاہے وہ ادب کا شعبہ ہو یا سیاست کا ہر جگہ ان کی عزت افزائی ہوئی۔ جس محفل میں پہنچ جاتے، وہ محفل لالہ زار بن جاتی۔ وہ

سوسائٹی کے روح رواں تھے۔ انھیں 1930 سے 1942 تک کئی بار جیل خانے کی چہار دیواری میں قید رکھا گیا۔ لیکن ان کے دل میں وطن کی آزادی کی موجیں لہریں مارتی رہیں اور وہ حب الوطنی کا ترانہ گنگناتے رہے۔

'نگارش' کے مضامین جگیشر پرساد خلش کے ذہن کا وہ نگار خانہ ہے، جس میں بہار اور خصوصا گیا کے تاریخی واقعات کو دلکش زبان میں تحریر کا جامہ پہنایا گیا ہے، اسلوب کے حوالے سے نگارش کے مضامین ہندی اور اردو کا سنگم کہلانے کا حق رکھتے ہیں اور قیمتی تاریخی دستاویزی سرمایے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔

نگارش کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں درج مایہ ناز شخصیات کی گیا آمد اور ان کے ساتھ گذارے ہوئے وہ حسین لمحات، آزادی کے بعد سے 1970 تک کے ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی خیالات سے آگہی ہوتی ہے۔ یہ کتاب آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک قیمتی تاریخی دستاویز ثابت ہوگی۔ اب ہم خلش کی شاعری میں سیاسی عنصر کی نشاندہی کریں گے، جس سے اندازہ لگایا جاسکے گا کہ ان کے اشعار کہاں تک تحریک آزادی اور قومی یکجہتی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ 3 جولائی کو ڈاکٹر راجندر پرساد کی صدارت میں ہزاری باغ سینٹرل جیل کے مشاعرے میں پڑھی گئی نظم 'قیدی' کا یہ بند ملاحظہ فرمائیں:

ظلم ڈھاتی ہیں یہ گھنگھور گھٹائیں کالی
مت بدل جاتا ہے آتی ہے جو یہ متوالی
آنکھیں بھر آتی ہیں جب دیکھ کے پہلو خالی
جھک کے کانوں میں یہ کہتی ہے چمن کی ڈالی
نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی
گھٹ کے مر جائیے مرضی ہے یہی صیاد کی

12 اکتوبر 1942 کو یہ نظم گیا سینٹرل جیل میں لکھی گئی تھی، جس کا عنوان ہے 'گاندھی جینتی'

ہنس کے روتی ہوئی دنیا کو ہنسایا ہم نے
رو کے ہنستی ہوئی ہستی کو رلایا تونے
بادۂ حب وطن سب کو پلایا تونے
دیش بھگتی کا نیا راگ سنایا تونے
روز بے موت مرا کرتے ہیں ڈرنے والے
مر کے بھی مرتے نہیں دیش پہ مرنے والے

ملک کی حفاظت کے لیے نوجوان جو سرحد پر جان کی بازی لگا کر تعینات رہتے ہیں، ان کی ہمت اور حوصلے کو بڑے دلکش پیرایے میں بیان کیا ہے۔ نظم 'نوجوانوں سے خطاب' کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

فقط تبت نہیں جاپان چین لنکا ہمارا تھا
مکمل ایشیا میں اپنا جلوہ آشکارا تھا
اطاعت کے لیے کافی فقط ادنیٰ اشارہ تھا
الگ ہوکر رہے ہم سے کسی کو کب گوارا تھا
ابھی تک ہند کی چوکھٹ پہ اپنا سر جھکاتے ہیں
ہزاروں چین سے جاپان سے تبت سے آتے ہیں
لٹا کر چینیوں کو پھینک دو ایسی ترائی میں
کوئی پتھر سے ٹکرائے کوئی سو جائے کھائی میں

1930 کے نمک ستیہ گرہ کے دوران ہزاری باغ سینٹرل جیل میں ڈاکٹر شری کرشن سنہا کی صدارت میں جنم اشٹمی منائی گئی۔ اسی موقع پر نظم 'آؤ کرشن' پڑھی گئی۔

آج بھی بھیڑ وہی رہتی ہے جمنا تٹ پر
گوپیاں آج بھی بل کھاتی ہیں تیری لٹ پر
ہاتھ جوڑے ہوئے دنیا ہے کھڑی چوکھٹ پر
سچ بتا چھپ کے تو کیوں بیٹھا ہے اپنی مٹ پر
تو نہ آتا ہے نہ آنے کی صدا آتی ہے
مورتی بھی تری چپ چاپ سی رہ جاتی ہے
ہوچکی حد ستم اب نہ ستاؤ ہم کو
جل چکے اب نہ غلامی میں جلاؤ ہم کو
پھر کروشیتر کا میدان دکھاؤ ہم کو
راگ آزادیِ بھارت کا سناؤ ہم کو
قول مردوں کا ہے وعدے کا وفا ہونا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہونا

جگیشر پرساد خلش کے کلام میں صوفیانہ اشعار جابہ جا پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ حضرت مخدوم میران احمد زاہدی کی تشریف آوری اور ان کی تعلیمات کا فیض ہے۔ مخدوم میران احمد عبادت وریاضت اور اسلام کی تبلیغ کے لیے ندرہ تشریف لائے اور یہیں رشد وہدایت دیتے ہوئے 1430 میں دنیائے فانی سے کوچ کرگئے۔ مخدوم میران احمد حضرت مخدوم بہاری کے معاصر تھے۔ تقریبا 587 سال گزر جانے کے بعد بھی عقیدت مندان کے مزار پر زیارت کے لیے حاضر ہوئے۔

لہٰذا خلش کے کلام میں صوفیانہ اشعار کا ہونا سرزمین ندرہ کی صوفیانہ آب وہوا کی غمازی کرتا ہے۔

صوفیانہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بہر صورت بت ہرجائی کو پردہ نشیں دیکھا
مگر پردہ تو یہ ہے کہ کہیں پردہ نہیں دیکھا
کہا کرتے ہیں جس کو لامکاں دونوں جہاں والے
اسی کو ہم نے اپنے خانہ دل میں کہیں دیکھا
گھر فقط دو تھے مگر ایک ہی جلوہ دیکھا

ہر قدم پر میرے کانٹوں نے قدم چوم لیے
ناگہاں آبلہ پا دیکھ کے ویرانے میں
دل اگر دل ہے تو دل میں صنم کی صورت
ورنہ پتھر کے سوا کچھ نہیں بت خانے میں

عشق مجازی:

رقص بسمل کی تڑپ ان کو خلش دکھلا دو
آج بیٹھے ہیں وہ مشتاق تماشہ ہوکر
جس کی یک چال سے ہوجائے قیامت برپا
فتنہ انگیز وہ رفتار کہاں سے لاؤں
مری جان جان لی دونوں نے آخر جان جاں ہوکر
نظر نے تیر ہوکر تیرے ابرو نے کماں ہوکر
نظر کے ڈر سے پوشیدہ ہیں در پردہ نگاہوں میں
تری آنکھوں میں رہتے ہیں وہ آنکھوں میں نہاں ہوکر

آج خلش جی کا ایک مصرعہ ہر خاص وعام میں اتنا مقبول ہے کہ جب بھی سیاست دانوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو ان کے اس مصرعہ کو ضرور دہرایا جاتا ہے۔

ہر شاخ پہ الو بیٹا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا؟

رضا نقوی واہی دھوپ اور چھاؤں کے پیش لفظ میں فرماتے ہیں کہ:

''میں نے وہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جب بہار کی مجلس قانون ساز میں خلش جی کا طوطی بولتا تھا، تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو وزیر اعلیٰ ہوں یا افسروں کی گیلری میں بیٹھا کوئی اعلیٰ افسر سبھی دم بخود ہوکر ایک ایک لفظ سنتے اور سارے ایوان میں مکمل سکوت چھایا ہوتا، ایک بار تقریر کے دوران انھوں نے اپنا ایک شعر سنایا تھا، جس کا ایک مصرعہ آج تک اسمبلی اور کونسل کے ایوانوں میں گونج رہا ہے، مصرعہ یہ تھا:

ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا؟

یہ شعر اس طرح ہے:

ہے چھائی نحوست چاروں طرف اے مرغ خوش الحاں کیا ہوگا
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا

آخر وہ دن بھی آہی گیا کہ اپنی تقریر سے خاموش کردینے والے، ہزاروں خوبیوں اور صفتوں سے آراستہ جگیشر پرساد خلش 27 اپریل 1980 کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے لیکن ان کی خدمات زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔

■

Dr. Shabbir Alam
Satyawati College, Delhi University
Ashok Vihar, Phase III
Delhi - 110052

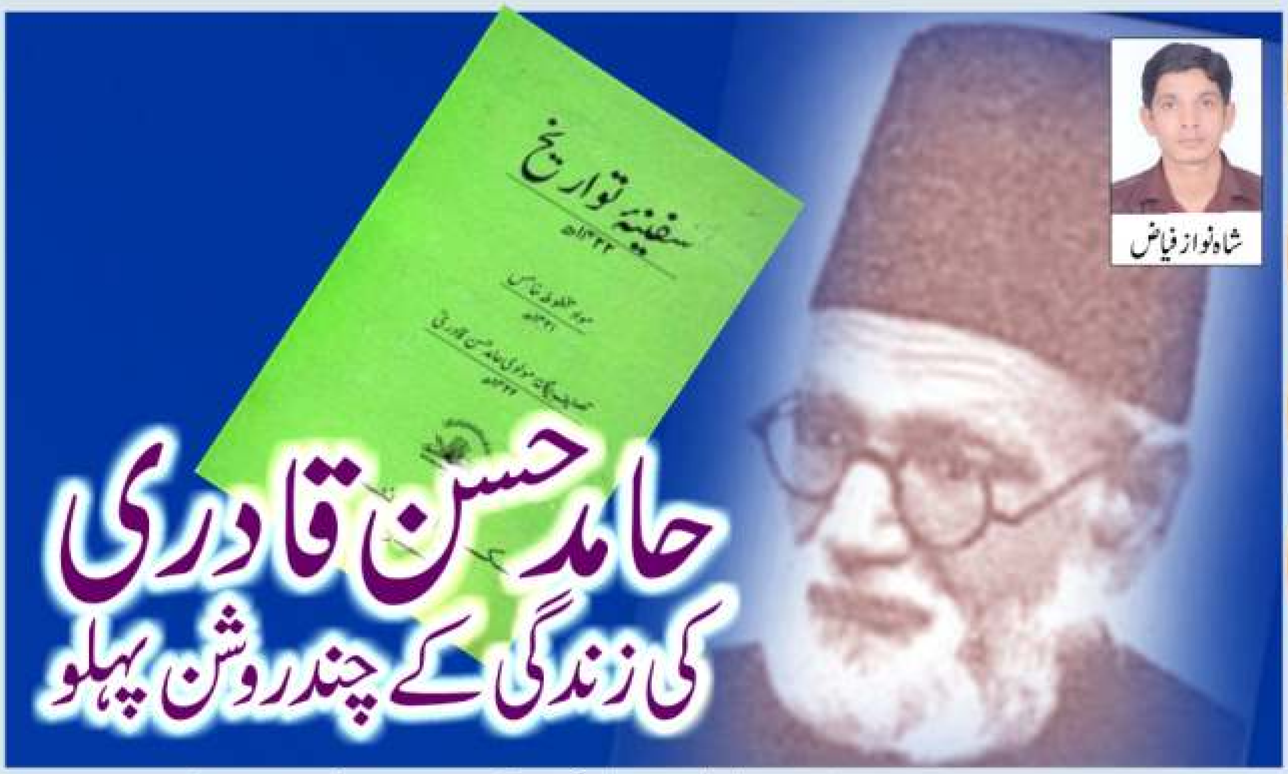

حامد حسن قادری
کی زندگی کے چند روشن پہلو

شاہ نواز فیاض

حامد حسن قادری (1964-1887) کا شمار بیسویں صدی کی ممتاز علمی و ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے علمی تبحر سے نہ صرف شعبۂ ادب کے تقریباً تمام اصناف کو متاثر کیا، بلکہ اس صدی میں تاریخ، فلسفہ اور تاریخ گوئی کی داستان بھی ان کے ذکر کے بغیر نامکمل رہے گی۔ ان کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں رامپور اور مرادآباد کی علمی، ادبی اور تہذیبی فضا کا بڑا دخل رہا ہے۔

مولانا حامد حسن قادری ضلع مرادآباد کے چھوٹے مگر پررونق قصبہ بچھراؤں کے ایک معزز علمی گھرانے میں 10 مارچ 1887 کو پیدا ہوئے۔ بچھراؤں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے، لیکن یہاں جید علماء وفضلا اور دیندار بزرگ پیدا ہوئے؛ جنھوں نے اپنی کوشش وکاوش سے علم وادب کے میدان اور شعروسخن میں نئی راہیں استوار کیں۔ بچھراؤں میں مولانا کا گھرانا ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ مولانا کے گھر میں علم وادب اور تعلیم وتعلم کا ہی چرچا رہتا۔ اس علمی فضا میں شاعری اور انشاپردازی کی طرف راغب ہونا فطری امر تھا۔

مولانا حامد حسن قادری کے ذہنی اور ادبی ارتقاء میں رام پور کی تہذیبی فضا نے اہم رول ادا کیا، چونکہ مولانا کے والد رام پور میں وکیل تھے، اس لیے آپ کی ابتدائی نشو ونما یہیں ہوئی۔ 1857 کے خونی اور ناکام انقلاب کے بعد جہاں ایک طرف دہلی اور لکھنؤ کی ادبی محفلیں اجڑ گئیں، وہیں ملک کے بعض دوسرے حصوں میں علم وادب کے نئے چراغ روشن ہوئے۔ دہلی اور لکھنؤ سے اکثر ادبا و شعرا اور باکمال اہل علم رام پور آگئے اور یہی مدتوں علم و ادب کا مرکز بھی بنا رہا۔ شعروشاعری کی محفلیں ایک بار پھر آراستہ ہوئیں اور اس وقت کے خاص سماجی اور سیاسی حالات کے تحت اردو ادب میں چند نئے موضوعات اور مخصوص انداز کا اضافہ ہوا۔ ایسے ہی ماحول میں حامد حسن قادری نے ہوش کی آنکھیں کھولیں۔ ابتدائی تعلیم 'مدرسہ عالیہ' رام پور میں حاصل کی اور اسی دوران اپنے والد صاحب سے قرآن مجید، احادیث کی بعض کتابیں اور عربی وفارسی کے قواعد سیکھے۔

دبستان لکھنؤ کے ممتاز نمائندہ شاعر امیر مینائی ان دنوں رام پور میں عدالت دیوان کے جج تھے۔ رام پور کی ادبی محفلوں میں آپ کی قادر الکلامی اور شعر گوئی کو بلند مقام حاصل تھا۔

مولانا اوائل عمری سے ہی امیر و داغ کے اشعار گنگناتے اور خوب مزے بھی لیتے تھے۔ انھوں نے منشی امتیاز احمد خاں راز جو کہ امیر مینائی کے شاگرد تھے ان سے اصلاح لی تھی۔ ان کے والد مولوی احمد حسن اور چچا پروفیسر محمد محسن فاروقی استاد عربی اسلامیہ کالج، پشاور دونوں 'بزم احباب' رام پور کے سرگرم ممبر تھے، جہاں شعروشاعری اور اخبار ورسائل کا ہی ذکر رہتا تھا۔ حامد حسن قادری کو شعرو شاعری اور مضامین لکھنے کا شوق بچپن ہی سے تھا، جیسا کہ خود اپنے ایک مضمون 'میرا کارنامہ' 'غزل' میں لکھتے ہیں:

''مجھے شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا اور اس زمانے میں شاعری کے معنی غزل گوئی کے تھے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں رام پور آیا 1900 یا 1901 میں خیال آیا کہ اپنا دیوان تصنیف کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک کاپی بنا کر الف کی ردیف سے غزل کہنی شروع کردیں............ اس میں غالباً الف، ب، پ، ت تک کی غزلیں ہیں''۔

(قومی زبان کراچی، جنوری 1966، ص 40)

حامد حسن قادری نے 1909 میں رام پور سے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ یہ امتحان مولانا نے سخت علالت کے بعد پاس کیا تھا۔ معدہ، جگر، دل اور دماغ سب ماؤف ہوگئے تھے۔ ایسے میں امتحان کی کامیابی یقیناً بڑی نعمت تھی۔ اس کے بعد 1910 میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی کا امتحان دیا اور یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن سے پاس ہوئے۔ اس کے کچھ مہینے بعد وہ اپنے چھوٹے چچا کے پاس اندور چلے گئے جو مشن کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے اور یہیں سے مولانا قادری کی معلّمی (استادی) کا دور شروع ہوتا ہے۔ ان کے چچا نے اندور کیمپ کے ایک نیم سرکاری (ریذیڈنسی) ہائی اسکول میں نوکری دلائی اور حامد حسن قادری یہاں اردو کے استاد مقرر ہوئے۔ یہاں مولانا بحیثیت اردو استاد پانچ مہینے رہے۔ لیکن مزید تعلیم کے شوق نے اس نوکری سے مستعفی ہونے پر مجبور کردیا۔

حامد حسن قادری 1911 کے اوائل ہی میں رام پور

آگئے اور کچھ مہینے بعد لاہور جا کر منشی، فاضل اور ہائی پروفیشینسی ان اردو کے امتحانات دیے۔ ابھی نتیجہ بھی نہیں آیا تھا کہ 1911 ہی میں خان بہادر عادل جی پسٹن زردشتی (پارسی) ہائی اسکول مہو چھاؤنی میں بحیثیت ہیڈ مولوی تقرر ہوگیا۔ اسی دوران دونوں امتحانات کے نتیجے آگئے، اور مولانا کامیاب بھی ہوگئے۔ مہو چھاؤنی میں ایک سال سے زیادہ مقیم رہے۔ پھر نومبر 1912 میں مولانا کا اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں بحیثیت اردو و فارسی مدرس تقرر ہوا۔ 1913 کے اواخر تک اٹاوہ ہی میں رہے۔ جنوری 1914 میں حامد حسن قادری کا تقرر فارسی لیکچرار کی حیثیت سے بڑودہ کالج میں ہوگیا۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا آپ کی صحت کو راس نہیں آئی۔ لہٰذا جنوری 1917 میں ملازمت ترک کردی، اور چند مہینے بعد وہ ہیڈ مولوی کی حیثیت سے حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور چلے گئے، جہاں مولانا قادری 1927 تک رہے۔

مولانا حامد حسن قادری جولائی 1927 سے 1945 تک سینٹ جانسن کالج آگرہ میں بحیثیت اردو و فارسی لیکچرار اپنی خدمات انجام دیتے رہے اور چھوٹے بھائی پروفیسر عابد حسن فریدی کے انتقال کے بعد صدر شعبہ ہوگئے، اسی حیثیت سے 1953 میں مولانا قادری اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئے۔

مولانا قادری نے کئی اہم علمی و ادبی کتابیں لکھیں۔ ان کی تصنیفات کا دائرہ تاریخ، تنقید، تذکرے، سوانح حیات، تبصرے، انتخاب، شاعری، تاریخ گوئی، تاریخ نویسی، افسانہ، ڈرامہ، ترجمہ، صحافت، بچوں کا ادب، خطوط نگاری اور لسانیات وغیرہ تمام شعبوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر میدان میں ان کی تصنیفات کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مضمون 'مولانا حامد حسن قادری' میں لکھا ہے:

''مولانا حامد حسن قادری معلم و ادیب تھے محقق و نقاد تھے، مورخ و تاریخ گو تھے اور علم عروض و بدیع کے ماہر تھے۔ عربی، فارسی، انگریزی، ہندی اور اردو ادب سب پر یکساں دسترس رکھتے تھے۔ مجھے پرچہ کا نام یاد نہیں آرہا، لیکن مولانا خود کہا کرتے تھے میری اولین تحریر 1903 یا 1904 میں پنجاب کے کسی پرچے میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح کم و بیش 60 سال انھوں نے اردو کی خدمت میں صرف کیا۔''

(خطوط قادری، حامد حسن قادری، فرید آرٹ پریس 1999، ص 39-338)

نومبر 1912 میں مولانا جب اٹاوہ میں بحیثیت استاد مقیم تھے تو اسی دوران انھوں نے تحقیقی اور تنقیدی مضامین و کتب کا مطالعہ شروع کردیا تھا۔ اٹاوہ کے ماحول نے ان میں جو تنقیدی اور تحقیقی مزاج پیدا کیا تھا وہ موقع پاکر ابھرا۔ یہی ماحول کئی اہم تحقیقی اور تنقیدی کتاب کی وجہ تصنیف بھی بنا جس کی بنا پر مولانا قادری ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔

مولانا حامد حسن قادری کو جس کارنامے پر شہرت دوام حاصل ہے وہ 'داستان تاریخ اردو' (1941) ہے۔ لیکن مولانا کو جس کام میں کمال حاصل تھا، وہ تاریخ گوئی ہے۔ مولانا چلتے پھرتے تاریخ کہتے۔ خوشی، غم، کسی دلچسپ واقعہ یا حادثہ کو نظم کردیتے۔ نظموں اور قطعات کی تعداد ہزاروں سے بھی زیادہ ہے۔ مولانا نے قرآن مجید کی آیت کریمہ سے جتنے تاریخی مادے نکالے ہیں، شاید ہی اتنی بڑی تعداد میں کسی دوسرے تاریخ گو نے قرآن مجید کی آیت کریمہ سے تاریخی مادے نکالے ہوں۔ اس کے متعلق مولانا خود لکھتے ہیں:

''میں نے قرآن مجید کی آیت کریمہ سے اتنی تاریخیں نکالی ہیں کہ میرے علم میں کسی دوسرے تاریخ گو سے اس قدر تعداد منقول نہیں ہے۔''

(جامع التواریخ، حامد حسن قادری، لبرٹی آرٹ پریس، 2002، ص 2)

حامد حسن قادری بلا کے تاریخ گو تھے۔ بلاشبہ ہزاروں کی تعداد میں انھوں نے تاریخیں کہی ہیں۔ اس رعایت سے ہزاروں شعر بھی موزوں ہوگئے۔ مولانا قادری کی اکثر تاریخیں ایسی ہیں جن سے اول پورا مصرع تاریخ ذہن میں آجاتا ہے، یہ سعادت معمولی نہیں۔ پھر کوئی تاریخ ایسی نہیں جس میں کوئی لطیفہ، چٹکلہ یا عجوبہ نہ ہو۔ شگفتگی اور برجستگی بلا استثناء ہر تاریخ میں ملے گی۔ اندر سے چائے لارہے ہیں، ریل میں سوار ہو رہے ہیں، وضو کر رہے ہیں، غسل خانے میں ہیں، مضمون لکھ رہے ہیں، مگر ساتھ ہی ساتھ تاریخ بھی کہہ رہے ہیں۔ مولانا کی کچھ تاریخیں مثال کے طور پر درج ذیل ہیں:

خواجہ حسن نظامی جو حامد حسن قادری کے احباب میں سے تھے، ان کا انتقال 1928 میں ہوا تو ان کی تاریخ وفات مولانا قادری نے قرآن مجید کی آیت کریمہ سے نکالی:

کل نفس ذائقة الموت: 1928

(The Oriental Rhetoric, Hamid Hasan Qadri, Bharat Offset Press, Delhi, 2003, p.no. 257)

اسی طرح سے جب امیر مینائی کا انتقال 1900 میں ہوا تو مولانا نے قرآن کریم کی سورہ والضحیٰ سے تاریخ وفات کہی۔

و للآخرة خیر لك من الاولیٰ: 1900

(دفتر تواریخ، حامد حسن قادری، لبرٹی آرٹ پریس، 2002، ص 69)

اسی طرح کے بے شمار ایسے واقعے ہیں جن کی تاریخ حامد حسن قادری نے کہی اور اس واقعے یا حادثے کو اپنی تاریخ گوئی کے ذریعے ہمیشہ کے لیے زندہ کردیا ہے۔

مولانا قادری علم عروض و بدیع کے بھی ماہر تھے اور اس موضوع پر انگریزی زبان میں ایک کتاب (The Oriental Rhetoric) لکھی، جس میں اردو، فارسی اور عربی اشعار کے ذریعے اصول و قواعد کو واضح کیا گیا ہے۔

بیسویں صدی کے ربع اول تک اردو میں بچوں کے لیے کچھ خاص نہیں کیا گیا تھا۔ مولوی اسماعیل میرٹھی نے ضرور توجہ کی تھی، لیکن وہ ضرورت کے لحاظ سے ناکافی تھی۔ اس روایت کو مولانا حامد حسن قادری نے آگے بڑھایا۔ مولانا قادری بچوں کی نفسیات کے بڑے ماہر تھے۔ استاد ہونے کی وجہ سے انھیں بچوں کی درسی، امدادی اور غیر درسی ضروریات کا بخوبی اندازہ تھا۔ نفسیات سے خاص شغف رکھنے کی بنا پر انھوں نے ایک کتاب کا انگریزی سے اردو میں 'فطرت اطفال' کے عنوان سے ترجمہ کیا تھا۔ بچوں کا اخبار 'سعید' کانپور سے نکالا۔ مولانا کا قیام کانپور میں مسلسل دس برس کے آس پاس رہا۔ انھوں نے 1918 سے یہ اخبار جاری کیا۔ اس دوران کئی اور کتابیں تصنیف کیں جو درج ذیل ہیں:

1. گم شدہ طالب علم
2. گوہر اردو: اردو کی پرائمری ریڈر
3. ستارۂ ہند
4. اختر اردو: یہ کتاب مولوی اسماعیل میرٹھی کی 'سواد اردو' کے بعد (نئی تعلیمی پالیسی کے مطابق) مدتوں نصاب میں شامل رہی۔

اسی طرح مولانا نے بچوں کے ادب پر بے شمار کتابیں لکھیں، کچھ ان کی تصنیف ہیں اور کچھ کا مولانا نے دوسری زبان سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

مولانا کو تاریخ گوئی میں جو کمال حاصل تھا وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اسی طرح سے مولانا کو رباعی میں بھی بڑا کمال حاصل تھا اور حد یہ تھی کہ مولانا نے شیخ سعدی کے مشہور نعتیہ قطعہ 'بلغ العلا بکمالہ' پر مصرع لگایا اور یہ التزام کیا ہے کہ اردو کے قافیے، عربی قافیوں کے بالکل مشابہ اور ہم آواز ہیں، غور کیجیے کہ جمالہ اور کمالہ کے طرز پر اردو کے قافیے لانا آسان نہیں۔ لیکن مولانا اس منزل سے بڑی آسانی سے گزر گئے۔ جیسے

انھیں دل جو کردیں حوالے ہی
تو کرم پھر ان کا سنبھالے ہی
انھیں جانیں جاننے والے ہی
کہ ہیں وصف ان کے نرالے ہی

بلغ العلی بکماله
کشف الدجی بجماله
حسنت جمیع خصاله
صلوا علیه و آله

(بیاض نعتیہ، حامد حسن قادری، الناصر پرنٹرز، کراچی، ص 8)

اسی طرح مولانا قادری تضمین نگاری کے محبوب مشغلے میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ اس سلسلے میں مولانا کی زیادہ توجہ غالب کی طرف ہی ہے۔ مولانا نے غالب کی بعض پوری پوری غزلوں کی تضمین کی ہے، ایک مصرع نہیں بلکہ تین تین مصرعے لگائے ہیں اور خمسہ کہا ہے۔ صرف ایک غزل کے چند اشعار کی تضمین ملاحظہ ہو۔

غالب کا شعر:

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

مولانا کی تضمین:

نام بدنام، عشق کا نہ ہوا
میں بھی شرمندۂ وفا نہ ہوا
یہ برا کیوں ہوا بھلا نہ ہوا
درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

(خطوط قادری، حامد حسن قادری، فرید آرٹ پریس 1999، ص 336)

کلام غالب کے سلسلے میں تضمین کا یہ شوق مولانا کو شروع ہی سے تھا۔ کلام غالب پر مولانا کی یہ تضمین آج کچھ زیادہ اہم نہ سمجھی جائے، لیکن اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے بہت مقبول و پسندیدہ تھیں۔ کیونکہ کہ غالب کے کسی شعر پر مسلسل غزل کے طور پر متعدد مصرعے یا اشعار لگاتے تھے۔ اور یہ اشعار غالب کے زیر تضمین شعر کی مکمل تشریح و تفصیل بن جاتے تھے۔

مولانا حامد حسن قادری کو علمی اور لسانی مباحث سے بھی دلچسپی تھی۔ عربی و فارسی کے جید عالم تھے اور جس زمانے میں ابھی مشہور بھی نہیں ہوئے تھے اور حلیم مسلم ہائی اسکول کانپور میں ہیڈ مولوی تھے، ندوۃ العلما کے ایک جلسے میں جو 1926 میں منعقد ہوا تھا 'عربی مبین' کے عنوان سے ایک مضمون پڑھا تھا۔ اس مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ لسانی دقائق پر مولانا کی کتنی گہری نظر تھی۔ بعد میں آپ کی دلچسپی تاریخ ادب، شعر و شاعری اور ادبی مباحث و تحقیق میں زیادہ بڑھ گئی۔ مولانا کی 'داستان تاریخ اردو'، 'تاریخ و تنقید' اور 'نقد و نظر' عہد ساز تخلیقات ہیں۔ لیکن تصانیف میں اور دوسرے مضامین میں بھی لسانی نکتے، اصلاح زبان اور تفحص الفاظ کے مسائل اور ان پر آپ کی تشریح، توضیح اور دقیقہ رسی کے ساتھ موتیوں کی طرح جابہ جا بکھرے ہوئے ہیں۔

حامد حسن قادری کی سب سے اہم کتاب 'داستان تاریخ اردو' ہے۔ اس کتاب کے نام میں بھی تاریخ گوئی کا بڑا عمل دخل رہا۔ کچھ لوگوں نے لفظ 'داستان' پر اعتراض بھی کیا، لیکن مولانا قادری نے اس تعلق سے لکھا ہے:

''کتاب کا نام..... 'داستان تاریخ اردو' (=1938) میں نے تاریخ گوئی کے شوق میں رکھ دیا تھا۔ بعضوں نے اس پر اعتراض کیا اور سوال اٹھایا کہ یہ 'داستان' زیادہ ہے یا 'تاریخ' زیادہ۔ لیکن اب اشاعت ثانی میں نام بدل دیا جائے تو کتاب پہچانی نہ جائے گی۔''

(داستان تاریخ اردو: حامد حسن قادری، اشاعت سوم 2007، افضال الرحمن 272، جامعہ نگر ٹیچر ٹریننگ کالج روڈ، نئی دہلی، ص 5-6)

داستان تاریخ اردو پہلی بار 1941 میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے تعلق سے کئی اہم لوگوں نے مثبت رائے کا اظہار کیا۔ نیاز فتح پوری نے اسے 'اردو کی اچھی خاصی انسائیکلو پیڈیا' سے تعبیر کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ سب نے مثبت رائے کا اظہار کیا۔ اقبال سہیل اور گیان چند جین نے اس کتاب کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حامد حسن قادری اس کتاب پر از سر نو غور کرنا چاہ رہے تھے، لیکن لوگوں نے جس طرح کی دلچسپی کا اظہار کیا، اس کی وجہ سے اشاعت ثانی کی نوبت جلد آ گئی اور مولانا قادری کا جو ارادہ تھا، وہ عملی شکل نہیں اختیار کر سکا۔

داستان تاریخ اردو میں حامد حسن قادری نے نثر کے تعلق سے گفتگو کی ہے۔ ابتدا میں اردو کے آغاز کے تعلق سے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کا بھی نظریہ پنجاب میں ہی اردو والا نظریہ ہے۔ تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب تاریخ ادب اردو میں اس لیے اہمیت کی حامل ہے کہ اردو زبان و ادب میں اس سے پہلے جو چند تاریخ زبان اردو لکھی گئی تھی، وہ اتنی بھر پور نہیں تھی، جتنی کہ داستان تاریخ اردو ہے۔ ابتدائی کام ہونے کی وجہ سے یقیناً اس کتاب میں بہت سی کمیاں ہیں، اس کے باوجود اس کی اہمیت سے کسے انکار ہے۔

کتاب کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں حامد حسن نے بے پناہ محنت کی ہو گی۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس وقت اتنی سہولیات دستیاب نہیں تھیں، جتنی کی اب ہے۔ یورپین مصنفین اردو کے تعلق سے بھی گفتگو کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جان جوشوا کٹیلر (ڈچ) اردو کا پہلا یورپین مصنف ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں حامد حسن قادری نے کس طرح کی مشکلات کا سامنا کیا ہوگا۔ اس کتاب کی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مصنفین کی کتابوں کے تعلق سے گفتگو کی ہے اور تحریر کو نمونہ کے طور پر پیش بھی کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حامد حسن قادری نے اصل ماخذ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے سید ناصر نذیر فراق دہلوی تک کے مصنفین کا احاطہ کیا گیا ہے۔ قارئین کی آسانی کے لیے چھ دور میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ آخری دور غدر کے بعد کا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی تالیف سے پہلے مواد اکٹھا کیا تھا، اس کے بعد لکھنا شروع کیا۔ حامد حسن قادری کی سب سے اہم کتاب داستان تاریخ اردو ہی ہے۔ جب بھی تاریخ ادب اردو کا ذکر ہوگا، حامد حسن قادری کی اس کتاب سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا قادری 1953 کو سینٹ جانسن کالج، آگرہ سے ریٹائر ہوئے اور 1954 میں کراچی (پاکستان) چلے گئے۔ زندگی کے آخری وقت تک مولانا کا قیام وہیں رہا۔ بچوں کی محبت اور ان کے اصرار پر مولانا قادری ہندوستان سے پاکستان گئے۔ لیکن مولانا کی یہ حسرت مکمل طور پر پوری نہ ہو سکی کہ وہ اپنے سارے بچوں کے ساتھ زندگی کے باقی دن گزار سکیں۔ کیونکہ تلاش معاش کے سلسلے میں بچوں کو دوسرے ملکوں کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ 6 جون 1964 کو مولانا قادری اس دنیائے فانی سے ہمیشہ کے لیے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا قادری کے یہ کارنامے اردو زبان و ادب میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ حامد حسن قادری کی بہت ساری کتابیں، خاص طور سے ادب اطفال کے حوالے سے جو معروف ہیں، وہ اب نایاب ہیں۔ اس کے لیے جناب افضال الرحمن صاحب قابل مبارکباد ہیں، کہ انھوں نے مولانا قادری کی بہت ساری کتابوں کی از سر نو اشاعت کی ہے۔ کچھ اشاعت کے مرحلے میں ہیں، جو یقیناً ایک بڑا کام ہے۔ کسی نے کہا تھا، جو قادری صاحب کی صحیح ترجمانی کرتا ہے:

اسی کو ناقدری عالم کا صلہ کہتے ہیں
مرگئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

■

Dr. Shahnewaz Faiyaz
H.No.: 1262 Zubaida Building
Near Aoliya Masjid Ghaibi Nagar
Bhiwandi - 421302 Thane, (Maharashtra)
Mob.:09891438766

نفسیاتی تغیرات اور سماج و ادب پر ان کے اثرات

محمد مستمر

نفسیات کا موضوع جس قدر الجھا ہوا، پیچیدہ اور گنجلک ہے اسی قدر دلچسپ بھی ہے۔ علم نفسیات جسے ہم انسان کے کردار، اعمال وافعال اور حرکات وسکنات سے تعبیر کرتے ہیں جس میں ہماری حس، توجہ اور ادراک کے امتزاج کو دخل حاصل ہے۔ اور جب یہ امتزاجی زاویۂ مثلث قائم ہوتا ہے تو ہمارے لاشعور کو مہیج کے ذریعے توانائی حاصل ہوتی ہے، ایسی توانائی جو لہروں کی شکل میں ہمارے تمام اعصابی نظام میں ہلچل پیدا کرتی ہے۔ پھر یہیں سے شروع ہوتا ہے لاشعور، قبل شعور اور شعور سے ہوتا ہوا، نفس امارہ، نفسِ مطمئنہ، نفسِ لوامہ یا اڈ، انا اور فوق الانا جسے ہم ضمیر سے بھی تعبیر کرتے ہیں، کے بیچ جدلیاتی عمل کا سلسلہ، جو ہمیں مختلف سمتوں کا سفر کراتا ہے، بزم آرائیوں کی سیر کراتا ہے۔ منفی ومثبت نظریات سے متعلق فکر کی کیفیت پیدا کرتا ہے نیز یہ جدلیاتی عمل کا سلسلہ بعض وقت اتنا مضر ومہلک ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔

ویسے تو بنیادی طور پر ہر انسان چاہے وہ خواندہ ہو یا ناخواندہ، نفسی پہلوؤں اور زاویوں سے واقف ہوتا ہے۔ کیوں کہ جب تک ایک باشعور آدمی نفسی پہلوؤں سے واقف نہ ہوگا وہ اپنی زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھا ہی نہیں سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ نفسیات کی زبان اور نفسی پہلوؤں کو طبی اور سائنسی نقطۂ نگاہ سے نہ سمجھتا ہو۔ کون ایسا باشعور انسان ہے جو اپنے سامنے والے شخص کی حرکات و سکنات اور اعمال وافعال سے یہ اندازہ نہ لگائے کہ یہ شخص کس شے کا خواہاں ہے ...؟ اس سلسلے میں حواس خمسہ سب سے معاون ہوتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کا 'چہرے کو پڑھنے' کا عمل بہت تیز ہوتا ہے تو بعض وقت ان کا قیاس صدفی صد سچ پر محمول ہوتا ہے۔ ژونگ اس طرح کے حسی عمل کو انتقال خیال (Telepathy) سے تعبیر کرتا ہے اور چھٹی حس کا نام دیتا ہے۔ انتقال خیال کا یہ عمل جرائم کے معاملوں میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اسی نفسیاتی وحسی عمل سے پولس والے یا خفیہ شعبہ والے اصل مجرم کو پہچاننے میں کافی حد تک کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جبکہ علم نفسیات سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ جو شخص سماج میں رہتا ہے، وہ بھلے ہی علم نفسیات سے واقفیت نہ رکھتا ہو۔ انسان اپنے مشاہدات و تجربات کی بنیاد پر وہ باتیں سیکھ لیتا ہے جن کا راست تعلق علمِ نفسیات سے ہوتا ہے۔ انسان اپنی حس، توجہ اور ادراک کے امتزاجی زاویۂ مثلث کے باعث تجربات و مشاہدات کی روشنی میں، ان پڑھ ہونے کے باوجود بھی زندگی کے ایسے اصول قائم کر جاتا ہے جو آئندہ کے لیے مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسانی اعمال وافعال اور نشست و برخاست سے واقفیت وادراک رکھنا استثنائی نوعیت کا عمل ہے۔ جب علم نفسیات سے واقف کار کسی بھی میدان میں قسمت آزمائی کرے گا تو وہ اس میدان میں ایک ناواقف کار کی بہ نسبت کارہائے نمایاں انجام دے گا کیونکہ نفسیات وہ علم ہے جس نے زندگی کے تمام شعبوں اور میدانوں کو کسی نہ کسی روپ میں متاثر کیا ہے اور ان پر اپنے اثرات مرتسم کیے ہیں۔

فرائڈ جسے نفسیات کا امام کہا جاتا ہے، اس نے انسانی ذہن کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، لاشعور، قبل

شعور اور شعور۔ لاشعور ذہن کا وہ حصہ ہے جہاں بچپن کا تمام مواد جمع رہتا ہے۔ جس کے متعلق انسان کو خود بھی اس کا علم نہیں ہوتا ہے اور یہ مواد ہمارے تجربات، خواہشات اور تمناؤں کی شکل میں اندوختہ ہوتا رہتا ہے۔ نیز اسے کسی بھی کوشش کے ذریعے شعور میں لایا جا سکتا ہے۔ شعور کا تعلق زمانہ حال سے ہوتا ہے یعنی جو کچھ انسان کے سامنے موجود ہے وہ سب اس کے شعور سے تعلق رکھتے ہیں۔ شعوری تجربات میں حس، توجہ، ادراک، حافظہ، جذبہ نیز حرکات وسکنات، اعمال و افعال اور فکر بھی کا امتزاج شامل رہتا ہے۔ قبل شعور کا جو تعلق ہے وہ ہمارے نسیان کے اوپر منحصر ہے یعنی ہم کچھ دیر کے لیے کوئی بات بھول گئے، لیکن ذہن پر تھوڑا زور ڈالنے پر وہ ہمارے شعور میں واپس آ جاتی ہے۔ چنانچہ انسانی ذہن کے ان تینوں حصوں کی تحقیق کے علم کو نفسیات کہا جاتا ہے۔ لیکن جوں جوں اس کے تجربات کے دامن میں وسعت اور کشادگی آتی گئی، تو اس کے ساتھ ایک اور اساسی نظریہ بھی قائم ہو گیا نیز ان تین ناموں کے ساتھ تین ناموں کو اور شامل کر دیا یا تحلیل کر دیا۔ یعنی اڈ (Id)، انا (Ego)، فوق الانا (super Ego)، ان تینوں کا تعلق بھی انسانی ذہن سے ہے اور ان کی خصوصیات بھی لاشعور، قبل شعور اور شعور سے مماثلت رکھتی ہیں۔ چنانچہ انسان کے ذہنی محرکات اور اعمال و افعال کے مشاہدے اور تجربے انہیں تین حصوں کی روشنی میں کیے جاتے ہیں۔ اور یہیں سے تحلیلِ نفسی یا ترکیبِ نفس کے پیچ وخم کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اور اس علم نفسیات کے پیچ وخم کے تناظر میں ہی انسانی حرکات وسکنات اور خارجی و داخلی افعال جیسے نرگسیت، خواہشات، ارتقائے شہوانیت، جنسی تہیجات و ہیجانات، آبائی الجھاؤ، خواب خرامی، اعصابی بیماریاں وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے بعد نتیجے اخذ کیے جاتے ہیں۔

نفسیات کا تعلق ذہن و دماغ سے ہے۔ یعنی یہ ایک ذہنی علم ہے اور ذہنی علم ہونے کے موجب اس کا منفی یا مثبت اثر کسی نہ کسی صورت میں علم کے ہر شعبے پر پڑتا ہے۔ چنانچہ ہم اس کی اہمیت و افادیت کو کسی بھی طور سے نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔ خاص طور سے جو لوگ ذہنی و دماغی اور طبیعاتی امراض کی زد میں ہیں، وہاں تو علم نفسیات کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ اس سے قبل کہ ہم نفسیات کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کریں یہ بات غور طلب رہے کہ فرائڈ سے پہلے انسان کا مطالعہ کرنے والوں میں ماہرین اعصاب، ماہرین نفسیات اور نفسی نباض شامل نہ تھے۔ بہر کیف فرائڈ کے بعد اس طرف کافی توجہ دی جانے لگی۔ گوائیڈلر، ژونگ، وارن، ڈریور ہابس، لاک، ہاٹلے، تھمائر، کوہلر، بینے، سائمن، میکڈوگل، مورگینس دی سادے، ایرکبرے، واٹسن جیمس لانگے، سر کھائم، کولے، گال سپر ژیم، جی ایچ میڈ، ہیڈن، ہیرنگ اور دیگر ماہرین نے اپنے اپنے نظریات سے علم نفسیات کی اہمیت کو متعارف کرایا۔

آج ہم بلا تامل وتردد اور شک وشبہ کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ جیسے جیسے سائنس نے ترقی کی ہے علم نفسیات نے بھی بہت سے علوم وفنون کو متاثر کیا ہے۔ پہلے علم نفسیات کو سائنس سے استثنا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے ماہرین اس کی اہمیت و افادیت سے واقف ہوئے تو تحلیلِ نفسی کو علم الاجسام یا علم طبیعات بلکہ سائنس کی ہی ایک شاخ مانا ہے۔ اس کے تحت اجسام کے تغیر و تبدل اور ان کی خاصیت نیز انسان کے ذہنی محرکات اور ان کے متعلق روز مرہ کے اعمال و افعال کا مشاہدہ اور تجربہ کیا جاتا ہے۔

جو لوگ ذہنی و دماغی اور طبیعاتی امراض کی زدمیں ہیں، وہاں تو علم نفسیات کے بغیر چارہ ہی نہیں ہے۔ اس سے قبل کہ ہم نفسیات کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کریں یہ بات غور طلب رہے کہ فرائڈ سے پہلے انسان کا مطالعہ کرنے والوں میں ماہرین اعصاب، ماہرین نفسیات اور نفسی نباض شامل نہ تھے۔ بہر کیف فرائڈ کے بعد اس طرف کافی توجہ دی جانے لگی۔ گوائڈ لر، ژونگ، وارن، ڈریورھابس، لاک، ہاٹلے، تھمائر، کوہلر، بینے، سائمن، میکڈوگل، مورگینس دی سادے، ایرکبرے، واٹسن جیمس لانگے، سر کھائم، کولے، گال سپر ژیم، جی ایچ میڈ، ہیڈن، ہیرنگ اور دیگر ماہرین نے اپنے اپنے نظریات سے علم نفسیات کی اہمیت کو متعارف کرایا۔

الغرض ہم تحلیل نفسی یا علم نفسیات کی سماجی اور سائنسی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے اور یہ ہمارے روز مرہ کی زندگی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ اگر ہم واقعی اپنی آنکھوں پر سے قدامت پسندی، دقیانوسی اندھی تقلید کی عینک اتار کر پھینک دیں اور علم نفسیات سے بخوبی آگہی حاصل کر لیں تو ہم بہت سی بیماریوں سے چھٹکارا پا سکتے ہیں اور اپنی گھریلو اور ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنا سکتے ہیں۔

بات چاہے زمانہ حجر کی ہو، یا زمانہ جاہلیت کی یا زمانہ ویدانت کی، ہندستان کی ہو یا کسی دوسرے ملک کی، مشرق کی ہو یا مغرب کی۔ حیوانِ ناطق میں ہمیشہ سے ہی دلچسپی اور انسیت کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ یہ دلچسپی کسی بھی نوعیت کی رہی ہو، چاہے وہ دوستی سے وابستہ ہو، یا عشق سے، یا کاروبار کے تعلق سے، یا کاشت کاری سے، یا ایک مالک کی اپنے مزدور یا مزدور کی اپنے مالک سے، یا والدین کی اولاد سے، یا ایک صنف نازک کی صنف قوی سے، یا بچے کی اپنے ماں باپ سے۔ مگر اس دلچسپی میں ایک انسان دوسرے انسان کا اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی نیز حس، توجہ، ادراک کے باہمی امتزاج کے تناظر میں نفس کا مطالعہ کرتا رہا ہے۔ لیکن نفس کے اس مطالعہ و جائزہ میں اسے ترقی کے دور سے گزرتے ہوئے صدیاں گزر گئیں۔ انسان نے اپنے ابتدائی دور میں پہلے علامتوں، اشاروں سے کام لیا جس میں سب سے پہلے اس کی ارتقائی منزل میں باہمی حرکات وسکنات اور اعمال و افعال ہی شامل تھے کہ وہ ایک دوسرے کی باتوں اور اغراض و مقاصد کو سمجھتے تھے اور بعض دفعہ تو چہرے کے تاثرات سے بھی اس نے ایک دوسرے کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ یہ نفسیاتی عمل اور نفسی مداخلت ابتدا سے ہی انسان کے ساتھ پیوست ہے، جب یہ تہذیبی دور سے گھٹنوں کے بل چلنا سیکھ رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ انسان دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں میں آباد ہوتا گیا اور اس کے لسانی ارتقا کا دور شروع ہوا۔ مختلف خطوں اور علاقوں میں بسنے، مختلف زبانیں بولنے اور مختلف آب و ہوا کے تحت انسان کی نفسیات میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔

چنانچہ انسان کے بننے اور سنورنے اور مہذب ہونے میں صدیاں گزر گئیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان کی سائیکی اور نفسیاتی پہلوؤں کو سمجھنے میں سب سے پہلے پیغمبروں اور اوتاروں کا دخل رہا ہے۔ آسمانی کتابوں، صحیفوں، ویدوں اور شاستروں میں بھی تحلیل نفسی کے پیچ وخم کے مکتبۂ فکر کو مختلف انداز، پند و نصیحت، علامتوں اور کنایوں سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ نفس یا ذہن سے متعلق وہ تمام نظریات مل جاتے ہیں جن کی بنیاد فرائڈ نے ڈالی یا دوسرے ماہرین نفسیات نے اپنے نظریات قائم کیے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے مذہبی کتابوں کو نفسیاتی

تناظر میں فرائڈ یا دوسرے ماہرین نفسیات سے قبل دیکھنے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی اوران کتب سے استفادہ نہیں کیا۔ یا ہم نے مذہب، فلسفہ سائنس یا ادب کو الگ الگ خانوں اور زمروں میں رکھا اور جو ہم آہنگی پیدا ہونی چاہیے تھی، وہ نہ ہوسکی جس کی وجہ یہ رہی کہ الگ الگ مکتبۂ فکر کے لوگ تنگ نظری کے شکار رہے۔اور انسان کے شخصی پہلوؤں کو مختلف مکتبۂ فکر کے لوگ جن مختلف زاویوں سے کھنگالنا چاہتے تھے وہ مکمل طور سے اس میں کامیابی حاصل نہ کرسکے۔ دوسری وجہ یہ رہی کہ جیسا کہ کپلنگ نے کہا تھا مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب ہے یعنی انسان کے پاس ترسیل وابلاغ، آمد ورفت کے وسائل کا فقدان تھا جس کے باعث ایک ملک دوسرے ملک سے، ایک تاریخ دوسری تاریخ سے، ایک تہذیب و ثقافت دوسری تہذیب وثقافت، رسم ورواج، رہن سہن، ادب اور دیگر علوم وفنوں سے واقف نہیں تھے۔ نفسیات کو جس وسعت ومعنویت کے ساتھ سمجھنا چاہیے تھا، اس کی ضرورت نہ سمجھی اور یہ فلسفے کا ہی ایک حصہ بنا رہا۔ لیکن اب نفسیات کو سائنس کی ایک الگ شاخ کے طور سے جانا جاتا ہے۔

آہستہ آہستہ نفسیات کی تعبیر وتفہیم اوراس کی معنویت واہمیت کو سمجھا جانے لگا سب سے پہلے نفسیات کو سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے والوں میں فرائڈ کا نام پیش پیش ہے، جسے نفسیات کا امام کہا جاتا ہے۔ اس نے نفسیات اور انسانی ذہن کو منطقی پہلو سے پیش کیا اور اپنے نظریات دنیا کے سامنے پیش کیے۔ اس نے اپنی سب سے پہلی تخلیق Studies in Hystyria میں تحلیل نفسی سے متعلق نظریات پیش کیے۔ اس کتاب کی سب سے دلچسپ بات یہ رہی کہ اس نے تحلیل نفسی کے پہلوؤں اورنکات کو ادب کے تناظر میں پہچاننے کی سعی کی۔ اسی لیے وہ خود کہتا ہے کہ اگر وہ ماہر نفسیات نہ ہوتا تو ناول نگار ضرور ہوتا۔ ادب سے فرائڈ کی گہری دلچسپی تھی اس نے ہملٹ اور شیکسپیئر کے ادب کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ اس نے پوری دنیا کو اس بات سے آگاہی حاصل کرائی کہ انسانی زندگی کے تمام پہلو لاشعوری محرکات کے تابع ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ فرائڈ سے قبل ہمارے فنکار، شاعراور ادیب لاشعوری واجتماعی لاشعوری نظام سے واقف نہیں تھے۔ چاہے وہ مغربی فنکار ہوں یا مشرقی فنکار، اس سلسلے میں اساسی پہلو اور تکنیکی نظریہ یہ رہا کہ انھوں نے باضابطہ طور سے تحلیل نفسی یا نفسیاتی پیچ وخم کو طبی وسائنسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی منظم طور سے مفروضات قائم کیے جو نفسی مکتبۂ فکر کی غمازی کرتے۔ وہ اپنے فن پاروں میں شعور، وجدان، جنون، خبط، مراق، خواب، وہم، افسردگی، پژمردگی، تشویش اور نفس امارہ، نفس مطمئنہ، نفس لوامہ وغیرہ جیسے الفاظ سے تو استفادہ کرتے رہے لیکن باقاعدہ طور سے ایک دبستان کی شکل میں انھوں نے نفسیات کی اصطلاحات کو رواج نہ دیا۔ فرائڈ کی وجہ سے مغرب کے ساتھ مشرق اور بالخصوص اردو نقادوں نے بھی ادب اور نفسیات کے باہمی رشتہ اور تطبیق کے پیش نظر نفسیاتی تنقید کی بنیاد ڈالی تو اردو ادب میں بھی غالب، میر، اقبال جیسے شاعروں کے کلام کو نفسیاتی رو سے سمجھنے اور کھنگالنے کی سعی پیہم کی جانے لگی۔

فرائڈ کی تحلیل نفسی میں میراجی کو اہم مقام حاصل ہے۔'اس نظم میں'ان کے نفسیاتی رجحان اور اس مکتبۂ فکر سے وابستہ ادب اور نفسیات کے باہمی رشتے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ میراجی سے پہلے شبلی کا ایک مضمون'' ہمارے شاعروں کی نفسیات'' نفسیاتی پہلوؤں کی غمازی کرتا ہے۔ بعد ازاں مرزا ہادی رسوا نے ادب کو تحلیل نفسی کے تناظر میں پرکھنے کی کوشش کی۔ اور ایک دور وہ آیا جب ہمارے نقادوں نے اردو شاعری، اردو ادب کو جمالیاتی، تاثراتی اور رومانی حد بندیوں سے نکال کر نفسیاتی رو سے سمجھنے کی کوشش کی اور یہ پتا لگانے کی سعی کی کہ کن حالات اور وجوہ کے تحت فن پارے کی تخلیق ہوئی اور لاشعوری محرکات تخلیق کا سبب بنے۔ نیز لاشعوری تہہ میں وہ کون سے عناصر کارفرما تھے جو تخلیقی ظہور میں ممد ثابت ہوئے۔ چنانچہ اردو نقاد نفسیاتی دبستان میں اپنی جولانیاں دکھانے لگے۔ اس طرح ریاض احمد نے تنقید کا نفسیاتی دبستان، شبیہ الحسن نے غزل اور لاشعور، دیوندر اسر نے ادب اور نفسیات، شکیل الرحمان نے نفسیات اور شعور، تنقیدی شعور، لکھ کر ادب کو نفسیات سے ہم آہنگ کیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیات اور ادب کے باہمی رشتے کو استوار کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے نفسیات اور ادب کے حوالے سے بہت لکھا ہے، جن میں ان کی بے لاگ اور اچھوتی تحریریں ادب اور نفسیات کے باہمی رشتے میں مطابقت ہی پیدا نہیں کرتیں بلکہ ان کی تخلیقات ایسے نفسی و جنسی گوشوں اور پہلوؤں کو محیط ہیں جن کا تعلق انسانی زندگی وادب سے ہے۔ ان کی نفسیاتی کتابوں میں اقبال کا نفسیاتی مطالعہ، ادب اور لاشعور، اقبال اور ہمارے فکری رویے، تخلیق اور لاشعوری محرکات، اور شعور و لاشعور کا شاعر غالب، شامل ہیں۔

جیسے جیسے زمانہ بدلتا رہا، اسی طریقے سے ادب بھی سماجی اور معاشرتی اثرات قبول کرتا رہا۔ بہت سے رجحانات، تحریکات جنم لیتی رہیں اور ان رجحانات اور تحریکات کے عروج وزوال کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ ایک رجحان کا زوال ہوا تو دوسرے نظریے نے بھی اپنے وجود کا احساس کرایا۔ احساس ہی نہیں کرایا بلکہ سماج نے اس طرح اسے اپنے سینے سے لگایا کہ ادب نے بھی اس قدر اثرات قبول کیے کہ شدت کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ پھر اس کے تئیں انحراف کا سلسلہ شروع ہوا اور اس انحراف نے سماج وادب کو نئے پہلو سے روشناس کرایا۔ نیز گردش زمانہ اور انقلاب کے تحت نظریات، خیالات ورجحانات کے ہست ونیست کا سلسلہ چلتا رہا۔ افسانے کی سو سالہ تاریخ جو پوری ایک

آہستہ آہستہ نفسیات کی تعبیر و تفہیم اور اس کی معنویت و اہمیت کو سمجھا جانے لگا سب سے پہلے نفسیات کو سائنسی نقطۂ نظر سے سمجھنے والوں میں فرائڈ کا نام پیش پیش ہے، جسے نفسیات کا امام کہا جاتا ہے۔ اس نے نفسیات اور انسانی ذہن کو منطقی پہلو سے پیش کیا اور اپنے نظریات دنیا کے سامنے پیش کیے۔ اس نے اپنی سب سے پہلی تخلیق Studies in Hystyria میں تحلیل نفسی سے متعلق نظریات پیش کیے۔ اس کتاب کی سب سے دلچسپ بات یہ رہی کہ اس نے تحلیل نفسی کے پہلوؤں اورنکات کو ادب کے تناظر میں پہچاننے کی سعی کی۔ اسی لیے وہ خود کہتا ہے کہ اگر وہ ماہر نفسیات نہ ہوتا تو ناول نگار ضرور ہوتا۔ ادب سے فرائڈ کی گہری دلچسپی تھی اس نے ہملٹ اور شیکسپیئر کے ادب کا خوب مطالعہ کیا تھا

صدی کا احاطہ کرتے ہوئے آگے کی طرف گامزن ہے، جب ہم ادوار کے حساب سے پورے ادبی منظرنامے پر غور کرتے ہیں تو ادب میں بہت سی تبدیلیاں دیکھتے ہیں۔ جیسے سماج دگرگوں ہوا، ادب نے بھی اسی تغیر ہوتے تناظر میں وہ اثرات قبول کیے۔

ابتدا سے 1936 تک کے افسانوی ادب پر عمیق نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت ہمارے افسانہ نگاروں نے انہی مسائل وموضوعات کو اپنے افسانوں کا حصہ بنایا اور وہی کردار پیش کیے جو اپنے دور کے ترجمان ہیں اور اپنے سماج سے مطابقت رکھتے ہیں۔ منشی پریم چند ہوں یا سلطان حیدر جوش، علی عباس حسینی ہوں یا سجاد حیدر یلدرم، علامہ راشد الخیری ہوں یا محمد علی ردولوی، سب کے

یہاں وہی کردار، وہی مسائل و موضوعات پیش ہوئے ہیں جن کا براہ راست تعلق سماج اور معاشرے سے تھا۔ وہی سرمایہ دارانہ نظام، نوابین، ملازمین، خادمائیں، کسان مزدور، زمیندار، ساہوکار اور آمریت پسند شخصیتیں اور ان آمریت پسند شخصیتوں کے زیر اثر معاشی، اقتصادی غلبہ اور مغلوب و مظلومانہ جیسے نفسیاتی پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ساتھ ہی جو نفسی و جنسی کیفیتوں کی کارفرمائی ہے تو وہ انہی کرداروں سے زیادہ تر وابستہ ہے جن کا تعلق امرأ، روسا طبقے سے ہے۔ اس وقت کے فنکاروں نے مشرقی نفسیات کو خاص طور سے اپنے فن پاروں میں جگہ دی ہے۔ 1936 کے بعد ترقی پسند تحریک کا دور 1947 تک رہا، ویسے تو اس کے اثرات 1960 تک باقی رہے مگر دس سال تک اس کا پورا اثر قائم رہا۔ اس دور میں ادب نے کارل مارکس اور لینن کی تھیوری کو پورے طریقے سے قبول کیا اور کارل مارکس کے زیرِ اثر ہی ادب نے نفسیاتی عناصر سے ہم آہنگی پیدا کی۔ 1948 سے 1960 کا دور اپنے آپ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ملک، سماج اور ادب سب دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ اس مابین جو مسائل، موضوعات اور وقوعات رونما ہوئے اس سے نہ صرف ادب میں ہی نئے موضوعات و مسائل میں اضافہ ہوا بلکہ انسان کی سائیکی میں بھی حیرت انگیز تغیر ہوا اور نفسیات سے متعلق مختلف قسم کے پہلو ابھر کر سامنے آئے جنھوں نے ذہنی، جسمانی اور اعصابی طور سے انسان کو اپنی زد میں لیا۔ 1961 سے 1985 تک کا دور میکانگی اور سائنسی انقلاب کے دور سے جانا جاتا ہے۔ اس ربع صدی میں انسان کے ارتقا کا وہ سفر شروع ہوا جس میں مادیت پرستی، خودغرضی، شہری پلاننگ، آہستہ آہستہ تہذیبی اقدار کا زوال، مشرق و مغرب کے بیچ مٹتے ہوئے فاصلے، مغربی کلچر کے مشرقی ثقافت پر مرتسم ہوتے منفی اثرات، مشترکہ خاندانوں کا زوال وغیرہ اشوز نے کروٹ لینی شروع کی۔ اور 1986 سے 2008 تک آتے آتے پورے یونیورسل سسٹم میں ایسا انسانی مدوجزر آیا کہ دنیا کی سائیکی فرائڈ، ایڈلر، ہانس شاس، میکڈوگل، بینے، سائمن وغیرہ کی ٹیکنالوجی تھیوری اور کپلنگ کے قول (East is east, West is west) مسترد ہوکے، بہت آگے نکل چکی ہے۔ اب اس میں نت نئے نظریات داخل ہو رہے ہیں۔ اب کپلنگ جیسے مفکروں اور فلسفیوں کے قول مسترد ہو چکے ہیں۔ نیز آج کے سائنسی اور میکانگی دور میں پوری دنیا، پورا یونیورسل سسٹم گلوبل ویلیج میں بدل چکا ہے۔ آج مشرق و مغرب اور شمال و جنوب ایک محور پر آکر مرکوز ہوگئے ہیں۔ تہذیبیں، قومیں، ثقافتیں، رسم و رواج، تیج تہوار، اس طرح ایک دوسرے میں ضم اور مخلوط ہوگئے ہیں۔ معاشرے میں ایسے نظریات جنم لے چکے ہیں جو معیوب اور گناہ عظیم مانے جاتے تھے۔ جس کا عکس ہمیں ہم جنسیت اور اسلڈ اذ بائنس جیسی تھیوری میں نظر آرہا ہے۔ پرستان و کوہ قاف کی کہانیوں کو ویب نیٹ نے حقیقت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اولاد ماں باپ، میاں بیوی، بھائی بہن سب کے رشتوں میں ایسے نفسی بدلاؤ رونما ہوئے ہیں جن کو سن کر حیرت سے آنکھیں چار ہوتی ہیں اور انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

نفسیات کے دامن میں کافی پھیلاؤ آیا ہے اور اس نے دوسرے شعبہ ہائے اور مکتبہ ہائے فکر کو متاثر کیا ہے۔ اگر دیگر علوم و فنون اس سے کنارہ کشی اختیار کرلیں تو وہ اپنے فکری میدان میں مکمل طور سے کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔ چاہے وہ ادبیات ہو، جمالیات ہو، اخلاقیات ہو، لسانیات ہو یا معلم کی تربیت ہو، نفسیات نے کسی نہ کسی صورت میں ان پر اپنا رنگ جمایا ہے۔ علاوہ ازیں بھی آج کے تکنیکی اور میکانگی دور میں اور تقابلی میدان میں جس طرح علم نے ترقی کی ہے اور بہت سے نئے علوم و فنون نے جنم لیا ہے۔ جیسے جرنلزم اینڈ ماس کمیونیکیشن، فلم میڈیا وغیرہ، نفسیات نے ان پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ جہاں تک فلموں کا تعلق ہے، ایک ہدایت کار کے لیے یہ امر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص فن کے ساتھ ایک ماہرِ نفسیات بھی ہو۔ اگر وہ سماج کی نفسیات اور تغیر و تبدل ہوتے ہوئے معاشرے اور اس کی دلچسپی سے واقف نہ ہوگا تو اس کی ہدایت کاری میں بننے والی فلم کی کامیابی کے بہت کم امکان ہوں گے۔ اگر ہم ہندی فلموں پر ایک نظر بھی ڈالیں تو یہ المیہ صاف طور سے نظر آئے گا کہ جنھوں نے سماج کے مزاج کے برعکس فلمیں بنائیں انھوں نے پردۂ سیمیں پر ناکامی کا منہ دیکھا۔

علم اقتصادیات و معاشیات کو بھی ہم علم نفسیات سے استثنیٰ نہیں کر سکتے اگر ایک ایکونومسٹ بازار کے مزاج، ماحول، گاہکوں اور کاشت کاری کے تناسب اور توازن سے صحیح طور طریقے سے واقف نہیں ہوگا تو وہ خسارے میں رہے گا اور ان سب کا تعلق علم نفسیات سے ہے۔ چنانچہ مجموعی طور سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم نفسیات کا میدان محدود نہیں ہے۔ الغرض یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ 2000 کے بعد جس تیزی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے، یہاں تک کہ جھگی جھونپڑیوں، دیہات میں بسنے والوں، اور آدی باسیوں کو نفسیات تک نے متاثر کیا ہے، گذشتہ ایک صدی میں اتنی حیرت انگیز تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں اور نہ ہی اتنی تیزی کے ساتھ انسان کی سائیکی نے کروٹ لی تھی، جس کی بنیادی وجہ پورے یونیورسل کا سائنسی و تکنیکی سہولیات کے توسل سے گلوبل ویلیج میں تبدیل ہو جانا ہے اور اس بدلتے ماحول، سائیکی سے ہمارے فنکار خوب استفادہ کر رہے ہیں۔ نیز جو کردار چاہے وہ بچے کا ہو، عورت کا ہو، بزرگ مرد کا ہو یا بزرگ عورت کا ہو، اپنے پچھلے سابقہ کرداروں سے نفسیاتی اعتبار سے بالکل مختلف روپ میں رونما ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب کے بچے عیدگاہ، بھولا، سوت کا ریشم، اجنبی، اور پرمیشر سنگھ افسانوں کے بچے نہیں ہیں۔ ان میں اب وہ طفلانہ معصومیت اور بھولا پن نہیں۔ آج کا بچہ، منٹو کے بچوں سے بھی کہیں آگے نکل چکا ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی غور طلب ہے کہ انسان جس علاقے، خطے، ماحول میں رہتا ہے اسی اعتبار سے اس کی نفسیات بھی مختلف ہوتی ہے۔ گاؤں میں رہنے والے شہر میں بسنے والے، اور مہانگر میں سکونت اختیار کرنے والے اور مختلف طبقات کی نفسیات ایک دوسرے سے الگ ہوگی۔

اس دور میں ادب نے کارل مارکس اور لینن کی تھیوری کو پورے طریقے سے قبول کیا اور کارل مارکس کے زیر اثر ہی ادب نے نفسیاتی عناصر سے ہم آہنگی پیدا کی۔ 1948 سے 1960 کا دور اپنے آپ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ملک، سماج اور ادب سب دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ اس مابین جو مسائل، موضوعات اور وقوعات رونما ہوئے اس سے نہ صرف ادب میں ہی نئے موضوعات و مسائل میں اضافہ ہوا بلکہ انسان کی سائیکی میں بھی حیرت انگیز تغیر ہوا اور نفسیات سے متعلق مختلف قسم کے پہلوابھر کر سامنے آئے جنھوں نے ذہنی، جسمانی اور اعصابی طور سے انسان کو اپنی زد میں لیا۔ 1961 سے 1985 تک کا دور میکانکی اور سائنسی انقلاب کے دور سے جانا جاتا ہے۔

■

Dr. Mohd Mustamir
Haryana Urdu Akademi
IP-16, Sector-14, Panchkula - 134113 (Haryana)
Mob.:09023746092

محمد زاہد

بنگال میں اردو صحافت

18 ویں صدی عیسوی میں مغلیہ سلطنت کے رفتہ رفتہ کمزور ہونے کے ساتھ ہندوستان پر انگریزوں کا غلبہ بڑھنے لگا۔ بنگال کا صوبہ ارباب حکومت اور ادبا و شعرا کی دلچسپی کا مرکز بننے لگا۔ نئے خیالات، تازہ افکار اور نئی تحریکوں کا اثر یہاں زیادہ تھا۔ کلکتہ ہندوستان کی راجدھانی ہی نہیں بلکہ ملک کا مرکز صنعت و ثقافت بن گیا۔ ہر صوبہ کے لوگ یہاں آنے لگے اور اس شہر نے سبھوں کی پذیرائی کی۔ اگرچہ گوا میں سب سے پہلے 1556 میں چھاپہ خانہ کی بنیاد پڑی لیکن اس سے استفادہ کرتے ہوئے ہندوستانی صحافت میں کلکتہ نے پہلا قدم اٹھایا۔ انگریزی کا پہلا اخبار 'ہکی گزٹ' یا 'بنگال گزٹ' یہاں سے 29 جنوری 1780 میں اشاعت پذیر ہوا۔ 23 مئی 1818 میں بنگلہ زبان کا پہلا ماہنامہ 'سماچار درپن' شائع ہوا۔ بعد میں تاراچند دت اور بھوانی چرن بنرجی نے ایک بنگلہ ہفت روزہ 'سنگباد کومودی' کے نام سے 1819 میں شائع کیا۔ اردو کا پہلا اخبار ہفت روزہ 'جام جہاں نما' 27 مارچ 1822 کو منظر عام پر آیا۔ 24 اپریل 1822 کو راجہ رام موہن رائے نے 'مراۃ الاخبار' کے نام سے فارسی کا پہلا اخبار شائع کیا۔ ہندی کا پہلا اخبار ہفتہ وار 'اودنت مارتنڈ' جگل کشور شکلا کی ادارت میں 30 مئی 1826 کو نکلا۔ اس میں چند صفحات اردو کے بھی ہوتے تھے۔ اس طرح کلکتہ نے پورے ہندوستان کو صحافت کا نقش اوّل دیا۔

'جام جہاں نما' کے مالک ہری ہردت فارسی، اردو، بنگلہ اور انگریزی سے واقف تھے۔ وہ راجہ رام موہن رائے کے ساتھیوں میں تھے۔ ان کے والد 'سنگباد کومودی' کے بانیوں میں سے تھے۔ بعد میں ہری ہردت بھی اس اخبار سے وابستہ ہوئے لیکن اخبار کے مالک اور ساتھی بھوانی چرن بنرجی سے اختلاف کے سبب بنگلہ اخبار سے الگ ہوگئے اور کولوٹولہ کے اپنے مکان سے 'جام جہاں نما' جاری کیا۔ یہ اخبار 16 مئی 1822 سے فارسی میں چھپنے لگا۔ 23 مئی 1823 سے اس میں چار صفحات کا اردو ضمیمہ شامل ہوا۔ یہ اخبار 23 جنوری 1828 تک جاری رہا۔ اس اخبار میں خبروں کے ساتھ ادبی مواد بھی چھپتا تھا۔ اس کا سائز 11x8 انچ تھا اور چار صفحات پر مشتمل ہوتا تھا اور ماہانہ چندہ ایک روپیہ تھا۔

29 دسمبر 1824 کے شمارے میں لکھنؤ کی ایک خبر یوں شائع کی گئی "اخبار کے کاغذ سے دریافت ہوا کہ ربیع الثانی مہینے کی پہلی تاریخ منگل کے دن اس روز موافق معمول کے صاحب ریزیڈنٹ بہادر کے واسطے حاضری کی تیاری تھی۔ حضرت بادشاہ کو کرائیل کی طرف سے سیر کر کے قصر بادشاہی میں رونق افروز ہوئے۔ پانچ گھڑی دن چڑھتے تک منتظر بیٹھے تھے کہ صاحب ریزیڈنٹ بہادر آئے۔ آٹھ انگریز عالی قدر ساتھ لائے۔ جہاں پناہ نے سب صاحبوں کے ساتھ حاضری تناول فرمائی اور اس کے بعد اختلاط کی باتیں ہوا کیں۔" مارچ 1826 سے اس اخبار نے تاریخ انگلستان کو قسط وار شائع کرنا شروع کیا اور اکتوبر 1826 میں اسے محصول ڈاک کی رعایت مل گئی۔ 18 اپریل 1827 کے شمارے میں ایک انگریز مسٹر ڈی کاسٹا کی غزل شائع ہوئی جو یوں ہے:

کل ہم تمہارے کوچے میں آئے چلے گئے
ہے ہے! ہزار اشک بہائے چلے گئے
کیوں دل سے شاد ہوویں نہ ہم دوستو سنو
وے جاتے جاتے ہم کو بلائے چلے گئے
کل اس پری کے بزم میں سب مل کے برملا
تیری غزل ڈی کاسٹا گائے چلے گئے

ہفت روزہ 'جام جہاں نما' کی اشاعت کے بعد اردو میں صحافت کا راستہ کھل گیا۔ متھرا موہن متر نے اردو اور

فارسی کا مشترکہ اخبار ہفت روزہ 'شمس الاخبار' 27 مئی 1823 کو شائع کیا۔ بارہ صفحات کے اس اخبار کے ناشر منی رام ٹھاکر تھے اور یہ ان کے ذاتی پریس میں چھپتا تھا۔ اس کا ماہانہ چندہ دو روپے تھا اور یہ 26، چورنگان اسٹریٹ سے شائع ہوتا تھا جہاں اس کے مالک کا مکان تھا۔ مالی دشواریوں کی وجہ سے یہ اخبار 1827 میں بند کر دیا گیا۔

کلکتہ سے نکلنے والا اردو کا تیسرا اخبار 'آئینہ سکندری' تھا جس کی اشاعت 1831 میں شروع ہوئی۔ چودہ صفحات پر مشتمل یہ اخبار کولن اسٹریٹ میں چھپتا تھا۔ 1832 میں چوتھا اخبار ہفت روزہ 'دوربین' جاری ہوا جس کے مالک فدا حسین تھے۔ 1833 میں پانچویں اخبار 'مہ عالم افروز' کی اشاعت ہوئی جو 12 صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ ہفتہ وار منگل کو نکلتا تھا اور اس کے مالک و مدیر مولوی وہاج الدین تھے۔

ان اخبارات کی اشاعت نے کلکتہ و بیرون کلکتہ پڑھنے والوں کا ایک حلقہ پیدا کیا جس کے نتیجے میں خیالات کی ترسیل آسان ہوئی۔ ساتھ ہی دور و نزدیک کے مسائل سے آگاہی پیدا ہوئی۔ 1835 میں ہفت روزہ 'سلطان الاخبار' کی اشاعت کا آغاز ہوا جس کے مالک و مدیر رجب علی لکھنوی حسینی تھے۔ 1841 میں 'مہر منیر' جاری ہوا جس کے مہتمم و مدیر محمد علی تھے۔ 1843 میں 'جام جہاں نما' کے نام سے ایک اور اخبار جاری ہوا جس کے مالک منشی غلام حسین اور مہتمم منشی مصور حسین تھے۔ ساتھ ہی اخبار 'تعلیمی' نکلا۔ 1844 میں 'مخزن الادویہ' کی اشاعت ہوئی۔ 1845 میں اخبار 'آئینہ گیتی نما' منظر عام پر آیا۔ 1846 میں مولوی نصیرالدین نے پانچ زبانوں میں چھپنے والا اخبار 'ماتنڈ' نکالا جو اردو، ہندی، بنگلہ، فارسی اور انگریزی میں چھپتا تھا۔ اسی سال اخبار 'احمدی' جاری ہوا۔ 1847 میں 'مراۃ الاخبار' کلکتہ کے محلّہ تال تلہ سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کے مہتمم محمد تبریزی چندوی تھے۔ 1848 میں شیب چندر سین نے 'جام جمشید' نام کا اخبار جاری کیا۔ 1851 میں اخبار 'گلشن نو بہار' کی اشاعت شروع ہوئی جس کے مدیر عبدالقادر تھے۔ ماہانہ چندہ ڈیڑھ روپے تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ غدر سے پہلے تک 35 سال کے عرصے میں کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد کم و بیش سولہ ہو جاتی ہے۔ شمالی ہند میں اس کا خاصا اثر ہوا اور دوسری جگہوں سے بھی اخبارات نکلنے لگے جن میں بمبئی سے 'کشف الاخبار' دہلی سے 'دہلی اردو اخبار' اور 'صادق الاخبار' لکھنؤ سے 'طلسم' اور 'سحر سازی' نیز پنجاب

بیسویں صدی کی شروعات سے لے کر آزادی ملنے تک کا دور بلاشبہ اردو صحافت کا زرّیں دور ہے اور اس میں بنگال کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان 47 برسوں میں یہاں سے نکلنے والے اخبارات و جرائد کی تعداد ساٹھ سے بھی زیادہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے 1912 میں ہفت روزہ 'الہلال' اور 1915 میں ہفت روزہ 'البلاغ' جاری کرکے ادبی صحافت کے منظرنامے کو روشن کردیا۔ مولانا کے پاس عرب ممالک، ترکی اور مصر سے عربی و فارسی کے اخبارات آیا کرتے تھے۔

سے 'کوہ نور' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان اخبارات کا بنیادی مقصد حب الوطنی کے جذبے کو بیدار کرنا اور انگریزوں کے خلاف تحریک کو ہوا دینا تھا جبکہ ادبی معاملات ثانوی تھے۔ انگریزی حکومت نے ان میں سے بہت سے اخبارات کو بند کر دیا اور کئی مدیروں پر مقدمات بھی چلائے مگر وہ آزادیٔ اظہار کو دبا نہ سکے۔

غدر 1857 کے بعد اردو زبان کا پہلا روزنامہ 'اردو گائیڈ' 1858 میں اشاعت پذیر ہوا اور 1887 تک جاری رہا۔ اس کے مالک مولوی کبیرالدین احمد تھے۔ آپ کی مادری زبان بنگلہ تھی اور آپ اردو، عربی، فارسی نیز انگریزی سے واقف تھے۔ آپ ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن تھے۔ آپ کی بیٹی رضیہ خاتون خدا بخش لائبریری کے بانی مولوی خدا بخش ساکن پٹنہ سے بیاہی گئی۔ 1858 سے 1900 تک کلکتہ سے نکلنے والے اخبارات و رسائل کی تعداد 32 تک پہنچتی ہے۔ ان میں ہفتہ وار 'رفیق ہند' 1860 (مالک ہریش چندر مکھرجی)، ماہنامہ 'انجمن اسلامی' (1863 مہتمم: عبداللطیف خاں)، سہ روزہ 'محمدی' (1877، مالک مولوی عبدالخالق)، ماہنامہ 'کلکتہ پنچ' (1879: مالک مولوی دائم اللہ)، ماہنامہ 'مہر انتخاب' (1882: مالک: عبدالحمید)، ماہنامہ 'گلدستہ نتیجہ سخن' (1882، مہتمم: مولوی حکیم عبدالصمد کانپوری)، ماہنامہ 'نور بصیرت' (1884، مہتمم: اسفندیار خاں)، ماہنامہ 'گلزار جہاں' (1885، مالک: امیر علی)، ماہنامہ 'ایسٹ انڈین ریلوے' (1886، مہتمم: سی ایچ ڈان چیف انجینئر)، 'ماہنامہ 'خادم الاسلام' (1900، مہتمم: حافظ محمد موسیٰ) وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ غدر کے بعد نکلنے والے اخبارات و رسائل نے قومی، معلوماتی، تعمیری، مذہبی پہلو کے ساتھ ادبی خدمات کے سلسلے کو دراز کیا۔ انھوں نے لکھنے والوں کی ایک نئی کھیپ پیدا کی۔ سیاسی ژرف بینی اور دانشورانہ انداز کو اس دور میں اپنایا۔ جوش کے ساتھ ہوش مندی کی سلیقے سے پرورش کی اور علمی و ادبی معاملات میں گہری سوچ و فکر کو راہ دی۔ اس دور میں کلکتہ کے ساتھ دوسرے شہروں سے اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت میں اضافہ ہوا۔ بنگال کے مشہور محقق شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے مطابق ابتدا سے انیسویں صدی کے اختتام تک ملک بھر سے نکلنے والے اخبارات و رسائل کی تعداد کم و بیش پانچ سو ہے۔

بیسویں صدی کی شروعات سے لے کر آزادی ملنے تک کا دور بلاشبہ اردو صحافت کا زرّیں دور ہے اور اس میں بنگال کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان 47 برسوں میں یہاں سے نکلنے والے اخبارات و جرائد کی تعداد ساٹھ سے بھی زیادہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے 1912 میں ہفت روزہ 'الہلال' اور 1915 میں ہفت روزہ 'البلاغ' جاری کر کے ادبی صحافت کے منظرنامے کو روشن کر دیا۔ مولانا کے پاس عرب ممالک، ترکی اور مصر سے عربی و فارسی کے اخبارات آیا کرتے تھے۔ آپ نے اسی اعلیٰ معیار کو اپنی صحافت میں برتا۔ 'الہلال' میں ادبی مقالے، مذہبی مضامین، سیاسی تبصرے، خبریں اور جدوجہد آزادی سے متعلق پیغامات شائع ہوتے تھے۔ اس کی مقبولیت پورے ہندوستان میں تھی اور تعداد اشاعت تیس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ انگریزوں کی مخالفت کے سبب یہ جریدے بند ہوئے اور مولانا آزاد کو جلاوطن کر دیا گیا۔ کلکتہ واپس آنے کے بعد انھوں نے 1923 میں 'پیغام' جاری کیا جس کے مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ اس اخبار سے ان کے ادبی و صحافتی جوہر کھلے۔ 1929 میں انھوں نے اپنا ذاتی اخبار روزنامہ 'ہند' جاری کیا۔ مولانا دعوت فکر و عمل کے نقیب تھے۔ انھوں نے صحافت کو ایک نئی زبان دی جس میں سادگی اور فطری روانی تھی۔ انھوں نے اس دور میں کسانوں اور مزدوروں کی حمایت میں کھل کر اظہار خیال کیا نیز اشتراکیت کے خد و خال واضح کیے جب ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹیوں کی بنیاد بھی نہیں پڑی تھی۔ 1938 میں کلکتہ میں ہونے والی 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کی کل ہند کانفرنس میں انھوں نے بڑھ کر حصہ لیا جس کا اعتراف سجاد ظہیر نے بھی کیا ہے۔ روزنامہ 'ہند' کی ادارت بعد میں معتبر صحافی رئیس الدین فریدی نے کی۔

اسی دور کے ایک اور معتبر صحافی کیفی چریاکوٹی ہیں جن کی پیدائش اعظم گڑھ میں ہوئی۔ 1932 میں وہ کلکتہ آئے اور یہاں سے روزنامہ 'زمانہ' نکالا جس کے مالک مولانا اکرام خان تھے جسے قومی تحریکوں کی حمایت کرنے کی پاداش میں کچھ دنوں بعد انگریزی حکومت نے بند کردیا۔ اس کے بعد انھوں نے روزنامہ 'انقلاب زمانہ' جاری کیا جو 1927 تک نکلتا رہا۔ مہاتما گاندھی، مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر بھی ان کے کمال فن کے معترف تھے۔ نامور شاعر پرویز شاہدی نے 1931 میں ہفت روزہ 'اردو' جاری کیا۔ 1932 میں معروف صحافی و شاعر ابراہیم ہوش نے ہفت

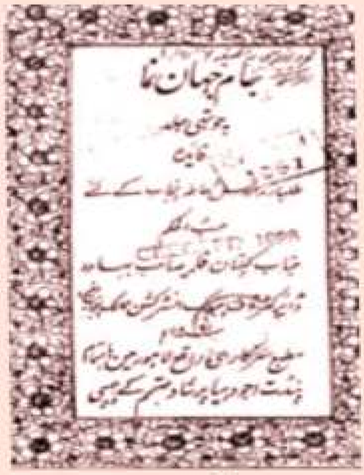

روزہ 'خادم' نکالا۔ علامہ جمیل مظہری نے 1935 میں سہیل عظیم آبادی کے ساتھ مل کر 'ماہ و تمام' اور پھر 'آئینہ' کی اشاعت کی۔ محمود غزنوی نے 1938 میں 'صہبا' اور مزاحیہ ادب کو فروغ دینے کے لیے 'کلکتہ پنچ' کا اجرا کیا۔ 1941 میں جوہر غازی پوری نے ہفت روزہ 'عبرت' 1945 میں وفا راشدی نے ہفت روزہ 'نئی دنیا' اور 1946 میں آصف بنارسی نے ہفت روزہ 'انگڑائی' نکالا۔ ان لوگوں کے علاوہ اس دور میں جن حضرات نے ادب اور صحافت کے میدان میں اپنے نقوش چھوڑے ان میں شائق احمد عثمانی (ہفتہ وار 'عصر جدید' اور پھر روزنامہ 'عصر جدید')، چراغ حسن حسرت (آفتاب)، وائی کے طارق (ہنگامہ، مزدور اور نقاش)، یونس احمر ('جدید اردو)، ناظر الحسینی ('نئی منزل) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

1948 سے 2000 تک 53 سال کے عرصے میں بنگال سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تعداد کم و بیش 85 ہے۔ ان میں روزنامے ہفت روزہ اخبارات پندرہ روزہ جرائد، ماہنامے اور سہ ماہی رسائل شامل ہیں۔ ان سب میں ادب کا حصہ معقول رہا ہے۔ آزادی کے بعد ادبی و قومی مسائل پر خاصا زور دیا گیا۔ 1948 میں نامور صحافی احمد سعید ملیح آبادی نے روزنامہ 'آزاد ہند' کے ساتھ ہفت روزہ 'اجالا' شائع کرنا شروع کیا جس میں چھپنا ادبا و شعرا کے لیے فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔ 1951 میں محمد امین نے ہفت روزہ 'کسان مزدور' کا اجرا کیا جس نے نچلے اور پچھڑے طبقات کے مسائل کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ 1962 میں عاجز انصاری نے ماہنامہ 'ساز' جاری کیا۔ 1963 میں شفیع نشاط نے ماہنامہ 'آفاق' کا اجرا کیا۔ 1968 میں مشہور افسانہ نگار ظفر اوگانوی نے ماہنامہ 'اقدار' کی اشاعت کی۔ 1971 میں معروف شاعر شہود عالم آفاقی نے ماہنامہ 'شہود' جاری کیا جو کافی عرصے تک نکلتا رہا۔

اس میں شاعروں کے کلام کے ساتھ نثری مضامین بھی چھپتے تھے۔ 1979 میں معبر محقق الف انصاری نے مشتاق جاوید کے ساتھ مل کر پندرہ روزہ 'نقش حیات' کا اجرا کیا۔ بعد میں ان دونوں نے 'ادب اور اسپورٹس' نامی رسالہ نکالا جس نے نئی نسل کو تفریح کے ساتھ ادب کی طرف راغب کیا۔ 1980 میں انور حسین انجم نے ماہنامہ 'کاف نون' کی اشاعت کی۔

80 کی دہائی سے بنگال میں ادبی رسالوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ 1983 میں مغربی بنگال اردو اکادمی کا جریدہ سہ ماہی 'روح ادب' محمد نظام الدین کی نگرانی میں شائع ہوا۔ اس میں ملک کے مشاہیر کے مضامین، افسانے، غزلیں، نظمیں اور کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔ اس کے خاص نمبر بڑے شوق سے پڑھے گئے جن میں ابوالکلام آزاد نمبر، سجاد ظہیر نمبر، عین رشید نمبر، مغربی بنگال کا اردو صحافت نمبر، بنگال میں اردو شاعری نمبر قابل ذکر ہیں۔ 1986 میں نامور ادیب و شاعر ف س اعجاز نے ماہنامہ 'انشا' کا اجرا کیا۔ مختصر عرصے میں اس نے اردو دنیا میں اپنی اہمیت منوائی۔ اس کے قلم کاروں اور پڑھنے والوں میں بیرون ہند بسنے والوں کی خاصی تعداد ہے۔ اس کے اداریے غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس کے خاص نمبروں کی الگ شان ہے جن میں ''ادیبوں کی حیات معاشقہ نمبر، عالمی اردو افسانہ نمبر، اسکنڈے نیویائی ادب نمبر، کلکتہ کا عصری ادب نمبر، گوپی چند نارنگ، گلزار نمبر وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مصطفیٰ اکبر کی ادارت میں حکومت مغربی بنگال کا ترجمان پندرہ روزہ 'مغربی بنگال' یوں تو حکومت کی پالیسی کے تابع ہے اور ریاست کی صنعتی سرگرمیوں نیم اسکیموں کی خبریں اس کا ہدف ہیں لیکن اس نے وقفے وقفے سے کئی ضخیم ادبی نمبر شائع کیے جنھیں خاصا پسند کیا گیا۔ ان میں امیر خسرو نمبر، وحشت نمبر، ٹیگور نمبر، فیض نمبر وغیرہ شامل ہیں۔ اس دور کے دیگر جرائد میں 'فلم ویکلی' (مدیر: محمد وسیم الحق)، اسپورٹس اور فلم (مدیر: بدر الحسن)، تبصرہ (فراغ روہوی)، اسپورٹس اور تفریح (مدیر: جاوید نہال)، ہنگامہ (مدیر: جمال احمد محشر)، پیش رو (مدیران: خواجہ نسیم اختر اور اکبر حسین اکبر)، آئینہ وقت (مدیر: محی الدین شہزادہ)، نوری مجاہد (مدیر: مدثر حبیبی)، شان ملت (ناشر: کلیم الدین شمس) وغیرہ خاص ہیں۔

90 کی دہائی میں بھی اخبارات و رسائل کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہا۔ 1993 میں ہفت روزہ 'میرا ملک' منظر عام پر آیا جس کے چیف ایڈیٹر معین الدین شمس اور ایڈیٹر شاہد پرویز تھے۔ بعد میں محمد زاہد اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ 12 صفحات کے اس اخبار میں خبروں کے ساتھ افسانے، ادبی مضامین، غزلیں، نظمیں اور 'گستاخی معاف' کے نام سے طنزیہ کالم بھی شائع ہوتا تھا۔ اسی سال نعیم انیس، تنویر افضل و دیگر حضرات نے مل کر رسالہ 'رابطہ' شائع کیا۔ 1994 میں عنبر شمیم نے رسالہ 'دستک' جاری کیا۔ 1995 میں نعیم انیس اور صباح اسمٰعیل نے مل کر ماہنامہ 'تجدید' نکالا۔ اسی سال عاصم شہواز شبلی نے سہ ماہی 'اثبات و نفی' جاری کیا۔ 1998 میں شفیع نشاط نے پندرہ روزہ 'آفاق' کے نام سے پرانے جریدے کی دوبارہ اشاعت شروع کی جس کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر محمد زاہد تھے۔ 1999 میں نوشاد مومن نے سہ ماہی 'مژگاں' نکالا جس نے کئی معتبر ادبی شخصیات پر گوشے شائع کیے۔ ساتھ ہی 'نئی نسل نیا ادب نمبر' پیش کیا جس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ اس سال اختر بارکپوری نے سہ ماہی 'دستخط' نکالا جو ان کی موت تک جاری رہا۔ اس پرچے نے 'رباعی نمبر' اور 'قیصر شمیم نمبر' بھی شائع کیے۔ 2000 میں نسیم فائق نے ماہنامہ 'عاقبت'، جمیل حیدر شاد نے ماہنامہ 'ارض و سما' مولانا غلام جیبی نے ماہنامہ 'عطائے قمر' اور فہیم انور نے دو ماہی

'تخلیق' کی اشاعت کی۔ اسی سال جگتدل سے ایک آن لائن میگزین 'کائنات' کے نام سے خورشید اقبال نے جاری کیا جس کے کئی پرنٹ ایڈیشن بھی نکلے۔

اکیسویں صدی میں بھی مغربی بنگال نے اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ اردو کے قارئین اور ادب کے متوالوں کو جوڑے رکھنے میں ان اخبارات و جرائد نے خاصی تگ و دو کی ہے۔ تازہ افکار اور نئے ادبی مباحث کو قائم رکھنے میں ان کا اہم حصہ رہا ہے۔ 2001 میں نوشاد مومن نے ہفت روزہ 'نئی صدی' کا اجرا کیا۔ فراغ روہوی نے سہ ماہی 'ترکش' کا آغاز کیا جس نے معروف ڈرامہ نگار جاوید دانش پر خاص نمبر نکالا۔ 2002 میں ماہنامہ 'تطہیر' (مدیر: محمد علی شہید) اور ماہنامہ 'تصوف ملی' (مدیر: محمد یحییٰ) کی اشاعت عمل میں آئی۔ 2003 میں محمد زاہد نے ماہنامہ 'ہمارا چمن' اور علی اعظم خاں قادری نے سہ ماہی 'حضرت بلال' کا اجرا کیا۔ 2010 میں کولکاتا میونسپل کارپوریشن نے 'کولکاتا پروشری' نامی رسالہ نکالا جس کے مدیر اعلیٰ شہید الاسلام تھے۔ 2012 میں جمیل منظر کی ادارت میں رسالہ 'سہیل' کی اشاعت ثانی کا آغاز ہوا جس نے قلیل عرصے میں سردار جعفری نمبر، پرویز شاہدی نمبر، سالک لکھنوی نمبر، عصمت چغتائی نمبر شائع کر کے اپنی اہمیت منوالی۔ 2013 میں محمد زاہد کی ادارت میں سہ ماہی 'نئے روابط' منظر عام پر آیا جس نے معروف شاعر صادق رائے بریلوی پر خاص گوشہ شائع کیا۔ 2014 میں نعیم انیس نے سہ ماہی 'فکر و تحریر' کی اشاعت شروع کی جس میں نئی نسل کے ناقدین اور ادبا کی تحریروں کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ اسی سال سلمان اختر کی ادارت میں پندرہ روزہ 'استقلال' نمودار ہوا جس نے ادب کے ساتھ سماجی مسائل پر بھی فکر انگیز مضامین شائع کیے۔ معروف ڈرامہ نگار کمال احمد نے لعل میگزین 'انگور' جاری کیا جس میں بڑوں کے ساتھ بچوں کے لیے بھی ایک حصہ مختص ہے۔ تھیٹر آرٹ پر 'رنگ رس' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ معروف ہدایت کار ایس ایم اظہر عالم کی ادارت میں شائع ہوا۔ ڈرامہ کی دنیا سے وابستہ افراد نے اس کی خاصی پذیرائی کی۔ 2015 میں محمد اختش خالد نے ماہنامہ 'شہر نشاط' جاری کیا تو سہیل ارشد نے 'جاپانی ادب' کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ نکالا جس میں جاپانی اصناف سخن ہائیکو، رینگا اور سین ریو کے متعلق مضامین اور نمونے تھے۔ ان کے علاوہ جن رسائل نے ادبی سلسلے کو آگے بڑھایا ان میں 'عالمی لب و لہجہ' (مدیر: یونس آرزو)، 'صورت' (مدیر: عمران راقم)، ماہنامہ 'مقتل' (مدیر: افروز عالم)، 'محفل خوش رنگ' (مدیر: محمد افضل خاں)، سرپرست (مدیر: محبوب رضا) کے نام سرفہرست ہیں۔

کلکتہ شہر کے علاوہ مغربی بنگال کے جن علاقوں سے اردو اخبارات و رسائل شائع ہوئے ان میں متیابرج، کلٹی، ہوڑہ اور آسنسول خاص ہیں۔ متیابرج سے 1865 میں اخبار 'سلطانی' جاری ہوا۔ اس کے طویل وقفے بعد 1952 میں 'پیغام' عاشق حسین حبیبی کی ادارت میں شائع ہوا۔ پھر وقفے وقفے سے نشیمن، ہنگامہ، محفل، شرارت، آئینہ وقت، سبطین آباد گزٹ، نوری مجاہد، سرکار ملت، شہرنو، اخبار اعظم، ہمارا چمن، تطہیر، مقتل، نئے روابط وغیرہ اشاعت پذیر ہوئے۔

کلکتہ شہر کے علاوہ مغربی بنگال کے جن علاقوں سے اردو اخبارات و رسائل شائع ہوئے ان میں مٹیابرج، کلٹی، ہوڑہ اور آسنسول خاص ہیں۔ مٹیابرج سے 1865 میں اخبار 'سلطانی' جاری ہوا۔ اس کے طویل وقفے بعد 1952 میں 'پیغام' عاشق حسین حبیبی کی ادارت میں شائع ہوا۔ پھر وقفے وقفے سے نشیمن، ہنگامہ، محفل، شرارت، آئینہ وقت، سبطین آباد گزٹ، نوری مجاہد، سرکار ملت، شہرنو، اخبار اعظم، ہمارا چمن، تطہیر، مقتل، نئے روابط وغیرہ اشاعت پذیر ہوئے۔

ہوڑہ سے 1941 میں جوہر غازی پوری کی ادارت میں ہفتہ وار 'عبرت' جاری ہوا۔ اس کے بعد 1970 میں نور قریشی اور قیصر شمیم نے مل کر 'ہوڑہ ٹائمز' شائع کیا۔ 1994 میں عنبر شمیم نے 'دستک' اور 2000 میں فہیم انور نے دو ماہی 'تخلیق' کی اشاعت کی۔ ان کے علاوہ مساوات ہند، اختر ہند اور انکشافات بھی اسی سرزمین سے جاری ہوئے۔

آسنسول بھی اردو ادبی صحافت کا معتبر نام ہے۔ یہاں سے 1971 میں ولی مشرقی نے 'بزم منیر' کے نام سے ماہنامہ جاری کیا۔ اس رسالے نے کئی ہند و پاک نمبر شائع کیے۔ قیام انیس کی ادارت میں پندرہ روزہ 'محرک' 1975 میں جاری ہوا۔ 1979 میں محمد اشتیاق اور محمد ریاض الدین نے ماہنامہ 'ورق ورق' کی اشاعت کی۔ 1980 میں نعیم اشفاق نے سہ ماہی 'پہچان' کی اشاعت کی۔ 1997 میں عشرت بیتاب نے سہ ماہی 'انبساط' کا آغاز کیا۔ 1998 میں اقبال انصاری نے پندرہ روزہ 'ایشور اللہ' جاری کیا۔ 2001 میں عشرت نظیر آزاد کی ادارت میں 'نئی بستی' 2003 میں 'نئی صبح' (مدیر: محبوب انور، پرویز خان شیدائی) اور 2007 میں پرویز انصاری کی ادارت میں 'آسنسول خبر' کی اشاعت عمل میں آئی۔ 2003 میں نذیر احمد یوسفی کی ادارت میں 'تسلسل' شائع ہوا۔ ان کے علاوہ یہاں سے سولہ آنے، اقبال، عقاب، شاہین، ہم لوگ، اطلاع عام، واسطہ، صدائے ملت، مسلم یوتھ وغیرہ بھی شائع ہوئے۔

کلٹی شہر سے شبنم برن پوری نے 1945 میں 'بگولہ' اور سیف مستی پوری نے 1971 میں 'دیوار' کی اشاعت کی۔ مولانا اعجاز عرفی کی ادارت میں 'وقار' شائع ہوتا تھا جس کے معاونین میں مسلم اقبال اور انور حسین تھے، مولانا عرفی کی ہی ادارت میں رسالہ 'دریافت' شائع ہوا۔

■

Dr. Md. Zahid
B-5, P.D. Jaah Lane, Garden Reach
Kolkata - 700024 (WB)
M.: 86971940755
Email.: mdzahidmb@gmail.com

HICKY's
BENGAL GAZETTE;
OR THE ORIGINAL
Calcutta General Advertifer.

A Weekly Political and Commercial Paper, Open to all Parties, but influenced by None.

59 From Saturday March 3d to Saturday March 10th 1781. No. VII

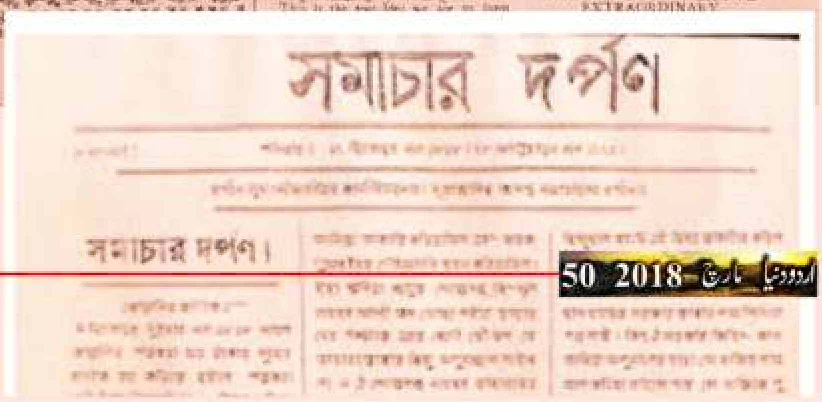
সমাচার দর্পণ

সমাচার দর্পণ।

علیم اللہ

ماقبل نوآبادیاتی ہندوستان کا سماجی و ثقافتی منظرنامہ

جب ہم سماجی اور ثقافتی زندگی پر بات کرتے ہیں تو سب سے پہلے رسم و رواج، روایت، چلن، طریقہ زندگی اور لسانی ڈھانچہ کی طرف ہمارا دھیان جاتا ہے۔ تہذیب وثقافت سے ہی دراصل انسانی زندگی کو نئی سمت ملتی ہے۔ دنیا کی جتنی بھی تہذیبیں ہے، سب انسانی شعور کا ہی حصہ ہیں۔ اس لیے یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان اپنے مذہب سے کنارہ کشی ضرور اختیار کر لیتا ہے، لیکن اپنی تہذیبوں کی جڑ کو نہیں چھوڑ پاتا ہے۔

تہذیب وثقافت کو انسانی زندگی کا بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے۔ ثقافت یعنی ایک معاشرہ اور ایک قوم کی اپنی خصوصیات اور عادات و اطوار، اس کا طرز فکر، یہی چیزیں ملک کی تہذیب کی بنیاد ہوتی ہیں۔ تہذیب وثقافت قوموں کے تشخص کا اصلی سرچشمہ ہے۔ قوم کی ثقافت اسے ترقی یافتہ، باوقار، قوی وتوانا، فنکار و ہنرمند اور عالمی سطح پر محترم و باشرف بنا دیتی ہے۔ اگر کسی ملک کی ثقافت زوال کا شکار ہو جائے یا کوئی ملک اپنا ثقافتی تشخص گنوا بیٹھے تو باہر سے ملنے والی ترقیاں اسے اس کا حقیقی مقام نہیں دلا سکیں گی اور وہ قوم اپنے قومی مفادات کی حفاظت نہیں کر سکے گی۔

ثقافت معاشرے کے پیکر میں روح اور جان کا درجہ رکھتی ہے۔ قوموں پر تسلط اور غلبے کے لیے اغیار اپنی تہذیب وثقافت کی ترویج کی کوشش کرتے ہیں جو کوئی نیا طریقہ نہیں ہے بلکہ بہت پہلے سے یہ طریقہ چلا آرہا ہے۔ اسی لیے حاکم قوم محکوم قوم کی تہذیب وثقافت کو منہدم کرنے کی کوشش کرتی ہے تاکہ وہ اسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ سکے۔ یہاں پر اگر ہندوستانی نقطہ نظر سے دیکھیں تو انگریزوں نے ہندوستان کو اپنا غلام بنانے کے بعد سب سے پہلے یہاں کی ثقافت اور تہذیب پر حملہ کیا اور دھیرے دھیرے مغربی اثرات مسلط ہونے لگے۔ یہ الگ بات ہے کہ گزشتہ سو برسوں سے مغربی ممالک نے جدید وسائل کے استعمال سے اپنے تمام اقدامات کو بہت زیادہ منظم کر لیا ہے۔ اب وہ یہی کام پوری منصوبہ بندی سے کر رہے ہیں اور وہ ان مقامات اور پہلوؤں کی نشاندہی کر چکے ہیں جہاں انھیں زیادہ کام کرنا ہے۔

دنیا کی تمام بیدار قومیں اس بات پر متفق ہیں کہ اگر کسی قوم نے اپنی ثقافت کو بیگانہ ثقافتوں کی یلغار کا نشانہ بننے اور تباہ و برباد ہونے دیا تو تباہی یقینی ہے۔ غلبہ اسی قوم کو حاصل ہوا جس کی ثقافت غالب رہی ہے۔ ثقافتی تسلط، اقتصادی تسلط اور سیاسی تسلط سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اگر ایک قوم نے دوسری قوم پر ثقافتی اور تہذیبی غلبہ حاصل کر لیا تو قومی تشخص پر سوالیہ نشان لگ جانے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کو اس کی تاریخ، اس کے ماضی، اس کی تہذیب و ثقافت، اس کے تشخص، اس کے علمی، مذہبی، قومی، سیاسی اور ثقافتی افتخارات سے جدا کر دیا جائے، ان افتخارات کو ذہنوں سے محو کر دیا جائے، اس کی زبان کو زوال کی جانب دھکیل دیا جائے، اس کا رسم الخط ختم کر دیا جائے تو وہ قوم اغیار کی مرضی کے مطابق ڈھل جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں انگریزی اقتدار نے یہاں کے معاشرے کی ہیئت وساخت میں بنیادی قسم کی تبدیلیاں پیدا کیں۔ سیاسی وثقافتی اور معاشی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ سائنسی اور فنی ایجادات نے مذہبی اور توہمات پر کاری ضربیں لگائیں اور مذہبی رجعت پرستی کو کمزور کیا۔ اس عمل میں یورپی اور ہندوستانی معاشروں میں فرق نمایاں رہا، کیونکہ یورپی معاشرہ سائنسی اور فنی ایجادات کے عمل کے نتیجے میں ذہنی طور پر آگے بڑھا اور معاشرے کی ترقی میں ہر فرد نے برابر کا حصہ لیا اور ان تمام ایجادات کو جو وقت کی ضرورت کے تحت عمل میں آئی تھیں انھیں نہ صرف ذہنی طور پر قبول کیا بلکہ یہ ان کی زندگی میں رچ بس گئیں اس کے مقابلے میں ہندوستان میں یہ ایجادات یورپ سے آئیں اور ایک ایسے معاشرے میں رائج ہوئیں جو ذہنی طور پر ان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے اس نے ہر نئی چیز کو شک شبہے کی نظروں سے دیکھا اور ان کو قبول کرتے ہوئے خوف و جھجک کا مظاہرہ کیا۔

نوآبادیات، ثقافتی منصوبہ تھا۔ سادہ لفظوں میں یہ نوآبادیوں کی ثقافت کو یورپی اصولوں سے جاننے اور 'نوآبادیاتی علم' میں تبدیل کرنے سے عبارت تھا۔ 'نوآبادیاتی علم' علم کی وہ خصوصی شاخ ہے جس میں نتائج پر پہلے نظر رکھی جاتی ہے اور یہ نتائج فقط علمی نوعیت کے نہیں ہوتے بلکہ سیاسی، سماجی اور ثقافتی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں۔ اس علم کے ذریعے ایک واضح اور 'مفید' تبدیلی لانے کی کوشش ہوتی ہے۔ تبدیلی کی افادیت اور سمت کا تعین آبادکار کرتا ہے۔ چنانچہ سادہ لفظوں میں یہ وہ علم ہے جسے طاقت کے حصول کا ذریعہ بنایا جا سکتا یا طاقت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انگریزوں اور فرانسیسیوں کے لیے کسی ایشیائی یا افریقی ثقافت کے علم کا کوئی مفہوم اس وقت تک مرتب نہیں ہو سکتا تھا، جب تک اس علم کے ذریعے اقتدار اور اجارہ حاصل نہ ہو۔ آباد کاروں کے لیے جاننا تسخیر کرنا تھا۔ سترھویں صدی عیسوی میں یورپی سائنسوں کا یہ عام اصول تھا۔

کسی ثقافت کی ریڑھ کی ہڈی کیا ہے؟ یہ سوال ہر ثقافتی مطالعے میں دیر سویر ظاہر ہوتا ہے۔ 1561 میں تھامس رَو جہانگیر کے دربار میں تجارتی مراعات کی درخواست لے کر حاضر ہوا تو اُسے اُس نے کمپنی کو لکھا کہ ایک اور سخت تکلیف جو مجھے سہنی پڑی وہ ترجمان کی کمی تھی، کیوں کہ دلال وہی کچھ کہیں گے جو انھیں پسند ہوگا، بلکہ وہ بادشاہ کے خطوط میں ترمیم کر دیں گے۔ یعنی عملی مسئلہ جہانگیر کے اصل منشا کو جاننا تھا جو دربار کی زبان فارسی میں ظاہر ہوئی تھی اور تھامس رَو فارسی نہیں جانتا تھا۔ اُس نے فی الفور بھانپ لیا تھا کہ فارسی سے ناواقفیت اس

پورے نوآبادیاتی منصوبے کو چوپٹ کرسکتی ہے، جسے ابھی چند تجارتی مراعات کے پردے میں چھپائے رکھنا قرین مصلحت سمجھا گیا تھا۔ چوں کہ فارسی کا علم جلد ممکن نہیں تھا، اس لیے اُس نے یونانی، آرمینی اور اطالوی لوگوں کو اپنا ترجمان بنایا جنھیں فارسی آتی تھی۔ جلد ہی ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس کے ملازمین کو احساس ہوگیا کہ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان سب سے بڑی ثقافتی رکاوٹ زبان ہے۔ اگر یہ رکاوٹ برقرار رہتی ہے تو ہندوستان ان کے لیے اجنبی اور ناقابلِ تسخیر رہے گا۔ ہر چند ایسٹ انڈیا کمپنی نے کئی مقامی لوگوں کو بچولیا بنایا۔ انھیں اخوند، دلال، دوباشی، گماشتہ، پنڈت اور وکیل کے خطابات دے کر ہندوستانی ثقافت کی تھاہ پانے کی کوشش کی مگر یہ سراسر عارضی انتظام تھا۔ کمپنی کے ملازمین مقامی لوگوں سے ہمیشہ شاکی رہے۔ گل کرسٹ نے انگریزی ہندوستانی لغت کی تیاری میں فیض آباد کے کتنے ہی فاضل ہندوستانیوں کی خدمات مستعار لیں مگر گلہ مند رہا کہ ہندوستانی پنڈت، منشی اپنے آقاؤں کے عام لوگوں سے براہ راست ابلاغ کی کوششوں کو حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے شاکی ہونے کے بعض دوسرے پہلو بھی تھے۔ ایک یہ کہ صرف بچولیوں اور ترجمانوں پر انحصار کا مطلب ہندوستانی ثقافت اور زبان کے فقط قلیل حصے تک رسائی تھی جو نوآبادیاتی ثقافتی منصوبے کے لیے ہرگز موزوں نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ وہ ہندوستانی ثقافت کے ان بنیادی قوانین تک رسائی چاہتے تھے جو اس ثقافت کی تہ میں موجود اور اس کارکردگی کو ممکن بنا رہے تھے۔ اس کے لیے اس ثقافت کا براہِ راست تجرباتی علم حاصل کرنا ضروری تھا۔ یہ سارا علم ہندوستانی زبانوں میں بند تھا، کلاسیکی اور ورناکولر زبانوں میں۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں، خصوصاً بنگال پر قبضے کے بعد، برطانوی آبادکار اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ ہندوستانی زبانیں، ہندوستان کی ثقافت میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ بیک وقت زبان کا ثقافتی تصوّر اور ثقافت کا لسانی تصوّر تھا۔ ثقافتی تصور کی رو سے زبان ایک باقاعدہ علامتی نظام ہے، جس میں کسی سماج کی پوری روح اور اس روح کے اسرار مضمر ہوتے ہیں۔ زبان کا علامتی نظام ہی اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ آخر ایک سماج خاص طرح سے کیوں سوچتا، خاص انداز میں کیوں دنیا اور کائنات کا ادراک کرتا اور خاص طریقے سے کیوں واقعات پر ردِ عمل ظاہر کرتا ہے؟

برطانوی منتظمین زبان کے اس تصوّر تک کیوں کر پہنچے؟ آیا ہندوستان میں آنے والی ثقافتی رکاوٹوں کے شدید تجربات اور ان پر قابو پانے کی کوششوں نے زبان کا مذکورہ تصوّر قائم کرنے پر مجبور کیا یا اس عہد کا یہ عمومی یورپی لسانی تصوّر تھا؟ اس کا جواب آسان نہیں ہے۔ زبان کے ثقافتی تصوّر تک پہنچنے کی غالباً اصل وجہ سترھویں صدی کے عام یورپی سائنسی اصول تھے۔ زبان کو علامتی نظام تصور کرنے کا مطلب اس بنیادی قوت تک رسائی تھی جس کے آگے ایک سماج کے افراد خود کو 'بے بس' پاتے ہیں یعنی خود کو اور دنیا کو اسی قوت کے ماتحت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ زبان کے ثقافتی تصور کا نتیجہ زبان کے تمام گفتاری اور تحریری مظاہر کو گرفت میں لینا تھا، لمحۂ موجود میں بولی جانے والی زبان اور اس زبان میں ظاہر ہونے والے تحریری متون کا علم حاصل کرنا تھا۔ گویا اس ثقافت کی معاصر اور دستاویزی صورتوں تک رسائی پانا تھا اور ثقافت کے علم برداروں کی ذہنی و جذباتی کائنات تک پہنچنے کی کوشش کرنا اور ثقافت کو ثقافت کے علم کے ذریعے اپنے دائرۂ اختیار میں لانا تھا۔ لہٰذا آبادکاروں نے اگر نوآبادیوں کی کلاسیکی زبانوں پر دسترس حاصل کی اور ورناکولر زبانیں سیکھیں تو وجہ ظاہر ہے!

حقیقت یہ ہے کہ نوآبادیات میں زبان کے ثقافتی تصور سے نہ صرف زبان کا تصور وسیع ہوا بلکہ زبانوں کے تقابلی مطالعے کی سائنسی بنیاد بھی رکھی گئی، جس سے زبانوں کی تاریخ اور ان کے باہمی رشتوں کی تفہیم کی راہیں ہموار ہوئیں۔ اگر مغربی دنیا سنسکرت دریافت نہ کرتی تو یہ پیش رفت ممکن نہ تھی۔ اسی وجہ سے ریمنڈ شواب نے سنسکرت کی دریافت کو 'زبانوں کا امریکہ' دریافت ہونے کے مترادف کیا اور شاید اسی وجہ سے اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر میں برطانوی مستشرقین ہندوستانی کلاسیکی زبانوں کے مطالعے کی طرف راغب ہوئے۔ سنسکرت کی دریافت سے لسانی مطالعات میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا اور لسانی مطالعات کو بائبل کے نسلی اور مابعد الطبیعیاتی تعصبات سے نجات ملی۔ میکس ملر نے زبان کی سائنس پر اپنے لیکچر میں واضح کیا کہ بائبل کے اثر سے لسانی مطالعے کا ہر پہلو بگاڑ کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کے مطابق:

"زبانوں کی تاریخ کو نسلوں کی تاریخ سے گڈمڈ کرنے کے عمل نے ہر شے کو بگاڑ دیا، بائبل میں مذکور حقائق کسی بھی طرح اوائل زبانوں کے گروہ کو ضروری قرار نہیں دیتے، عہد نامہ عتیق کے (زبانوں کے) شجرے غیر متعلق ہیں۔ یہ جن اصطلاحات کو استعمال کرتے ہیں وہ ہماری اصطلاحوں سے لگا نہیں کھاتے۔"

یورپیوں نے ہندوستانی زبانوں کا مطالعہ اپنے لسانیاتی نظام معنی کے تحت کیا۔ نوآبادیاتی سیاق میں زبان کا سوال اوّل اوّل ایک ثقافتی رکاوٹ کے طور پر سامنے آیا اور اس لیے ثقافتی رکاوٹ دور کرنے کی غرض سے محکوم ملکوں کی کلاسیکی اور ورناکولر زبانیں سیکھی گئیں، ان کے قواعد، لغات مرتب کیے گئے، ان پر تحقیق کی گئی۔ دراصل ثقافتی رکاوٹ دور کرنے کا یہ نوآبادیاتی طریقہ ہے۔

1873 میں جب انگریزی کو ہندوستان میں ذریعۂ تعلیم اور عدالتی زبان کے طور پر نافذ کیا گیا تو اس کا اصل منشا مشنری مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ یہ بات ثابت کرنے کی باقاعدہ کوشش کی گئی کہ تمام نوآبادیاتی ممالک غیر مہذب ہیں۔

اس لیے انگریزی کا 'مہذب بنانے کی قوت' کے طور تعارف کرایا گیا۔ اہلِ یورپ کا زبان کی تہذیب سازی کی قوت کا تصور 'ورناکولرائزیشن' سے ماخوذ تھا، جس کے ذریعے دیسی انگریزی نے کلاسیکی لاطینی و یونانی کی جگہ لی تھی۔ اسی لیے میکالے نے اپنی مشہور رپورٹ میں یہ عزم ظاہر کیا تھا کہ انگریزی کا ہندوستان کے لیے وہی کردار ہوگا جو لاطینی و یونانی کا مغربی یورپ کے لیے تھا۔

چنانچہ 1844 میں برطانوی استعمار نے فیصلہ کیا کہ سرکاری ملازمتوں میں ان ہندوستانیوں کو ترجیح دی جائے گی جو انگریزی داں ہوں۔ چنانچہ انگریزی نظام تعلیم کے ذریعے زیادہ تر وہ کلرک اور ماتحت ملازم ہی پیدا ہوئے۔ انگریزی "لسانی استعمار" کا مظہر بنی۔ لسانی استعماریت کا سادہ مطلب دوسری زبانوں کی پسپائی اور استحصال ہے۔ لہٰذا انگریزی کی استعماریت کو قائم کرنے کے لیے اسے نہ صرف ریاستی و تعلیمی امور کی زبان بنایا گیا بلکہ سرکاری عہدوں کے لیے لازم کیا گیا اور معاشی مفادات کے حصول کا اہم ذریعہ بنایا گیا نیز اس سے عزت، وقار، برتری، اسٹیٹس کو جوڑ دیا گیا۔

انگریزی کے استعماری غلبے سے ہندوستان کی کلاسیکی اور دیسی زبانوں میں عدم مساوات پیدا ہوگئی۔ ایک نیا طبقہ بھی وجود میں آ گیا جو خالصتاً انگریزوں کے استعماری مقاصد اور مفادات کی تکمیل کے لیے انگریز ہونے کی اداکاری کرتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ کیا انگریزی استعماریت نے زبان کی جس ثقافتی قوت کو محسوس کیا تھا، اس کی مدد سے وہ 'مقامی سوچ' پر غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی یا نہیں؟

■

Aleemuaalh
302, IIIrd Floor, Talat Apt.
Sector-E (New), Tatarpur
Aliganj, Lucknow - 2260243 (UP)

فاروق احمد وانی

ماتاجی جابائی گرلز کالج اندور کے شعبہ اردو کی ادبی خدمات

مدھیہ پردیش ہندوستان کی ایک زرخیز ریاست ہے۔ اسے ہندستان کا دل بھی کہا جاتا ہے۔ مدھیہ پردیش کے کئی ایسے شہر ہیں، جن کا شمار ملک کے اچھے شہروں میں کیا جاتا ہے۔ ان شہروں میں بھوپال، اندور، جبل پور، گوالیار وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اندور شہر جسے صغیر ممبئی (Mini Mumbai) بھی کہا جاتا ہے۔ عہد ماضی میں اس خطے نے تاریخی، علمی اور ادبی حیثیت سے بلند مقام حاصل کیا ہے، اور مسلسل ترقی کی طرف گامزن رہا ہے۔ یہ شہر جس طرح صنعت وحرفت کی وجہ سے بے مثال ہے اسی طرح تعلیم کے میدان میں ریاست کے دوسرے صوبوں سے آگے ہے۔ صوبے کے تعلیمی اداروں میں دیوی اہلیہ یونیورسٹی (اندور یونیورسٹی) کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جہاں ملک بھر سے طلبا وطالبات علم کی پیاس بجھانے آتے ہیں، دیوی اہلیہ یونیورسٹی سے منسلک 270 کالجز ہیں لیکن ستم ظریفی یہ رہی ہے کہ کالجوں کی اس کثیر تعداد میں صرف گیارہ کالجوں میں اردو کی درس وتدریس کا عمل جاری ہے۔ جن میں اولڈ جی ڈی سی (موتی طویلہ)، اسلامیہ کریمیہ کالج، نیو جی ڈی سی قابل ذکر ہیں۔ ان کالجوں میں ماتاجی جابائی گورنمنٹ گرلز پی جی کالج شعبۂ اردو واحد ایسا ایک فعال ادارہ ہے جو اردو زبان وادب کے پھیلاؤ اور اس کی ترقی وترویج کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔

1954 میں اس کالج کی بنیاد ڈالی گئی اور 1970 میں یہاں پر اردو شعبے قائم کیا گیا۔ 1970 سے 1984 تک یہاں پر صرف یو جی (بی اے اردو) کی کلاسز ہوتی تھی۔ 1984 میں یہ کالج یو جی سے پی جی کالج میں تبدیل ہوا۔ اگر ہم شعبے اردو کی بات کریں تو یہ شعبے ہمیشہ اردو ادب کی خدمت میں پیش پیش رہا۔ اس شعبے کی پہلی صدر ڈاکٹر خورشید آرا 73-1970 تک رہی ہے۔ انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس شعبے کی بنیاد کو مستحکم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن زندگی نے ان سے وفا نہ کی اور قلیل عمری میں ان کا انتقال ہوگیا۔

ڈاکٹر خورشید آرا کے بعد ڈاکٹر مختار شمیم 80-1973 تک اس شعبے کے صدر رہے۔ انھوں نے اس شعبے میں رہ کر تدریسی عمل کو آگے بڑھانے میں خونِ جگر صرف کیا۔ ڈاکٹر صاحب بظاہر مزاج سے سخت تھے لیکن بہ باطن وہ بچوں کے ہمدرد اور ہم نوا تھے۔ وہ بچوں کی مشکل کو اپنی مشکل سمجھ کر اس کا ازالہ کرنے میں جڑ جاتے تھے۔ تدریسی عمل کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر مختار شمیم نے اپنے قلم کو جنبش میں لا کر اردو ادب کو قابل قدر تخلیقات سے نوازا، جن میں ظہیر دہلوی حیات وفن (تحقیق)، تناظر وتشخص (تحقیق وتنقید)، ریاست ٹونک اور اردو شاعری (تحقیق)، مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق (تحقیق) پس غبار (مختصر افسانہ)، نام گل (شاعری)، دریچہ گل (شاعری)، ہجر کی صبح ہجر کی شام (شاعری)، معاون مطالعہ (ترجمہ) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین ملک کے نامور رسائل وجرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ انھیں اب تک ریاستی وملکی سطح کی ادبی انجمنوں اور اداروں نے کئی انعامات واعزازات سے نوازا ہے اور آج کل اردو رسالہ ماہنامہ 'ہل چل' کی ادارت کر رہے ہیں۔ ان کا شمار مدھیہ پردیش کے بڑے محققین، ناقدین اور شعراء میں کیا جاتا ہے۔ وہ تقریباً 27 سال تک اس شعبے اردو کی خدمت میں مصروف رہے۔

ڈاکٹر کشور سلطانہ 82-1980 تک صدر شعبہ رہیں۔ جو ڈاکٹر مختار شمیم کی اہلیہ تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس شعبے کی خدمت بغیر کسی تفریق کے کی۔ ڈاکٹر صاحبہ کئی کتابوں کی مصنفہ بھی ہیں۔ ان میں 'جاں نثار اختر حیات و فن'، 'واردات ایک نظر میں' اور مدھیہ پردیش اردو بورڈ کی کئی کتابوں کا ترجمہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر مختار شمیم اور ڈاکٹر کشور سلطانہ نے مل کر طالب علموں کے تحقیقی شعور کو بیدار کرنے کے لیے ایم اے فائنل طالبات سے مقالے سپرد قلم کروائے جن کی تعداد پندرہ ہے۔

1982 سے 1999 تک ڈاکٹر مختار شمیم اس شعبے کے پھر سے صدر مقرر ہوئے۔ اب کی بار ڈاکٹر صاحب نے اس ڈیپارٹمنٹ کے لیے بہت کچھ کیا۔ پی جی کالج ہونے کے بعد ان کی مسلسل کوششوں سے 1986 میں اس شعبہ کو ریسرچ سنٹر (تحقیقی مرکز) کی منظوری مل گئی۔ اب یہ شعبے نہ صرف بی اے اور ایم اے اردو تک محدود رہا بلکہ یہاں پر تحقیق کے دروازے بھی کھولے گئے جو کہ اردو زبان وادب کے لیے ایک مبارک قدم تھا۔ ایسے ہی تحقیقی

مراکز سے اردو زبان زندہ ہے ورنہ عام انسان تو اپنی زبان کھو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بدولت ہی اس شعبے کی اردو لائبریری قائم کی گئی۔ آج اس لائبریری میں تقریباً بیس ہزار کتابیں موجود ہیں جس سے نہ صرف طلباء وطالبات، ریسرچ اسکالرز بلکہ شہر کے اردوشناس لوگ بھی مستفیض ہورہے ہیں۔ اس لائبریری میں ہر مہینے ملک کے معتدد رسائل وجرائد کی رسائی ہوتی ہے۔ جن میں اردو دنیا، فکر وتحقیق، شاعر، ہماری زبان، تہذیب الاخلاق، فکر ونظر، ایوان اردو، ہل چل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جو کہ اردو کے بہتر مستقبل کی ضمانت ہیں۔

1999 سے 2002 تک ڈاکٹر واجد قریشی شعبے کے صدر رہے۔ ڈاکٹر واجد قریشی مدھیہ پردیش کے قابل قدر پروفیسروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے 1968 سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ملکی وبین الاقوامی سطح کے قابل قدر رسائل وجرائد میں ان کے مضامین چھپتے ہیں۔ 'پریم چند کے افسانوں میں حقیقت کا عمل' ان کی ایک اہم کتاب ہیں۔ ان کی ایک نثری تصنیف اور دو شعری مجموعے زیر طباعت ہیں۔ انھوں نے اس شعبے کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے دوسرے پروفیسروں میں خلیل احمد صدیقی، ڈاکٹر عتیق النساء، عبدالواحد خان وغیرہ اہم ہیں۔ کچھ سال پہلے اندور شہر کی اردو درخشندہ ستارہ ڈاکٹر فہمیدہ منصوری 2003 میں اس شعبے میں جاورہ سے منتقل ہوکر آئیں جو اب صدر شعبہ اردو ہیں۔ انھوں نے اس شعبے کی ترقی کے لیے محنت وریاضت کرکے ملکی سطح کے دوسرے شعبے اردو کے مدمقابل بنایا۔ آج اس شعبے میں ڈاکٹر فہمیدہ منصوری، پروفیسر نازنین منصوری اور ڈاکٹر نوشاد عالم درس وتدریس کی ذمے داریاں پوری کررہے ہیں۔ ڈاکٹر نوشاد عالم جز وقتی استاد ہیں۔

یہ کالج اندور شہر میں اردو مضمون کا واحد تحقیقی مرکز ہے جہاں پر ریسرچ اسکالرز کی نگرانی ڈاکٹر مختار شمیم، ڈاکٹر فہمیدہ منصوری اور ڈاکٹر خلیل صدیقی کررہے ہیں۔ اب تک یہاں سے پانچ ریسرچ اسکالروں کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں تفویض کی گئی ہیں۔ اس تحقیقی مرکز سے ان موضوعات پر کام ہوچکا ہے:

(1) عتیق النساء خان (ابراہیم یوسف کی ڈرامہ نگاری) نگراں۔ ڈاکٹر مختار شمیم
(2) ثمینہ خان (حالی کی سوانح نگاری میں سادگی کا عنصر) نگراں۔ ڈاکٹر مختار شمیم
(3) قمر الدین برتر (گوالیار اور اردو ادب) نگراں۔ ڈاکٹر عزیز اندوری
(4) شائلہ خان (نواب حکیم احمد نقوی شخصیت اور فن) نگراں۔ ڈاکٹر عزیز اندوری
(5) صادقہ خان (دھار میں اردو ادب کی سمت ورفتار) نگراں۔ ڈاکٹر عزیز اندوری

آج اس شعبے میں اٹھارہ ریسرچ اسکالرز رجسٹرڈ ہو کر تحقیق کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جن میں یو جی سی نیٹ اور جے آر ایف طلبہ بھی شامل ہیں۔ جو ان موضوعات پر تحقیق کررہے ہیں:

(1) نازنین منصوری (مدھیہ پردیش میں اردو کے نمائندہ محققین)۔ نگراں۔ ڈاکٹر مختار شمیم
(2) فاروق احمد وانی (کشمیر میں اردو افسانہ نگاری نور شاہ کے خصوصی مطالعہ کے پس منظر میں)۔ نگراں۔ ڈاکٹر مختار شمیم
(3) ریاض احمد میر (اردو ادب کی ترقی میں دیگر مذاہب کے قلمکاروں کا حصہ جموں وکشمیر کے حوالے سے)۔ نگراں۔ ڈاکٹر مختار شمیم
(4) توصیف احمد لون (ترنم ریاض ایک مطالعہ اردو فکشن کے حوالے سے)۔ نگراں۔ ڈاکٹر مختار شمیم
(5) مشتاق احمد گنائی (جموں وکشمیر میں اردو غزل آزادی کے بعد نمائندہ غزل گوشعراء کے حوالے سے) نگراں۔ ڈاکٹر فہمیدہ منصوری
(6) محمد حُسین وانی (مشتاق احمد وانی: حیات اور ادبی خدمات)۔ نگراں۔ ڈاکٹر فہمیدہ منصوری
(7) اعجاز احمد میر (جموں وکشمیر میں اردو صحافت کی موجودہ صورت حال)، نگراں، ڈاکٹر فہمیدہ منصوری
(8) شگفتہ شاہین (اقبال کی شاعری میں منظر نگاری)۔ نگراں۔ ڈاکٹر مختار شمیم
(9) شوکت احمد ڈار (کلام اقبال کے مذہبی مصادر)۔ نگراں۔ ڈاکٹر فہمیدہ منصوری
(10) محمد اقبال خان (جدید تنقیدی نظریات ایک مطالعہ)۔ نگراں۔ ڈاکٹر فہمیدہ منصوری
(11) مدثر احمد ڈار (پریمی رومانی: حیات اور نثری خدمات)۔ نگراں۔ ڈاکٹر عثمان انصاری۔ معاون نگراں۔ ڈاکٹر فہمیدہ منصوری
(12) لطیف کمار (تلمیحات حدائق بخشش کا علمی وادبی جائزہ)۔ نگراں۔ ڈاکٹر فہمیدہ منصوری
(13) ناظمہ بانو (اردو کی ترقی میں مدھیہ پردیش کے ادبی اداروں کا حصہ خصوصاً بھوپال کے حوالے سے)۔ نگراں۔ ڈاکٹر فہمیدہ منصوری
(14) مزمل منظور تانترے (جدید مرثیہ نگار نمائندہ قلمکاروں کے حوالے سے)۔ نگراں۔ ڈاکٹر عثمان انصاری

اس شعبہ نے ماضی میں بھی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی تابناک مستقبل کی طرف رواں دواں ہے۔ اب تک اس شعبے کی طرف سے دو ملکی سطح کے سیمینار منعقد کیے گئے ہیں۔ پہلا سیمینار 1990 میں 'مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق' کے موضوع پر ہوا تھا۔ اس میں شرکت کرنے والوں میں پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر بلقیس جہاں، ڈاکٹر محمد شفیع وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دوسرا سیمینار 2000 میں 'فیض احمد فیض' پر ہوا تھا جس میں مہمان خصوصی ڈاکٹر عتیق اللہ تھے۔ اس سیمینار میں بھی ریاستی وملکی سطح کے شعراء وادباء اور محققین و ناقدین نے شرکت فرمائی تھیں۔ اس کالج میں وقتاً فوقتاً توسیعی خطبات کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ اسی اثنا میں 2008 میں 'اقبال کی شاعری' پر ڈاکٹر حدیث انصاری نے خطبہ دیا۔ اس کے بعد 2013 میں 'گوالیار میں اردو نثر' پر ڈاکٹر صدیقی (دہلی) نے لکچر دیا۔ ستمبر 2014 میں ڈاکٹر فہمیدہ منصوری کی سربراہی میں 'ڈاکٹر ابو محمد سحر کی حیات و شخصیت' کے عنوان سے توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا جس کی معاونت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے کی۔ اس خطبے میں مہمان خصوصی کے طور پر ڈاکٹر مختار شمیم کو مدعو کیا گیا تھا۔ اس میں شرکت کرنے والے اشخاص میں ڈاکٹر عزیز اندوری، ڈاکٹر حدیث انصاری، رشید شادانی، پروفیسر نازنین منصوری، ڈاکٹر نوشاد عالم، پرنسپل پروفیسر اُوشا کرشنن اور دیگر پروفیسر کے علاوہ ریسرچ اسکالرز اور طلبا اور طالبات بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ غالب، اقبال، حسرت موہانی، مولانا ابوالکلام آزاد جیسی نامور ہستیوں کی یوم پیدائش اور یوم وفات پر پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ گذشتہ چار سالوں سے دیوی اہلیہ یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویجز کی طرف ایم۔ فل اردو پروگرام جاری کیا گیا۔ یو جی سی (UGC) کے نصاب کے تحت ریسرچ اسکالرز کے کورس ورک (Course work) کرانے کی ذمے داریاں اس کالج کے شعبہ اردو کی پروفیسر فہمیدہ منصوری انجام دے رہی ہیں۔ ان کے علاوہ پروفیسر نازنین منصوری اور ڈاکٹر محمد نوشاد عالم بھی درس و تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

■

Farooq Ahmad Wani S/o GH Hassan Wani
Kripalpora Seri Singhpora Pattan
Baramula, Kashmir - 193121 (J&K)

وہاب قیصر

عہد آصف جاہی میں سائنس اور ٹکنالوجی تحقیق وترقی کے تناظر میں

عہد آصف جاہی کی شروعات 1724 میں میر قمر الدین خاں کے ذریعے سلطنت آصفیہ کی خود مختاری کے اعلان سے ہوتی ہے جو تاریخ دکن میں نظام الملک آصف جاہ اول کے لقب سے پہچانے جاتے ہیں۔ اس عہد کا اختتام نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ سابع کی جانب سے ستمبر 1948 میں ریاست حیدرآباد کے انڈین گورنمنٹ میں انضمام سے ہوتا ہے۔ اس طرح آصف جاہی عہد 224 سال تک برقرار رہا جس میں سات سلاطین دکن نے حکمرانی کی تھی۔ جہاں تک اس عہد میں سائنس کی تحقیقات کی بات ہے تو وہ صرف میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے دور میں فلکیاتی اور میڈیکل سائنس کی تحقیق سے شروع ہوتی ہے۔ جبکہ سائنس اور ٹکنالوجی کی بڑے اعلیٰ پیمانے پر تحقیق وترقی، میر عثمان علی خاں کے دور حکمرانی 1911 سے 1948 تک عمل میں آئی۔

عہد آصف جاہی میں فلکیاتی مشاہدات اور تحقیقات کی ابتدا نظامیہ رصد گاہ (Nizamia Observatory) کے حیدرآباد میں قیام سے ہوتی ہے۔ اس رصد گاہ کو میر محبوب علی خاں کے دور حکومت میں نواب ظفر جنگ نے شاہ کی اجازت سے اپریل 1908 میں قائم کیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس رصد گاہ کو 1919 میں معتمدی تعلیمات کے انتظامی کنٹرول میں جامعہ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ نظامیہ رصد گاہ کو ہندوستان کی دوسری سب سے قدیم رصد گاہ ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ اس رصد گاہ میں جو دوربین نصب تھی وہ جنوب مشرقی ایشیا کی سب سے بڑی دوربین تھی۔ اس کا سب سے پہلا کارنامہ آفتاب کے گردوپیش کا تفصیلی مشاہدہ تھا جو سائنسی اور عملی حیثیت سے نہایت ہی اہمیت کا حامل تھا۔ نظامیہ رصد گاہ نے ستاروں کی نقل وحرکت پر مشتمل نقشہ سازی کا عظیم الشان کام بھی انجام دیا تھا۔ ستاروں کی نقشہ سازی کا یہ کام دراصل پیرس میں منعقدہ ماہرین فلکیات کی کانفرنس میں پیش کردہ تجاویز کا عملی نتیجہ تھا۔ چنانچہ 1917 سے 1946 تک نظامیہ رصد گاہ نے گیارہ جلدوں پر مشتمل Astrograhic Catalogue شائع کیے جو 7 لاکھ 63 ہزار 5 سو 42 ستاروں کے Image Diameters اور ان کی x اور y سمتوں کی پیمائش پر مشتمل تھے۔ اس کارنامہ پر رصد گاہ کی کارکردگی اور اس کے اعلیٰ معیار کا بین الاقوامی سطح پر اعتراف کیا گیا تھا۔ اعتراف کرنے والوں میں فلکیات کے عظیم سائنس داں Sir Frank Daice ' آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر اور صدر شعبۂ بین الاقوامی انجمن فلکیات H.H. Turner اور امریکہ میں ریل یونیورسٹی آبزرویٹری کے پروفیسر Sheleigh Singer جیسے ماہرین فلکیات قابل ذکر ہیں۔

نظامیہ رصد گاہ کے ماہرین نے اجرام فلکی کے مشاہدے کے علاوہ کرۂ ارض کی فضا پر بھی تحقیق کی تھی۔ چنانچہ 15 ستمبر 1929ء کو حیدرآباد میں پہلی مرتبہ اس رصد گاہ کے ماہرین نے Pilot Ballon Station کو فضا میں چھوڑا تھا تاکہ غبارے کے ذریعے فضا کے اوپری حصے میں ہوائی لہروں کا مطالعہ کیا جاسکے۔

عہد آصف جاہی میں شہر حیدرآباد میں کیے گئے اجرام فلکی کے مشاہدات اور فلکیات کی تحقیقات کا جائزہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک پروفیسر محمد عبدالرحمٰن خاں کی کاوشوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ موصوف 1924 سے 1934 تک دس سال کے عرصے کے لیے جامعہ عثمانیہ کے پرنسپل رہ چکے ہیں۔ وہ American Meteor Society جیسے بین الاقوامی ادارے کے لیے ہندوستان میں ریجنل ڈائرکٹر تھے۔ انھیں نیو میکسیکو یونیورسٹی کے Institute of Meteoritics کا ریسرچ ایسوسی ایٹ بھی منتخب کیا گیا تھا۔ کرہ ہوائی کے خطے Ionosphere اور چاند کے گردونواح کے بارے میں ان کے مشاہدات اور انکشاف (ماہرین فلکیات کی رائے کے مطابق) بہت دلچسپ اور کارآمد ثابت ہوئے۔

رحمٰن خاں صاحب 1937 سے 1954 تک نظامیہ رصد گاہ کے ذریعے شہاب ثاقب اور شہابی اجسام کے مشاہدات میں مصروف رہے۔ شہاب ثاقب کے گیارہ ہزار پانچ سو چالیس مشاہدات پر مشتمل ان کی ایک کتاب کو امریکہ کی Smithsonian Astrophysical Observatory نے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی ایک فلکیاتی مظاہر کی توجیہات بھی پیش کیں جن میں شہاب ثاقب کی اوسط کمیت، ان کی منور لکیریں، گرتے وقت آواز کا سنائی دینا' زمین کی وجہ سے چاند کی روشنی میں کمی واقع ہونا اور چاند پر فضا کی غیر موجودگی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

رحمٰن خاں صاحب نے سب سے پہلے شہاب ثاقب سے پھوٹنے والی منور لکیروں کی وضاحت اور تشریح کے ضمن میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ 1936 میں لندن کے سائنس ریسرچ جرنل 'نیچر' میں شائع ہوئے۔ اس میں انھوں نے بتایا تھا کہ شہاب ثاقب سے پھوٹنے والی لکیریں کرہ ہوائی کے صرف 40 تا 80 میل

کی بلندیوں کے درمیان ایک محدود خطے میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا لکھا ہوا ایک مقالہ 1938 ء میں امریکہ کی International Society for Research Meteorites کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا۔ جس میں انہوں نے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ دن میں بارہ بجنے سے پہلے اور بارہ بجنے کے بعد زمین پر گرنے والے شہابی اجسام کی تعداد میں نمایاں فرق کیوں ہوتا ہے۔ اس فرق کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے اس کی وجہ یہ بتلائی تھی کہ بارہ بجنے کے بعد گرنے والے اجسام کی رفتار، بارہ بجنے سے پہلے گرنے والے اجسام کی رفتار سے کم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ تیز رفتار شہابی اجسام ہوا میں جل کر پوری طرح خاک ہونے نہیں پاتے۔ جس کی وجہ سے ان کی تعداد میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔

1941 میں 'نیچر' میں رحمٰن خاں صاحب کا ایک خط شائع ہوا تھا جس میں انہوں نے شہاب ثاقب کی اوسط کمیت کے متعلق سالہا سال سے زیر بحث مسئلے کا حل پیش کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ چاندنی راتوں میں گرنے والے شہابی اجسام کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان اجسام کی حقیقی کمیت، نظری کمیت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

اجرام فلکی کا مشاہدہ کرنے والے اس بات کی توثیق تو کیا کرتے تھے کہ بعض انتہائی روشن شہاب ثاقب کے گرنے پر ایک عجیب قسم کی آواز سنائی دیتی ہے لیکن کسی نے بھی اس کی خاطر خواہ وضاحت نہیں کی تھی۔ رحمٰن خان صاحب نے جنوری 1945 میں اس کی وضاحت کی جو سائنسی جرنلس 'نیچر' اور 'پاپولر اسٹرانومی' میں شائع ہوئی تھی۔

اگست 1945 کے پاپولر اسٹرانومی میں رحمٰن خاں صاحب نے اپنے ایک پیپر 'پرانا چاند نئے چاند کی آغوش میں' کے زیر عنوان اس بات کی وضاحت کی تھی کہ انعکاس نور (Reflection of Light) کے دوران جب سورج کی شعاعیں زمین سے ٹکرا کر چاند پر پڑتی ہیں تو چاند کی روشنی میں کس طرح کمی واقع ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ منعکس شدہ شعاعیں شہاب ثاقب کی بوچھاڑوں (Showers) کے ساتھ منطبق ہوتی ہیں۔ پیپر کے آخر میں انہوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ اس موضوع پر مزید تحقیقات کی جانی چاہیے۔

زمانہ قدیم سے یہ مسئلہ زیر بحث چلا آ رہا تھا کہ چاند کے گرد ہوا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کتنی کثیف ہے؟ اس مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر رحمٰن خاں صاحب نے ایک بصیرت افروز مقالہ لکھا تھا۔ جس میں انھوں نے بتلایا تھا کہ اگر چاند پر تھوڑی بھی ہوا ہو تو زمین کے قطبین (Poles) پر ہونے والے ضیائی مظاہر (Optical Manifestations) کی طرح چاند پر بھی ایسے ہی مظاہر رونما ہونے چاہئیں۔ امریکہ کی Meteorical Society نے موصوف کے اس مقالے کی اشاعت سے قبل کیلی فورنیا یونیورسٹی میں فلکیات کے پروفیسر Joseph Keplan سے تبصرہ کروایا۔ پروفیسر کیپلان نے اپنے تبصرے میں رحمٰن خاں صاحب کے اس خیال سے پورا پورا اتفاق کیا تھا۔ رحمٰن خاں صاحب کا مقالہ اور پروفیسر کیپلان کا تبصرہ دونوں ہی 1946 میں پاپولر اسٹرانومی میں ایک ساتھ شائع ہوئے تھے۔ رحمٰن خاں صاحب کے اس مقالے کی بدولت حیدرآباد کو دنیا بھر میں کافی شہرت حاصل ہوئی تھی۔

عہد آصف جاہی میں حیدرآباد کے لیے یہ بات قابل فخر تھی کہ بین الاقوامی Meteor Society کے صدر پروفیسر P. Oliver نے اپریل 1947 میں اپنی سالانہ رپورٹ میں امریکہ کے ماہرین فلکیات کو شہاب ثاقب کی تحقیق میں رحمٰن خاں صاحب کے اخذ کردہ نتائج کو رہنما خطوط کے طور پر اپنانے کا مشورہ دیا تھا۔

عہد آصف جاہی میں کلوروفارم کا استعمال بحیثیت Anesthesia کس حد تک کامیاب ہے کی جانچ کے لیے معرکتہ الآرا تحقیقی کام شہر حیدرآباد میں انجام دیا گیا تھا۔ اس کو نواب میر محبوب علی خاں کی مکمل سرپرستی حاصل تھی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کلوروفارم کی ایجاد سے قبل آپریشن کے دوران مریضوں کو بے ہوش کرنے کے لیے Ether استعمال کیا جاتا تھا۔ اکثر و بیشتر ایتھر کے استعمال کرنے میں درد اور تکلیف سے تاب نہ لا کر مریض فوت ہو جایا کرتے تھے۔ 1847 کلوروفام ایڈن برگ میں ایجاد ہوا اور Dr. Syme وہیں پر آپریشن کے دوران مریضوں کو بے ہوش کرنے کے لیے اس کا استعمال کرنے لگا تھا۔ اس کے بعد ساری دنیا میں کلوروفارم بحیثیت اینستھیسیا استعمال کیا جانے لگا اور وہ ایتھر کا کامیاب اور موثر نعم البدل ثابت ہوا۔

1855 میں میڈیکل سائنس کی دنیا میں یہ بات مشہور ہونے لگی تھی کہ کلوروفارم کا استعمال مریضوں کے لیے خطرناک ثابت ہو رہا ہے۔ کہا جا رہا تھا کہ کلوروفارم کے استعمال سے مریضوں کے دل مفلوج ہو رہے ہیں اور ان کی موت واقع ہو رہی ہے۔ حالانکہ Dr. Syme کے شاگرد دنیا کے مختلف حصوں میں کلوروفارم کا آزادانہ استعمال کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ حیدرآباد میڈیکل اسکول' جو بعد میں عثمانیہ میڈیکل کالج کہلانے لگا' اس سے منسلک افضل گنج میں قائم عثمانیہ دواخانہ اور ریزیڈنسی کے دواخانے میں Dr. Syme کے شاگرد تنفسی نظام پر نظر رکھتے ہوئے کلوروفارم کا استعمال کر رہے تھے۔

1870 اور 1880 کے دوران میڈیکل سائنس کی دنیا میں یہ بات تسلیم کی جا چکی تھی کہ کلوروفارم بحیثیت اینستھیسیا استعمال کرنا خطرناک ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے کلوروفام مریضوں کو آپریشن کے دوران بے ہوش کرنے کے لیے کتنا سودمند ہے، 1879 میں Glasgow میں ایک کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ اس کمیشن کی تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ کلوروفارم ایک بہت ہی غیر محفوظ اینستھیسیا ہے۔ اس کو استعمال کرنے سے مریض کا بلڈ پریشر دھیرے دھیرے کم ہو کر حرکت قلب بند ہو جاتی ہے۔ گلاسگو کمیشن نے میڈیکل سائنس کے ماہرین سے یہ سفارش کی تھی کہ وہ کسی ایسی کیمیائی شئے کی دریافت کریں جس کو کلوروفارم کی بجائے اینستھیسیا کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

1888 میں حکومت حیدرآباد نے کلوروفارم پر تحقیق کے لیے ایک کمیشن کے قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ اس وقت Surgeon Major Lawrie ریزیڈنسی سرجن اور حیدرآباد میڈیکل اسکول کے پرنسپل تھے۔ انھیں نظام دکن میر محبوب علی خاں کی سرپرستی حاصل تھی۔ وہ Dr. Syme کے شاگرد تھے اور ان کی تعلیمات پر اعتماد بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ حیدرآباد کلوروفارم کمیشن کے قیام میں ڈاکٹر میجر لاری نے کلیدی رول ادا کیا تھا جو 1888 ہی میں قائم ہوا۔ اس کے ذمے ایک ایسا کام سونپا گیا تھا جو نہ صرف سائنسی تحقیقات کے لیے ضروری تھا بلکہ پوری انسانیت کے لیے عملی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کمیشن نے سال بھر مختلف قسم کے 27 تجربات کیے اور اپنی رپورٹ حکومت حیدرآباد کو 1889 کی ابتدا میں پیش کر دی۔ جس کی رو سے کلوروفارم ایک محفوظ اینستھیسیا ثابت ہوا۔ اس طرح حیدرآباد کلوروفام کمیشن کی رپورٹ، گلاسکو کمیشن کی رپورٹ کی نفی کرتی تھی۔

حیدرآباد کلوروفام کمیشن کی رپورٹ انگلینڈ کے نامی گرامی میڈیکل جرنل The Lancet میں شائع ہوئی۔ جس کے ساتھ ہی یہ رپورٹ بحث کا موضوع بن گئی۔ ڈاکٹروں کی ایک بڑی تعداد نے اس رپورٹ پر شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا۔ یہاں تک کہ The Lancet جرنل بھی اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیوں کہ گلاسکو کمیشن کی رپورٹ ہی مصدقہ تصور کی جانے لگی تھی۔

حیدرآباد کلوروفارم کمیشن کی رپورٹ پر جو ردعمل کا

اظہار کیا گیا تھا اس کے جواب میں بادشاہ وقت نواب میر محبوب علی خاں کے توسط سے ڈاکٹر لاری نے The Lancet جرنل کو یہ پیش کش کی تھی کہ وہ اپنے کسی نمائندہ ڈاکٹر کو حیدرآباد بھیجیں تاکہ وہ تمام تجربات دہرائے جاسکیں جو کلوروفارم کمیشن نے انجام دیے تھے۔ یہ پیش کش The Lancet کے 21 ستمبر 1889ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ اس کام کے لیے حضور نظام نے انگلینڈ سے آنے والے ڈاکٹر کے لیے اپنے صرف خاص (Private Purse) سے ایک ہزار پونڈ کی رقم اور دوطرفہ ٹکٹ کی پیش کش کی تھی۔ مزید اس بات کی پیش کش بھی کی گئی تھی کہ ڈاکٹر کا قیام، حیدرآباد میں حکومت کے مہمان کی حیثیت سے رہے گا۔

میڈیکل جرنل The Lancet نے حضور نظام کی پیش کش قبول کی اور 21 اکتوبر 1889ء کو Dr. Lauder Brunton اس کے نمائندے کی حیثیت سے انگلینڈ سے حیدرآباد آئے۔ حکومت حیدرآباد کی درخواست پر حکومت ہند نے انڈین میڈیکل سروس کے ڈاکٹر Surgeon Major Bomford کو حیدرآباد بھیجا تاکہ انھیں قائم ہونے والے دوسرے کمیشن میں شامل کیا جاسکے۔ حیدرآباد کلوروفارم کے دوسرے کمیشن میں ڈاکٹر میجر لاری صدر اور Dr. Bomford معتمد مقرر کیے گئے۔ اس کے اراکین Dr. Brunton، ڈاکٹر رستم جی اور پہلے کمیشن کے سارے اراکین شامل رہے۔

حیدرآباد کلوروفارم کے دوسرے کمیشن نے 23 اکتوبر 1889 سے اپنا کام شروع کیا۔ یہ لوگ روزانہ سوائے تعطیلات کے صبح سات بجے سے شام پانچ بجے تک تجربات کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ 18 دسمبر 1889 تک جاری رہا۔ اس کمیشن نے پہلے کمیشن میں کیے گئے 27 تجربات کو دہرائے۔ اس کے علاوہ مزید کئی تجربات کرتے ہوئے جملہ 430 تجربات کیے۔ ان میں بہت زیادہ تجربات کتوں اور بندروں پر کیے گئے۔ جس کے لیے 354 کتوں اور 70 بندر استعمال کیے گئے۔ چند تجربات گھوڑوں، بکروں، بلیوں اور خرگوشوں پر بھی کیے گئے۔ اس طرح حیدرآباد کلوروفارم کے دوسرے کمیشن کے نتائج نے پہلے کمیشن کے نتائج پر مہر تصدیق ثبت کی۔

14 جون 1890 کے برٹش میڈیکل جرنل میں British Medical Association Committee on Anaesthetics کے اراکین نے حیدرآباد کلوروفارم کمیشن کی کارکردگی پر اپنی ستائش کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا:

''سب سے پہلے ہم حیدرآباد کلوروفارم کمیشن کے اراکین کو انسانیت کے لیے بہت اہمیت کی حامل تحقیقات کی تکمیل پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اس کامیابی کا سہرا نہ صرف کمیشن کے ان اراکین کے سر جاتا ہے جنھوں نے تجربات انجام دیے۔ بلکہ ہز ہائی نس حضور نظام کی حکومت، ان کے وزیراعظم اور خاص کر ڈاکٹر لاری بھی اس کامیابی میں برابر کے شریک ہیں جن کے جوش و

خروش کی بدولت یہ تحقیقی کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے صدر مقام عصری Physiological Laboratory سے استفادہ کرتے ہوئے اتنے اعلیٰ معیار کی سائنسی تحقیقات کی تکمیل کرنا، سائنسی ترقی کے لیے ایک تاریخی اہمیت کا کارنامہ ہے۔''

کلوروفارم کے دوسرے کمیشن کی کارکردگی میں جن حضرات نے کافی دلچسپی لی ان میں سرآسمان جاہ وزیراعظم حکومت حیدرآباد قابل ذکر ہیں۔ نواب میر محبوب علی خاں بھی بذات خود اس کمیشن کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے دو مرتبہ اپنے اسٹاف کے ساتھ تجربہ گاہ گئے اور تجربات کا مشاہدہ کیا۔

حیدرآباد کلوروفارم کے دوسرے کمیشن نے اپنی رپورٹ 1891 میں پیش کردی تھی۔ جس کی بدولت دنیائے میڈیکل سائنس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ بے ہوشی کے لیے استعمال کیا جانے والا کلوروفارم کسی بھی طرح سے قلب پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس طرح کلوروفارم کمیشن کی بدولت عہد آصف جاہی میں حیدرآباد اور ہندوستان کو انیستھیسیا پر ریسرچ کے لیے بین الاقوامی مقبولیت حاصل ہوئی جو تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

آصف جاہی سلطنت میں 1939 میں دوسری جنگ عظیم کے چھڑ جانے سے جہاں کئی ایک امور پر اثرات مرتب ہوئے تھے وہیں پر بیرونی ممالک سے دواؤں کی فراہمی مسدود ہوچکی تھی۔ چنانچہ 1940 میں کئی ایک بیماریوں کے علاج کے لیے درکار دواؤں کو حیدرآباد کی سرکاری صنعتی تجربہ گاہ میں تیار کیا گیا۔ ان دواؤں میں ملیریا کے علاج کے لیے Ateberine جراثیم کے Infection کو دور کرنے والی دوا Sulphonamides، سردی زکام سے نجات دلانے والی دوا Benzedrine اور قلب کو طاقت پہنچانے والی ٹانک Coramine قابل ذکر ہیں۔ ان دواؤں کے علاوہ چند کیمیائی اشیاء جیسے نشاستہ یعنی Starch، پاؤڈر اور مائع کی حالت میں گلوکوز اور Casein Plastics وغیرہ یہاں کی تجربہ گاہوں میں بنائے گئے۔

حیدرآباد میں زرعی پیداوار میں بہتری لانے کے لیے بھی تحقیقی کام انجام دیے گئے۔ اس غرض کے لیے 1941ء میں ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا گیا تھا۔ اس محکمے کے تحت چاول، جوار، گیہوں، کپاس اور ارنڈی سے متعلق تحقیقی کام انجام دیے گئے۔ جس کے نتیجے میں ان تمام فصلوں کی اچھی قسمیں حاصل ہوسکیں۔ اس کے علاوہ کئی ایک ترقیاتی اسکیموں کو بھی یہاں روبہ عمل لایا گیا۔ ان میں خشک اراضی کی کاشت، دالوں اور نیشکر کی کاشت اور انھیں حشرات (Insects) سے محفوظ رکھنے کی اسکیم، میووں کی پیداوار سے متعلق اسکیم، مونگ پھلی اور ارنڈ کی کھلی سے کھاد کی تیاری اور روغن دار تخم کو حشرات سے محفوظ رکھنے کی اسکیمیں شامل ہیں۔

عہد آصف جاہی میں سائنس کی تحقیق کے لیے 1942 میں 'حیدرآباد سائنٹفک ریسرچ بورڈ' قائم کیا گیا۔ اس بورڈ نے آٹھ تحقیقاتی اسکیموں کو منظور کیا تھا۔ جن میں نباتاتی تیلوں، جنگلاتی پیداواروں، صنعتی خمیروں، ایندھن، ریشوں اور چھالوں کی مصنوعات، کیمیائی اشیاء اور دواسازی سے متعلق تحقیقات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ سائنسی تحقیقات کو فروغ دینے کے لیے حیدرآباد میں 'سرکاری دارالتجربہ' کے نام سے ایک تحقیقی ادارہ بھی

قائم کیا گیا تھا۔ حیدرآباد سائنٹفک ریسرچ بورڈ کے قیام کے ایک سال بعد اس کے تحت مختلف ذیلی کمیٹیاں بنائی گئیں۔ جن میں نباتاتی تیل کے استعمال کی کمیٹی، آگ کی تحقیقاتی کمیٹی، دوا سازی اور دواؤں کی کمیٹی، کثیف کیمیائی اشیا کی کمیٹی اور چینی مٹی کی تحقیقاتی کمیٹی شامل ہے۔ یہ تمام تحقیقاتی کمیٹیوں نے اپنے اپنے انداز میں تحقیقات انجام دے کر حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

ڈیزل اور پٹرول کی قلت ہر دور میں ایک مسئلہ بنی رہی ہے۔ ان کے نعم البدل کی تلاش کے لیے ہم جس قدر فکر مند ہیں اتنے ہی فکر مند آج سے 75 سال قبل کے ماہرین بھی ہوا کرتے تھے۔ یہ وہ دور ہے جب کہ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ناکہ بندی ہوچکی تھی اور بیرونی ممالک سے پٹرول کا منگوایا جانا ایک دشوار کن امر بن چکا تھا۔ چنانچہ 1942 کے اختتام پر سائنس کی تحقیقات سے متعلق پیش کردہ ایک رپورٹ میں اس بات کا انکشاف کیا گیا تھا کہ مونگ پھلی کے تیل کو بطور ایندھن استعمال کرنے کے ضمن میں کافی تجربات کیے گئے۔ جن کا نتیجہ یہ نکلا کہ اعلیٰ درجے کے معدنی تیل کے مقابلے میں مونگ پھلی کا تیل استعمال کرنے سے طاقت کا کوئی قابل قدر نقصان نہیں ہوتا۔ دونوں تیلوں کے استعمال کی صورت میں صرفہ بھی اتنا ہی آتا ہے۔ البتہ مونگ پھلی کے تیل کو ایندھن کی طرح استعمال کرنے کی صورت میں انجن میں کاربن زیادہ پیدا ہوتا ہے۔

انگلینڈ کے مشہور سائنس داں اور رائل سوسائٹی لندن کے سکریٹری A.B. Hill نے 1944ء میں حیدرآباد کی صنعتی تحقیقاتی مجلس کے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی ان کوششوں کو بہت زیادہ قابل تعریف قرار دیا تھا جو حیدرآباد کی صنعتی ترقی سے متعلق ایک خاص پروگرام کے تحت انجام دی جارہی تھیں۔ یہ تحقیقاتی کام جو سرکاری دارالتجربہ اور جامعہ عثمانیہ کے تجربہ خانوں میں انجام دیے جاتے تھے، مقامی صنعتوں کے فروغ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔ چنانچہ 1944 تک یہاں موم جامہ، طباعتی روشنائی، کاغذ اور مقوہ تیار کرنے کے لیے مفید تجربات کیے جاچکے تھے۔ ان کے علاوہ ہڈیوں سے سوپر فاسفیٹ اور گلو، مقامی مٹی سے الومینا فرک اور المونیم سلفیٹ، تمباکو کے بیکار اجزاء سے نیکوٹین، شیرے سے Oxalic Acid اور الکوحل سے Acetic Acid تیار کرنے کے متعلق کامیاب تجربوں سے استفادہ کیا گیا۔ حیدرآباد کے لیے یہ بات باعث افتخار ہے کہ حشرات کش دوا DDT کو ہندوستان میں سب سے پہلے یہاں کے سرکاری صنعتی تجربہ خانے میں تیار کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں تجرباتی کام اگست 1944 میں شروع کیا گیا اور صرف دو ہفتوں کی مدت میں 15 پاؤنڈ DDT تیار کرلیا گیا۔ جس کے بعد اس کے بڑے پیمانے پر تیاری کا مسئلہ حکومت کے زیر غور تھا۔ یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ DDT کو امریکی ماہرین، دوسری جنگ عظیم کی ایک اہم ایجاد تصور کرتے ہیں۔

1944 میں سنٹرل لیبس کے قیام کی بدولت حیدرآباد میں سائنسی اور صنعتی تحقیقات کا ایک سنہرا دور شروع ہوا۔ ان لیبس کو حکومت حیدرآباد کی ہر لحاظ سے سرپرستی حاصل تھی۔ یہی وہ لیبس ہیں جو آزادی کے بعد آر آر لیبس Regional Research Labs کہلائے اور سائنس اور ٹکنالوجی میں اپنی منفرد تحقیقات کی بدولت پورے ہندوستان میں شہرت پائے۔ آج یہی لیبس انڈین انسٹی ٹیوٹ آف کیمیکل ٹکنالوجی IICT کی شکل اختیار کرچکے ہیں۔

فصلوں کو حشرات (Insects) سے محفوظ رکھ کر انہیں تباہی سے بچانا اور مٹی میں پیداواریت کو بڑھانا ایسے امور ہیں جن کا ہر کاشت کار خواہش مند رہتا ہے تاکہ اچھی فصلوں کو زیادہ سے زیادہ اگایا جاسکے۔ سنٹرل لیبس نے اپنے قیام کے ابتدائی دور ہی سے اس جانب کافی توجہ دی۔ تل کے تیل سے یہاں ایک طاقتور حشرات کش Sesamin (Insecticide) تیار کی گئی تھی۔ اس بات کا پتہ بھی لگایا گیا تھا کہ سیتا پھل کے بیجوں سے نکالا گیا تیل بہت زہریلا ہوتا ہے اور یہ فصلوں کو نقصان پہنچانے والے حشرات کو ختم کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ بھی مشاہدہ کیا گیا تھا کہ گوبھی کی فصلوں میں پائے جانے والے حشرات سیتا پھل کے بیجوں کے تیل کی بو سے دور بھاگتے ہیں۔ سنٹرل لیبس میں مقامی طور پر دستیاب چٹانوں میں پایا جانے والا مادہ Felspar سے Potash کو حاصل کیا گیا جو کھاد کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ ایک اور اچھی کھاد سوپر فاسفیٹ کو ہڈیوں کے برادے سے حاصل کیا گیا۔ اس وقت اس بات کی امید کی جارہی تھی کہ اگر مستقبل میں ان حشرات کش دواؤں اور کھادوں کو بڑے پیمانے پر تیار کیا جائے تو ریاست حیدرآباد کے کاشتکاروں کے لیے یہ بہت بڑی نعمت ثابت ہوں گے۔

ہندوستان میں ریاست حیدرآباد تیل کے بیجوں کے ایک بہت بڑے پیدا کنندہ کی حیثیت سے مشہور تھی۔ جن میں مونگ پھلی اور ارنڈی کے بیجوں کی پیداوار قابل ذکر ہے۔ شہر حیدرآباد کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ یہاں کی لیباریٹریوں میں مونگ پھلی کے تیل اور الکوحل کے ذریعے ڈیزل کا نعم البدل تیار کیا گیا اور اس کی مدد سے محکمہ روڈ ٹرانسپورٹ کی بسوں کو چلایا بھی گیا تھا۔ مونگ پھلی کے تیل سے یہاں ایک ایسی گیس بھی تیار کی گئی جو مٹی کے تیل کا نعم البدل ثابت ہوئی اور ارنڈی کے تیل سے ایک ایسا Lubricating Oil تیار کیا گیا تھا جس کو Steam Engines میں معدنی تیل کی بجائے استعمال کیا گیا۔ یہاں تک کہ مونگ پھلی کے چھلکوں سے پانچ ذیلی صنعتی پیداواریں حاصل کی گئیں جو انتہائی کارآمد ثابت ہوئیں۔ ان پیداواروں میں Acetic Acid، Methyl Alcohol، بھڑکنے والی گیس، کول تار اور کوئلہ شامل ہیں۔

عہد آصف جاہی میں حیدرآباد کی لیباریٹریوں میں ہڈیوں کے ذریعے Edible Gelatin کے اچھے نمونے تیار کیے گئے۔ ریت اور چونے کے پتھر سے مخصوص اینٹیں تیار کی گئیں جو عام اینٹوں کے مقابلے میں آٹھ گنا زیادہ طاقتور تھیں۔ Fructose کی صنعتی پیمانے پر تیاری، Methyl Iodide اور Ethyle Iodide جیسی عمدہ کیمیائی اشیاء کی تیاری کے سستے طریقوں کی دریافت، ہاتھ سے بنائے جانے والے کاغذ کے لیے درکار سستے گودے کی فراہمی اور موٹر گاڑیوں کے آگ نہ پکڑنے والے Upholsters کی تیاری، شہر حیدرآباد کے چند اہم کارناموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

عہد آصف جاہی میں شعبۂ انجینئرنگ میں تحقیق کی ضرورت شدت سے محسوس کی گئی تھی۔ جس کی پابجائی کے لیے 1945ء میں انجینئرنگ ریسرچ لیبس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ لیبس پانچ مختلف لیباریٹریوں Soil Mechanic Lab، Hydralic Lab Engineering، Engineering Material Lab، Physics and Chemistry Labs اور Engineering Statistics Lab پر مشتمل تھے جو آزادی کے بعد 'آندھراپردیش انجینئرنگ ریسرچ لیبس' کہلائے۔ اس کے بعد جب آندھراپردیش کی تقسیم ہوکر تلنگانہ ریاست قائم ہوئی تو ان لیبس کا نام 'تلنگانہ انجینئرنگ ریسرچ لیبس' ہوگیا۔

■

S.A. Wahab 'Qaiser'
Professor
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad - 500032 (Telangana)

محمد اسلم فاروقی

کالج کی سطح پر اردو تدریس میں ٹیکنالوجی کا استعمال

موجودہ دور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے غلبے والا دور ہے۔ تعلیمی شعبے میں اس دور کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا اساتذہ اور طلبا دونوں کے لیے ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ٹیکنالوجی کے معاملے میں طلبا اساتذہ سے آگے ہوتے ہیں اور مشاہدہ ہے کہ آج ہر طالب علم اسمارٹ فون اور کمپیوٹر کے استعمال سے بخوبی واقف ہے لیکن اردو میڈیم کے طلبا کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ صد فیصد اسمارٹ فون یا کمپیوٹر رکھتے ہیں یا وہ اس کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں وسائل کی کمی کے سبب بھی غریب طلبا چاہتے ہوئے بھی ٹیکنالوجی کو حاصل نہیں کر سکتے لیکن کالج میں دستیاب وسائل سے انھیں استفادہ کرنا چاہیے اس کے لیے اساتذہ کی رہبری ضروری ہے۔ کالج کی سطح پر اردو تدریس کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ جونیر اور ڈگری کالج میں زبان دوم کے طور پر اردو پڑھائی جاتی ہے۔ اکثر اردو پڑھانے والے اساتذہ کی سوچ ہوتی ہے کہ زبان دوم ہی ہے نا اسے کیوں اہمیت دی جائے کچھ نوٹس فراہم کر دیے جائیں کوئی گائیڈ مہیا کر دی جائے طلبا امتحان کامیاب کر لیں گے۔ لیکن اپنے مضمون سے حقیقی ہمدردی رکھنے والا استاد اپنے مضمون کی تدریس سے کبھی سمجھوتہ نہیں کرے گا وہ دستیاب وسائل سے اردو مضمون کی تدریس کو بہتر بنائے گا۔ اور خود کو اور اپنے طلبا کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرے گا۔

اردو تدریس میں ٹیکنالوجی کے استعمال سے قبل آیئے دیکھیں کہ ہمارے اساتذہ' طلبا کے ساتھ اور کالجوں میں کون کون سے ٹیکنالوجی کے وسائل موجود ہیں۔ کمپیوٹر اور اسمارٹ فون اب ٹیکنالوجی کے دو اہم ذرائع کے طور پر ہمارے سامنے دستیاب ہیں جب کہ کالج میں اسمارٹ کلاس اور ای کلاس روم اور کمپیوٹر لیب کی سہولتیں طلبا اور اساتذہ دونوں کو دستیاب ہیں۔ اردو اساتذہ کو اپنے گھر میں کمپیوٹر اور دوران سفر یا کالج میں لیپ ٹاپ ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ اسمارٹ فون تو اساتذہ اور طلبا دونوں استعمال کرتے ہیں۔ ان دنوں جیو انٹرنیٹ کی بدولت انٹرنیٹ ڈاٹا بھی وافر مقدار میں سبھی کو دستیاب ہے۔ اور انٹرنیٹ کے سرچ انجن گوگل کے دعوے ''یہاں سب کچھ ملتا ہے'' کے مطابق انٹرنیٹ کو اگر تعلیم کے لیے استعمال کیا جائے تو بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ ٹیکنالوجی کے وسائل کمپیوٹر اور اسمارٹ فون کی دستیابی کے بعد جب اس میں اردو کے استعمال کی بات آتی ہے تو سب سے پہلے اردو اساتذہ اور پھر طلبا کو یہ معلوم رہنا چاہیے کہ اب کمپیوٹر کے کسی بھی حصے میں یعنی ایم ایس آفس کے کسی بھی پروگرام میں اردو یونیکوڈ نظام کے بدولت اردو لکھی جاسکتی ہے۔ اردو میں ایم ایس آفس ورڈ فائل بنائی جاسکتی ہے۔ اردو میں پاور پوائنٹ کے ذریعے اسباق تیار کیے جاسکتے ہیں اور کسی بھی قسم کا کام اردو میں کیا جاسکتا ہے۔ کمپیوٹر میں اردو فانٹس شامل کرنے کے لیے اردو نستعلیق فانٹس ایم بلال ایم کی ویب سائٹ سے حاصل کیے جاسکتے ہیں جہاں پاک اردو انسٹالر پر کلک کرنے سے فائل ڈاؤن لوڈ ہوجائے گی پروگرام سٹ اپ کرنے اور سسٹم ری اسٹارٹ کرنے کے بعد نیچے ٹاسک بار کے دائیں جانب En یا UR دکھائی دے گا۔ آپ کو اردو لکھنا ہے تو UR منتخب کرتے ہوئے اردو لکھ سکتے ہیں۔ پہلے کمپیوٹر پر اردو لکھنے کے لیے ان پیج سافٹ ویئر استعمال کیا جاتا تھا یہ ایک تصویری سافٹ ویئر ہے اور انٹرنیٹ سرچنگ میں کام نہیں آتا اس لیے اب کمپیوٹر میں جو بھی مضامین وغیرہ لکھے جا رہے ہیں وہ سب ایم ایس ورڈ میں یونیکوڈ نظام کے تحت نستعلیق فانٹس استعمال کر کے لکھے جا رہے ہیں۔ فون

میں اردو لکھنا کمپیوٹر کی بہ نسبت آسان ہے۔ گوگل پلے اسٹور سے سوفٹ کی یا کوئی بھی اردو کی بورڈ ڈاؤن لوڈ کرکے اردو لکھا جاسکتا ہے۔ سوفٹ کی میں یہ سہولت ہے کہ انگریزی کی طرح اردو میں بھی اوپر الفاظ کی پیش قیاسی کی جاتی ہے مثال کے طور پر ایک مرتبہ آپ نے اردو ٹائپ کیا اگلی بار 'ا' لکھتے ہی اردو دکھائے گا جسے منتخب کرنے سے اردو ٹائپ ہوجائے گا۔ اس طرح آپ پہلی مرتبہ جو بھی لفظ لکھیں گے وہ سافٹ ویئر کی میموری میں محفوظ ہوتا جائے گا اور آگے تیز رفتاری سے ٹائپ کرسکتے ہیں۔ جن لوگوں کو اردو ٹائپ میں دشواری ہے ان کے لیے گوگل نے نئی سہولت گوگل وائس ٹائپنگ کی شروع کی ہے پہلے یہ سہولت انگریزی میں تھی اب بشمول اردو تمام بڑی زبانوں میں آواز کی مدد سے ٹائپ کرسکتے ہیں۔ اس کے لیے فون سٹنگ میں گوگل وائس ٹائپنگ میں صرف اردو بھارت منتخب کرتے ہوئے ہم فیس بک واٹس اپ یا فون کے کسی بھی پیغام میں آواز کی مدد سے اردو ٹائپنگ کرسکتے ہیں یعنی آپ درست تلفظ کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر واضح آواز میں اردو بولیں تو آپ کے کہے گئے الفاظ اردو میں ٹائپ ہوتے جائیں گے غلط الفاظ کو درست کرنے کی بھی سہولت موجود ہے۔

جب اردو کے استاد اور طالب علم کو یہ پتہ چل جائے کہ کمپیوٹر اور اسمارٹ فون میں اردو لکھ سکتے ہیں تو اس سہولت کو وہ اردو پڑھنے اور اردو کے فروغ کے لیے استعمال کریں۔ کہا جارہا ہے کہ اب ہمارے طلبا کے ہاتھ سے اخبار اور کتاب چلی گئی ہے اس کی جگہ اسمارٹ فون نے لے لی ہے تو اردو کا ایک ہمدرد استاد اپنے طلبا کو اسمارٹ فون کے اسکرین پر اردو اخبار اور اردو کتابیں فراہم کرسکتا ہے اور ان سے مطالعہ بھی کرواسکتا ہے۔ واٹس اپ پر ان دنوں دو ریسرچ اسکالرس سید عمران اور وفعدار عبدالبصیر اردو دنیا کے نام سے ایک گروپ چلا رہے ہیں جس میں صبح کے اوقات میں سبھی مقبول اردو اخبارات اور رسائل کی پی ڈی ایف فائل بھیج رہے ہیں اردو کا استاد اس گروپ میں شامل ہو اور طلبا کے لیے ایک الگ گروپ بنائے اور روزانہ اس میں اردو اخبارات شیئر کرے اور طلبا سے کہے کہ وہ ان اخبارات کا مطالعہ کریں استاد اردو کمرہ جماعت میں ان سے اخبارات کی اہم خبروں کے بارے میں استفسار کرے۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر بھی اخبارات کے ای ایڈیشن دستیاب ہیں۔ ان کے مطالعے کی ترغیب دلائی جائے۔ اسی طرح کتابوں کے مطالعے کے ضمن میں یہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو کی مقبول کتابیں شعرائے اردو کا مجموعہ کلام اب گوگل پلے اسٹور اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔ استاد اردو ان کتابوں کو اپنے فون سے طلبا تک پہنچائے اور ان کتابوں سے کوئی مفوضہ کام دیا جائے تو طلبا غور سے کتابیں پڑھیں گے۔ گوگل پلے اسٹور پر کلیات اقبال۔ کلیات غالب۔ کلیات پروین شاکر اور دیگر کتابیں ہیں۔ تدریسی ضرورت کے تحت بھی ہم طلبا سے ان کتابوں کا مطالعہ کرواسکتے ہیں۔ تلنگانہ میں ڈگری سال اول کی کتاب مطالعہ ادب میں ایک مضمون حکایات سے متعلق ہے۔ اس مضمون کی تدریس کے بعد گھر کے کام کے طور پر راقم نے فون سے حکایات سعدی کتاب ڈاؤن لوڈ کی اور طلبا کو شیئر اٹ کے ذریعے کتاب تقسیم کی۔ اور طلبا کو اس کتاب سے گھریلو کام کرکے لانے کے لیے کہا۔ اسی طرح ابوالکلام آزاد کے خطوط کے مجموعہ غبار خاطر سے طلبا کو گھریلو کام دیا گیا۔ اقبال کے منتخب اشعار لکھ کر لانے کے لیے کہا گیا۔ راقم نے سبھی ڈگری نوٹس کی پی ڈی ایف فائل تیار کی ہیں اور طلبا کو فون کے ذریعے منتقل کردیا ہے طلبا اپنی سہولت سے گھر میں یا کہیں پر بھی فائل کھول کر اپنے نوٹس کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ اسی طرح یہ نوٹس گری راج کالج کی ویب سائٹ شعبہ اردو کے بلاگ پر دستیاب ہیں۔ اردو کے استاد کو نئی چیزیں سیکھتے رہنا چاہیے۔ راقم کی کوشش تھی کہ کوئی ایسا سافٹ ویئر مل جائے جس سے کمپیوٹر اسکرین پر موجود مواد کو ویڈیو کی شکل دی جائے۔ چنانچہ راقم نے اوکیام نامی اسکرین کیاپچر سافٹ ویئر کی مدد سے اردو نوٹس کے ویڈیو تیار کیے ہیں جس کے لیے نوٹس کے مواد کو پہلے طلبا کی مدد سے آڈیو ریکارڈ کیا گیا پھر کمپیوٹر اسکرین پر نوٹس کی ان پیج فائل کو اوپن کرتے ہوئے فون کے آڈیو فائلس پلے کرتے ہوئے آواز اور تحریر کے ساتھ ویڈیو تیار کیے گئے ہیں اور ان ویڈیوز کو یوٹیوب پر اپ لوڈ کرکے تلنگانہ اور آندھرا پردیش کے سبھی اردو اساتذہ کو دیے گئے ہیں تاکہ وہ اپنے طلبا تک ان ویڈیوز کو پہنچائیں۔ یہ ویڈیوز یوٹیوب پر aslam faroqui ٹائپ کرتے ہوئے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ طلبا کو درست تلفظ کے ساتھ اردو اسباق سنانا۔ طلبا کو شامل کرتے ہوئے یہ پراجکٹ مفت میں تیار کیا گیا۔ اسی طرح شعبہ اردو گری راج کالج نظام آباد کی جانب سے اردو رسم الخط کے تحفظ اور فروغ کا ایک اختراعی پروگرام طلبا کی مدد سے کیا گیا۔ پروگرام کا نام 'فون میں اردو گھر گھر میں اردو' رکھا گیا۔ طلبا کو اس نعرے کی پرنٹڈ جرسی پہناتے ہوئے شہر کے اسکولوں کالجوں اور بازاروں میں گشت کی گئی اور اساتذہ اردو طلبا اور شہر کے لوگوں کے اسمارٹ فون میں اردو سافٹ ویئر شامل کرتے ہوئے برسر موقع لوگوں کو فون میں اردو ٹائپ کرنا سکھایا گیا۔ لوگوں نے اس مہم کا خیر مقدم کیا اور جب فیس بک پر اس مہم کی تصاویر پیش کی گئیں تو ملک اور بیرون ملک لوگوں نے اس اختراعی پروگرام کا خیر مقدم کیا۔ NAAC معائنے میں اس طرح کی سرگرمیوں سے اچھے نشانات حاصل ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح شعبہ اردو گری راج کالج کے طلبا کے لیے ایک فیس بک گروپ 'شمع فروزاں' تیار کیا گیا ہے۔ جس میں کالج کے موجودہ اور سابق طلبا اور ملک و بیرون ملک کے ماہرین تعلیم شامل ہیں۔ طلبا کے لیے اس گروپ میں اردو ادب کا انتخاب۔ اہم نوٹسیں اور دیگر معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہمیں شکایت تھی کہ طالب علم کالج کو پابندی سے نہیں آتے اور وہ امتحانات میں بہتر مظاہرہ نہیں کرتے لیکن اب ٹیکنالوجی کی مدد سے ایک استاد اور طلبا ہمیشہ رابطے میں رہ سکتے ہیں اور انھیں سماجی رابطے سے تعلیم کی جانب راغب کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سبھی کلاس کے طلبا کے الگ الگ واٹس اپ گروپ اور فیس بک گروپ بنادیے گئے ہیں۔ جن سے طلبا اپنے اساتذہ سے رابطے میں رہتے ہیں۔ اساتذہ اردو کو چاہیے کہ وہ اپنے طلبا کو لازم کردیں کہ وہ فیس بک اور واٹس اپ پر صرف اردو میں ہی لکھیں۔ طلبا کو مختلف عنوانات کے تحت اشعار پوسٹ کرنے یا موضوعاتی مذاکرے میں اپنے خیالات پیش کرنے کے لیے کہا جائے۔ راقم نے ان گروپس میں طلبا کو اہم معلوماتی ویڈیوز شیئر کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ کچھ طلبا نے آئی اے ایس کی تیاری کے لیے مواد کی تیاری فراہم کرنے کا مطالبہ کیا تھا انھیں بھی اسی واٹس اپ **مسیجنگ** سہولت سے معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ کالج میں طلبا کے تقریری مقابلے ہوں یا کوئی پروگرام اسے فیس بک لائیو کے ذریعے براہ راست نشر کیا جاسکتا ہے۔ طلبا کا مظاہرہ آپ کے دوست احباب دیکھیں گے اور ان کے تاثرات سے اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔ کالج کے طلبا کی تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے ان کی تخلیقات کو ٹائپ کرکے شعبہ اردو کے آن لائن میگزین میں شائع کیا جائے۔ استاد اردو کمرہ جماعت میں بھی ٹیکنالوجی کو استعمال کرسکتا ہے۔ ابھی بھی ہر جماعت میں اسمارٹ بورڈ نہیں ہے اور ہم ای کلاس روم میں روزانہ کلاس نہیں لے سکتے دوران تدریس استاد اردو کو لگتا ہے کہ طلبا کو انٹرنیٹ سے کوئی چیز دکھائی جائے یا کوئی آواز سنائی جائے مثال کے طور پر آپ غالب کی

غزل پڑھا رہے ہیں تو اپنے فون میں غالب کی تصویر سرچ کرکے دکھا سکتے ہیں غالب کی زندگی پر بنی فلم اور سیریل کے ویڈیو یوٹیوب پر دستیاب ہیں۔ اس میں سے کوئی ویڈیو آپ فوری طلبا کو دکھانا چاہتے ہیں لیکن آپ کو لگتا ہے کہ آپ کے فون کی آواز کمرہ جماعت کے سبھی طلبا تک نہیں پہونچ رہی ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ بازار میں ان دنوں چھوٹا سا بلوٹوتھ اسپیکر صرف تین سو روپے میں دستیاب ہے جسے چارجنگ کے بعد ایک گھنٹہ بڑی آواز کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے فون سے اس بلوٹوتھ اسپیکر کو جوڑ کر ہم دوران تدریس کمرہ جماعت میں کوئی بھی ویڈیو کی آواز کو بڑی آواز میں سنا سکتے ہیں۔ راقم نے اردو نوٹس کے جو ویڈیو تیار کیے ہیں دوران تدریس سبق کے اعادے کے لیے ان اسپیکر سے مدد لی جارہی ہے طلبا خاموشی سے آواز سنتے ہیں اور ان کی تدریس کا عمل جاری رہتا ہے۔ پہلے تدریسی ساز و سامان میں کتاب ڈسٹر چاک پیس وغیرہ تھے اب اسمارٹ فون بھی ہمارے تدریسی آلات کا اہم حصہ بن گیا ہے۔ استاد اردو اگر ٹیکنالوجی سے جڑا ہو تو وہ تعلیم کے فروغ میں ٹیکنالوجی کو استعمال کرسکتا ہے۔ اچھی آواز کے حصول کے لیے آڈیو آؤٹ پٹ جیک میں کیبل لگا کر ایمپلی فائر میں لگا دینے سے آواز صاف آتی ہے اور تصویر پروجیکٹر پر آتی ہے ایک لیکچر میں دونوں طرف سے بات کی گئی۔ اس تجربے کو جاری رکھتے ہوئے راقم نے نظام آباد سے ایم وی ایس کالج براہ راست طلبا کو لیکچر دیا۔ جب اس لیکچر کی تصاویر فیس بک پر ڈالی گئیں تو لکھنؤ سے معاشیات کی ایک لیکچرر محترمہ عذرا بانو نے کہا کہ وہ بھی اس طرح کا آن لائن لیکچر دینا چاہتی ہیں تو اس کا انتظام کیا گیا اس طرح ایک اردو استاد کی پیش رفت سے معاشیات مضمون میں آن لائن لیکچر کروایا گیا۔ اس تجربے کو دیکھ کر مانو کے اردو ریفریشر کورس میں ڈاکٹر نسیم الدین فریس نے مجھ سے اس ٹیکنالوجی کی تفصیلات لیں اور حیدرآباد میں علیل ماہر دکنیات ڈاکٹر محمد علی اثر کے گھر لیپ ٹاپ لے جا کر ریفریشر کورس کے شرکا کے لیے کامیاب آن لائن لیکچر کروائے۔ اس طرح کے لیکچر کی خاص بات یہ ہے کہ وقت اور اخراجات سے بچا جاسکتا ہے۔ مغربی ممالک میں اب سمینار کی جگہ ویب نار اسی طرز پر ہورہے ہیں۔ اب اسمارٹ فون پر آئی ایم او کالنگ یا واٹس اپ ویڈیو کالنگ سہولت ہے۔ گوگل پلے اسٹور میں فون کے اسکرین کو کمپیوٹر پر پیش کرنے کی سہولت ہے اس طرح ہم فون پر لیکچر دے کر بھی اس کی تصویر اور آواز کو بڑے اسکرین پر پیش کرسکتے ہیں۔ اردو اساتذہ اپنے سمینار کے ویڈیوز اور اہم لیکچر کو فون پر ریکارڈ کرکے یوٹیوب پر اپ لوڈ کرسکتے ہیں راقم نے یہ سلسلہ چار سال قبل شروع کیا اور اب تک میرے ڈیڑھ سو سے زائد ویڈیوز یوٹیوب پر موجود ہیں اور انھیں دیکھنے والوں کی تعداد دس ہزار سے زائد ہوچکی ہے۔ اگر ہم ان ویڈیوز کے ٹائٹل مقبول رکھیں جیسے میرا ایک لیکچر ہے 'ایتھکس اینڈ ہیومن ویلیوز' تو سرچنگ میں زیادہ لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ یوٹیوب پر اپنے ویڈیوز پر اشتہارات شروع کرنے کی سہولت بھی ہے جسے ایڈسنس کہتے ہیں اگر یہ شروع کیا جائے اور آپ کے ویڈیوز کو ہزاروں لوگ دیکھتے ہیں تو آپ کو یوٹیوب ڈالر کی شکل میں معاوضہ بھی دے گا بہت سے ہنرمند نوجوان کامیڈی ویڈیو بنا کر یوٹیوب سے پیسے کما رہے ہیں۔ استاد اردو اگر اپنے لیکچر کا ویڈیو ریکارڈ کروائے تو اس کی سی ڈی کالج لائبریری میں رکھ دے۔ آج کل کالج کی لائبریری کے ایک ہال میں ایک بڑا مانیٹر لگایا جا رہا ہے۔ اور اگر کسی دن لیکچرر غیر حاضر ہو تو لائبریری کا انچارج طلبا کے لیے اس مضمون سے متعلق سی ڈی لگائے اور ساری کلاس ایک لیکچرر کی غیر موجودگی کے باوجود وقت پر ایک اہم لیکچر سے مستفید ہوسکتی ہے۔ اگر آپ اچھے قلم کار ہیں اور اردو میں معیاری کالم لکھتے ہیں تو اردو بلاگ بنا کر اس پر اپنی تحریریں پیش کریں اور اسے سوشل میڈیا پر شیئر کریں اس پر اشتہارات پیش کریں آپ اپنے قلم سے پیسے کما سکتے ہیں۔ اردو استاد کی اگر کوئی کتاب شائع ہوئی ہو تو وہ اسے اردو کتب کی کسی ویب سائٹ پر پیش کرسکتا ہے راقم کی تین کتابیں بزم اردو ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ ڈاکٹر فضل اللہ مکرم صاحب کی اردو ویب سائٹ جہان اردو ان دنوں مقبول ہے اس پر اپنے مضامین اور کتابیں پیش کرسکتے ہیں۔ اردو کے استاد کو تدریس کے علاوہ تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہنا چاہیے اور انھیں یو جی سی کے مقرر کردہ رسائل میں شائع کروانا چاہیے۔ تحقیقی مضامین لکھنے کے دوران ہمیں کوئی کتاب درکار ہو تو اب کتب خانے کا چکر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اردو کتابوں کی مقبول ویب سائٹ ریختہ ڈاٹ کام' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ویب سائٹ یا بزم اردو پر موجود قدیم و جدید بہت سی کتابیں آپ کو مطالعے کے لیے مل جائیں گی جس سے آپ اپنے تحقیقی کام میں مدد لے سکتے ہیں۔ اساتذہ اردو کو چاہیے کہ وہ اپنے مضامین انٹرنیٹ کے مشہور اردو ویب سائٹس مضامین ڈاٹ کام۔ جہان اردو۔ بصیرت آن لائن اور دیگر ویب سائٹس پر پیش کرسکتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب آرزو تھی کہ ہماری تصویر یا نام گوگل سرچ میں نظر آجائے اگر آپ کوئی تحریر اپنی تصویر کے ساتھ گوگل میں اپ لوڈ کرتے ہیں تو آپ کا نام گوگل ویب میں اور تصویر گوگل امیجز میں نظر آئے گی۔ اردو استاد کو چاہیے کہ وہ خود بھی ٹیکنالوجی کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا رہے اور اپنے طلبا کو بھی ٹیکنالوجی کو تعلیم اور ترقی میں استعمال کرنے کے لیے کہے۔ لوگ شکوہ کرتے ہیں کہ ہمارے پاس ٹیکنالوجی کے حصول کے وسائل نہیں ہیں تو ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیں کہ جب ہم دوسرے کاموں میں خرچ اور اسراف کرتے ہیں ایک اسمارٹ فون کے لیے رقم کیوں اکٹھا نہیں کرسکتے۔ اردو اساتذہ اور طلبا کے لیے ضروری ہے کہ وہ ٹیکنالوجی سیکھنے میں دلچسپی دکھائیں آپ کوئی بھی نئی چیز سیکھنا چاہتے ہیں تو یوٹیوب میں مناسب سوال ٹائپ کریں آپ اپنی زبان میں اس مسئلے کا حل دیکھ سکتے ہیں۔ بہرحال حالات سے ہم آہنگ ہونا ہی زندگی کی علامت ہے۔ اور امید ہے کہ اردو طلبا اور اساتذہ بھی زندگی کی اس دوڑ میں آگے رہیں گے۔

■

> **اردو استاد کو چاہیے کہ وہ خود بھی ٹیکنالوجی کے بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتا رہے اور اپنے طلبا کو بھی ٹیکنالوجی کو تعلیم اور ترقی میں استعمال کرنے کے لیے کہے۔ لوگ شکوہ کرتے ہیں کہ ہمارے پاس ٹیکنالوجی کے حصول کے وسائل نہیں ہیں تو ہم اپنی زندگی کا جائزہ لیں کہ جب ہم دوسرے کاموں میں خرچ اور اسراف کرتے ہیں ایک اسمارٹ فون کے لیے رقم کیوں اکٹھا نہیں کرسکتے ۔ اردو اساتذہ اور طلبا کے لیے ضروری ہے کہ وہ ٹیکنالوجی سیکھنے میں دلچسپی دکھائیں آپ کوئی بھی نئی چیز سیکھنا چاہتے ہیں تو یوٹیوب میں مناسب سوال ٹائپ کریں آپ اپنی زبان میں اس مسئلے کا حل دیکھ سکتے ہیں۔ بہرحال حالات سے ہم آہنگ ہونا ہی زندگی کی علامت ہے ۔**

Dr. Mohammed Aslam Farooqui
Asst. Prof. & Head, Dept of Urdu
Girraj Govt College (A)
Nizamabad - 503002 (Telangana)
email.: draslamfarooqui@gmail.com

ونڈوز 7 میں مدد لینا
(Getting Help in Windows 7)

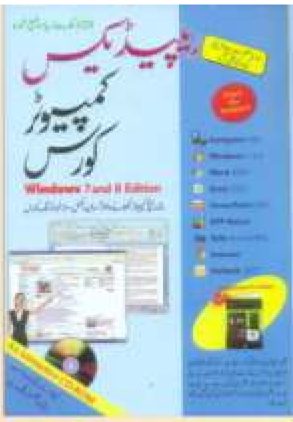

ونڈوز 7 ایسا آپریٹنگ سسٹم ہے، جو بہت ہی عام فہم اور استعمال کرنے میں آسان ہے۔ ونڈوز 7 کو سیکھنے اور اچھی طرح استعمال کرنے کے لیے ونڈوز 7 میں ہی ایک آن لائن مدد (Online Help) سہولت دستیاب ہے، جس کا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس سہولت کے ذریعے آپ سبھی امدادی اشیا تک جاسکتے ہیں اور اپنی خواہش کے مطابق پسندیدہ موضوع (Topic) کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

امدادی پروگرام شروع کرنے کے لیے اسٹارٹ مینو (Start Menu) میں 'Help and Support' آپشن کو کلک کیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کی اسکرین پر ونڈوز ہیلپ (Windows Help) کا ڈائیلاگ باکس تصویر W-4.2 کی طرح کھل جائے گا۔

ڈائیلاگ باکس کے مینو بار میں چار آئیکان دیے گئے ہیں۔ ان میں سے تیسرے آئیکان، جو کہ Browse Help کو دکھاتا ہے، اسے کلک کریں۔ اسے کلک کرنے سے مدد کی فہرست مختصراً نظر آتی ہے۔ اس میں تمام امدادی اشیا کو اوپر سے نیچے منظم طریقے سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ ان سبھی کے آگے ایک بند کتاب کا نشان بنا ہوتا ہے، جس کا مطلب ہے کہ ان موضوعات میں کچھ ذیلی موضوعات بھی ہیں۔ آپ ان موضوعات پر کلک کرکے ان سے متعلق

تصویر W-4.1: اسٹارٹ (Start) مینو

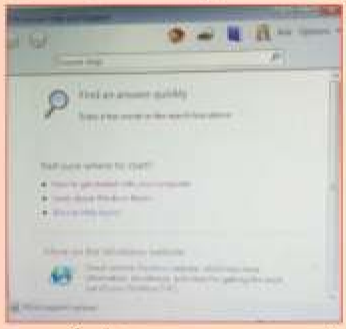

تصویر W-4.2: ہیلپ (Help) ڈائیلاگ باکس

جانکاری حاصل کرسکتے ہیں۔ اس ونڈو سے واپس پچھلی ونڈو میں جانے کے لیے 'Back' ٹول بٹن (←) کو کلک کیجیے اور کسی اگلی ونڈو میں جانے کے لیے 'Forward' ٹول بٹن (→) کو کلک کیجیے۔

جو تفصیلی جانکاری تصویر W-4.3d میں دکھائی جارہی ہے، آپ مینو بار میں پرنٹ آئیکان دبا کر اس جانکاری کا پرنٹ بھی لے سکتے ہیں۔ مینو بار میں ہوم (Home) آئیکان دبانے سے آپ پھر سے تصویر W-4.2 کی طرح پہلی اسکرین پر آجائیں گے۔

اس ونڈو میں سب سے اوپر ایک ہیلپ باکس ہے، جس میں آپ کسی مد (Specific Item) کا نام ٹائپ کرنے کے بعد Search Help بٹن یا انٹر دبا کر اس سے متعلق جانکاری حاصل کرسکتے ہیں۔

ٹیکسٹ ایریا میں 'Learn about Windows Basics' کلک کرنے پر ونڈوز آپریٹنگ اور آپ کے کمپیوٹر سے جڑی جانکاری دستیاب ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے آپ کمپیوٹر کے مختلف حصوں، ڈیسک ٹاپ کے اجزاء، پروگراموں، فائلوں، فولڈروں، انٹرنیٹ، ای میل اور نیٹ ورک کے بارے میں جان سکتے ہیں۔

ونڈوز 7 میں مدد سہولت سے باہر نکلنے کے لیے بند بٹن (X) پر کلک کیا جاتا ہے۔ ■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

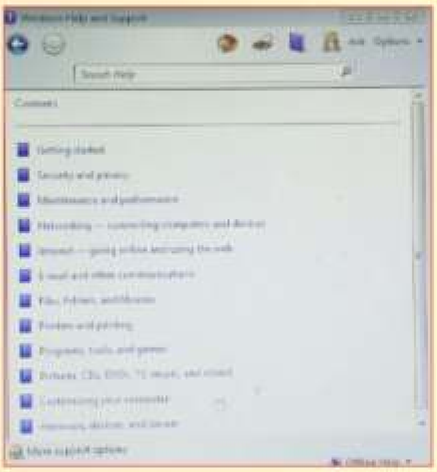

تصویر W-4.3a: ہیلپ مینو میں موضوعاتی فہرست

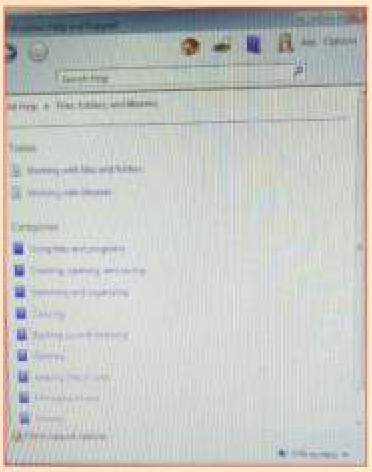

تصویر W-4.3b: ذیلی موضوعات کی فہرست

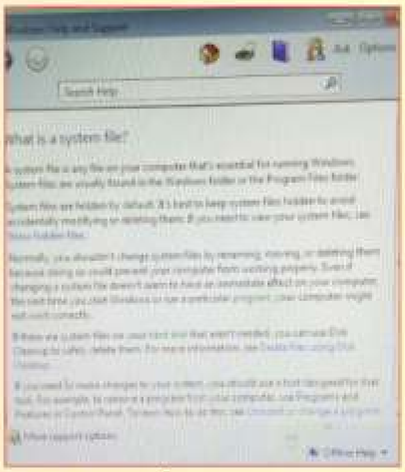

تصویر W-4.3d: ہیلپ مینو کے ذریعے تفصیلی جانکاری حاصل کرنا

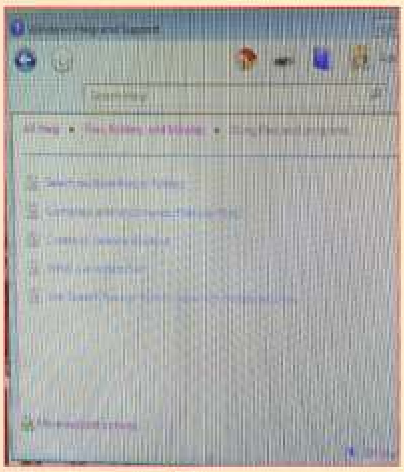

تصویر W-4.3c: ذیلی موضوعات کی تفصیلی فہرست

تبصرہ وتعارف

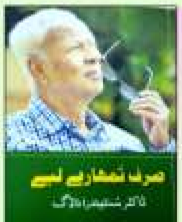

صرف تمہارے لیے

مصنف: ستیہ ندرا ناڈگ، مترجم: ماہر منصور

صفحات: 139، قیمت: 85 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ماہ نور، ایف 33، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب کنڑ زبان کے مشہور ومقبول شاعر اور انگریزی زبان کے پروفیسر ڈاکٹر سُمتیندر اناڈگ کی خودنوشت منظوم سوانح حیات 'دام پیتا گیتا' ہے، جس کا راست منظوم اردو ترجمہ 'صرف تمہارے لیے' ماہر منصور نے کیا ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی نے شائع کیا ہے۔

بظاہر یہ ایک ترجمہ ہے لیکن دراصل یہ ایک کان ہے، واقعات کی، اقوال مشاہیر کی اور ان کے منبع ومخرج کی اور یہ ایک جیتی جاگتی مثال ہے ان کے روز وشب میں واقع ہونے والے خوشگوار وناخوشگوار واقعات کی، جس کا مصنف/ شاعر نے کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔ اس طویل منظوم سوانح میں استعارے، تکنیک اور کچھ سطریں رگ وید، اپنیشد، رامائن، مہابھارت، ہندوستانی یوگا، شاستر اور سنسکرت سے مستعار لی گئی ہیں۔

اس سوانح کی سب سے منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی ہے اور ایک اچھی غزل کے ہر لفظ کی طرح جاندار، رسیلا اور بولتا ہوا ہے۔

عرض مترجم کے تحت ماہر منصور کے دعوے کی میں تصدیق کرتی ہوں جس میں وہ کہتے ہیں کہ ان کی نظر سے گزری ہوئی سوانح عمریوں میں کنڑ کے صاحب طرز مشہور شاعر پروفیسر سُمتیندر اناڈگ کی یہ سوانح عمری 'دام پیتا گیتا' منفرد خصوصیت کی حامل ہے۔ جس میں دلچسپ، غیر معمولی واقعات زندگی کو ناڈگ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ کسی سرحد میں محدود نہ رہ کر ساری دنیا پر چھا جانے کے لیے کافی ہے۔

مترجم یہ بھی عرض کرتے ہیں کہ جب انھیں اس ترجمے کی ذمہ داری دی گئی تو انھوں نے اسے خوشی خوشی قبول کیا اور جب اس سوانح کے چند اقتباسات مشہور شاعر، ادیب اور مترجم آنجہانی بلراج کومل (دہلی) کی موجودگی میں خود ستیہ ندرا ناڈگ کی زبانی نے تو اسی وقت ناڈگ صاحب نے اس کے ترجمے کی اجازت دی۔

اس منظوم سوانح کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اب تک انگریزی، مراٹھی، بنگالی، تمل، تلگو، ہندی اور ملیالم وغیرہ زبانوں میں بھی اس کے ترجمے شائع ہوچکے ہیں۔

قبل اس کے کہ کتاب پر گفتگو کی جائے مختصراً تعارف اس کنڑ کے عظیم شاعر کا کرا دینا مناسب ہے۔

ڈاکٹر ستیہ ندرا ناڈگ ریاست کرناٹک کے ضلع چکمگلور کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس وقت پیدا ہوئے جب جنگ آزادی شباب پر تھی اور ملک میں آزادی حقیقت بننے ہی والی تھی، ایسے ماحول میں کنڑ زبان سے تعلیمی سفر شروع کرکے ناڈگ نے امریکہ کی ٹمپل یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی اور 1960 میں جدید شاعر کی حیثیت سے اپنی ایک منفرد پہچان بنائی۔ عرض مترجم کے بعد کتاب میں حرف آغاز سے کتاب کا آغاز کیا گیا ہے جو دراصل کتاب کا پہلا باب ہے، حرف آغاز کے تحت ناڈگ نے اس وقت کے مشہور شعرا ودانشور کی فرمائش کے نتیجے میں اپنی ازدواجی زندگی پر مبنی ایک نغمہ پیش کیا ہے جسے شجاعت کے گیت سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کا پہلا باب 'جانِ منٗ' ہے اور نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس میں بیان اس سکھی کا ہے جو ان کی سب سے قریبی دوست تھیں جسے شاعر اپنی شریک حیات بتاتے ہیں۔ 'جانِ منٗ' کے تحت شاعر نے اپنی ازدواجی زندگی کی تاریخ ہی نقل کی ہے۔ اگلے باب میں شاعر اپنے بچپن کے حالات پر آئینہ دکھاتا نظر آتا ہے جس میں بچپن کے واقعات اور گاؤں کے وہ مناظر شاعری میں قید کیے ہیں جو پڑھنے سے ایک عینی مشاہدہ کرنے کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ چونکہ یہ پوری تصنیف ایک سوانح ہے لہٰذا اس میں ان پہلوؤں سے بھی گفتگو کی گئی ہے جب شاعر پہلی بار اپنی بیوی سے ملاقات کرتا ہے یا جب وہ ایک عیسائی لڑکی سے ناکام محبت کی داستان پیش کرتا ہے پھر اگلے ہی پل وہ اپنی شادی اور ہنی مون کا ذکر کرتا ہے اور اپنے وہ منصوبے بھی بیان کرتا ہے جس میں وہ ایک تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا خواب بھی دیکھتا ہے۔ الغرض بچے کی پیدائش، بیوی کا حسن سلوک ہر ایک عنوان کو شاعر نے اپنا موضوع شاعری بنایا ہے۔

لیکن سب سے اہم ہے مترجم ماہر منصور کی باریک بینی اور ترجمے کی فنی مہارت جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی اس کو شاعر نے آزاد نظم کے انداز میں اردو میں ہی ساری گفتگو کی ہے۔ دوران مطالعہ مجھے کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ یہ کسی اور زبان سے ترجمہ ہے۔ ایک نظم بطور مثال پیش کرتا ہوں:

گاندھی جی کا جس دن قتل ہوا، وہ تو خیر اپنی جگہ
پر، اسی دن سے اپنے ضمیر کو ٹٹولنا، میرا معمول بن گیا
انھوں نے اپنے ملک کی خاطر/ اپنی ازدواجی زندگی کی خوشیوں کو قربان کر دیا
اور کستوری جیسی کستور با کی زندگی کو کھنگال کر/ دیش کی نذر کر دیا
سچ کہنے میں جھجک کیسی؟/ شرمانا بھی نہیں چاہیے
مگر ایسا راستہ، پہاڑوں سے ہو کر آتا ہے/ پیر پھسلا، تو گیا پاتال میں
اور میرے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں، جب بلندی سے نیچے دیکھتا ہوں

اپنی شریکِ حیات کے لیے ایک جگہ لکھتے ہیں:

اپنی ذات کے آگے بڑھنے کا واحد راستہ تخلیق ہے
تم نے میری تخلیق کی اور میں نے تمہاری/ اپنی تنہائیوں کو کھو کر
ہم دونوں/ ایک جان دو قالب ہو گئے

مجھے قوی امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی یہ پیش کش اردو حلقے میں خوب پذیرائی حاصل کرے گی، ویسے سوانح عمری کی اثر انگیزی باذوق قارئین کی محتاج ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی سوانح ہے جس کے مطالعے سے دنیا کے گھنے جنگلات کے ساتھ ساتھ انسانی خوشبو بھی محسوس کی جائے گی۔

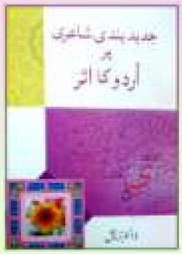

جدید ہندی شاعری پر اردو کا اثر

مصنف: ڈاکٹر نریش

صفحات: 155، قیمت: 90 روپے، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عمران عاکف خان، 259،

تاپتی ہاسٹل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

اردو اور ہندی کا جنم مادر ہندوستان کے پیٹ سے دو بہنوں کی صورت میں ہوا تھا۔ کچھ عرصے تک یہ بہنیں ساتھ پلی، بڑھیں اور کھیلی، ایک دوسرے کی ہمدرد و غم خوار بنی رہیں، ان کے دم سے اس آنگن اور گھرانے میں اجالا تھا اور چاند تارے جگمگاتے تھے۔ مگر پھر نہ جانے اس گھرانے کی خوشیوں اور ان بہنوں کو کس کی نظر لگی کہ ان دونوں بہنوں میں لامتناہی دوریاں آگئیں۔

مگر خدا کا شکر ہے کہ اب وہ دھند چھٹ رہی ہے اور اردو۔ ہندی اب قریب آ رہی ہیں۔ ہندی، اردو کو گلے لگا رہی ہے اور اردو، ہندی کو۔ اور دونوں زبانوں کو قریب لانے کی کوشش ہو رہی ہیں۔

'جدید ہندی شاعری پر اردو کا اثر' ڈاکٹر نریش کی ایسی ہی کوشش ہے جس میں اردو اور ہندی شاعری کے ڈانڈے نہایت خوب صورتی سے ملائے گئے ہیں۔

کتاب کی ابتدائی سطور میں اردو کی ابتدا، نشو و نما، ترقی، فروغ، ارتقا و عروج کے قدیم فسانے ہیں جن میں نیا پن یہ ہے کہ ان میں جدت کا تڑکا دے دیا گیا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر نریش کے تحقیقی مقالے پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے نہایت منصفانہ اور تحقیقی انداز میں ان تمام محرکات کا جائزہ لیا ہے جن سے اردو۔ ہندی کے درمیانی فاصلے کم ہوں اور اردو۔ ہندی اتحاد کی پر زور وکالت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ہندی شعرا کی اکثریت نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ہمیشہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اردو شاعری کا اثر قبول کیا ہے۔ یہ اثر ان کی لفظیات پر بھی پڑا ہے، اسلوب پر بھی اور فکر پر بھی۔ اس کتاب میں اسی اثر کا تفصیلی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرا مقصد دونوں میں سے کسی ایک زبان کی برتری ثابت کرنا نہیں ہے بلکہ میری دلی خواہش ہے کہ ہندی والے اپنے ادبی کلچر میں اردو کلچر کا ادغام کریں اور اس گنگا جمنی کلچر کو تقویت پہنچائیں، جو ہندوستانیت کی اصل پہچان ہے۔'' (اسی کتاب سے، ص: 8)

مذکورہ بالا اقتباس ڈاکٹر نریش کی دلی مراد اور منشا کا مفصل بیان ہے جس میں انھوں نے دل کھول کر وہ بات کہی ہے جس کی صدیوں سے ضرورت تھی۔

ڈاکٹر نریش نے اردو ادب و شاعری کی متعدد اصناف کے اثرات کا جائزہ جدید ہندی شاعری پر متعدد انداز سے لیا ہے جن میں زبان، بیان، اسلوب، لہجہ، چھند، علامت، روایت، تہذیب، تلمیح، غزل، رباعی، مرثیہ، نظم وغیرہ اصناف شامل ہیں۔ انھوں نے مثالوں میں اردو شاعری کا بہترین انتخاب پیش کیا ہے۔ یہ انتخاب اس شاعری اور اس تہذیب کا نادر انتخاب ہے جو بیش قیمت ہونے کے ساتھ وراثت کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

کتاب کے سرورق پر ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا عکس اور وہ رنگ موجود ہے جن جن میں روحانیت اور ہندوستانیت جھلکتی ہے۔

155 صفحات کی اس کتاب میں ڈاکٹر موصوف نے کوزے میں دریا سمونے کی کوشش کی ہے۔ ایک تاریخ اور ایک عہد کا بیان و فسانہ، بین السطور موجود ہے۔ یہ کتاب خود دعوت مطالعہ دیتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ کتاب کا وزن اور وژن کتاب کے مطالعے سے طے ہوگا اور کتاب کے قارئین اس کے مطالعے سے اپنی تسکین کریں گے۔

قومی اردو کونسل کی یہ پیش کش اپنی دیدہ زیبی اور حسن و پرکاری کا نمونہ ہے جو اردو حلقوں میں ڈاکٹر نریش کی علمیت اور فکروں کو بلند کرے گی۔

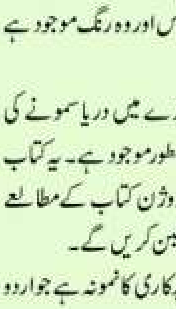

آئینۂ جہاں (رپورتاژ، جلد پنجم، ششم)

مصنف: قرۃ العین حیدر، تحقیق و ترتیب: جمیل اختر، سنہ اشاعت: 2016

صفحات: جلد پنجم 407، جلد ششم 371

قیمت: جلد پنجم 182، جلد ششم 170

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد رکن الدین، ریسرچ اسکالر، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'آئینۂ جہاں' (پانچویں اور چھٹی جلد) میں قرۃ العین حیدر کے گیارہ رپورتاژ شامل ہیں۔ دراصل رپورتاژ اور سفرنامے کی ہیئت ایک ہے تاہم ان میں زبان و بیان کا فرق ہے۔ رپورتاژ افسانے کی زبان میں لکھا جاتا ہے اور چوں کہ اس میں حقائق سے پردہ پوشی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے اس لیے حقائق سے پردہ پوشی کی اس صنف میں قطعی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں خود قرۃ العین حیدر رقم طراز ہیں:

''رپورتاژ اور سیدھے سادے سفرنامے میں محض انداز بیان کا فرق ہے۔ رپورتاژ افسانے کی زبان میں لکھا جاتا ہے، اس میں زیب داستان بھی اسی حد تک ہوتی ہے کہ اس سے حقائق کی پردہ پوشی نہ ہو یا واقعات کو غلط رنگ میں نہ پیش کیا جائے۔ مثال کے طور پر افسانے اور حقیقت کا امتزاج ہمیں یلدرم کے مضمون 'سفر بغداد' میں ملتا ہے جو 1904 میں لکھا گیا اور جسے اردو کا پہلا رپورتاژ کہا جاتا ہے۔ اس روداد میں بغداد جانے والے راوی کو راستے میں سندباد جہازی ملتے ہیں جو حالات حاضرہ پر تبصرہ کرنے کے بعد عالم اسلام کی ابتر حالت پر آنسو بہاتے ہوئے اچانک غائب ہو جاتے ہیں''۔

قرۃ العین حیدر نے اردو رپورتاژ کو منفرد انداز و اسلوب عطا کیا اور ایک نئی سمت

بخشی۔ ان سے قبل جو رپورتاژ اردو میں موجود تھے ان میں وہ خوبیاں نہیں ملتیں جو ان کے یہاں ہیں۔ قرۃ العین حیدر جہاں دیدہ خاتون تھیں، انھوں نے جن جن ملکوں اور شہروں کا سفر کیا ان کی تاریخ، تہذیب وثقافت، ادب وسیاست اور طرز معاشرت کو اپنی تحریروں میں اتار دیا ہے۔ اس کی نظیر اس سے قبل لکھے ہوئے رپورتاژ میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ قرۃ العین حیدر کا پہلا رپورتاژ 'لندن لیٹر' 1953 میں 'نقوش' لاہور میں شائع ہوا تھا۔ بشمول 'لندن لیٹر' قرۃ العین حیدر کے گیارہ رپورتاژ ہیں، جن میں سے چھ رپورتاژ پانچویں جلد میں ہیں جن کے عناوین درج ذیل ہیں:

(1) 'لندن لیٹر' اس رپورتاژ میں لندن کا ذکر ہے۔ (2) 'ستمبر کا چاند' اس میں جاپان کی سیر وسیاحت کی روداد ہے۔ (3) 'پدماندی کنارے' غیر منقسم ہندوستان کا ایک اہم حصہ بنگلہ دیش کے بارے میں ہے جو سیاسی اتھل پتھل کی آماجگاہ آج بھی ہے اور جسے 1971 میں آزاد ملک کا درجہ ملا۔ (4) 'چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا' برٹش حکومت نے ہندوستانیوں کے لیے پورٹ بلیئر، جزائر انڈمان نکوبار میں جیل بنوایا تھا جسے کالا پانی بھی کہا جاتا تھا۔ یہاں آزادی کے متوالوں کو قید کر کے رکھا جاتا تھا، اس رپورتاژ میں اسی کالا پانی اور جزائر کا ذکر ہے۔ (5) 'در چمن ہر ورقی دفتر حال دگر ست' اس میں مصر کے سفر کا ذکر ہے۔ مصر جو صدیوں سے مختلف تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے، اسی تہذیبی پس منظر میں یہ رپورتاژ مصر کی نمائندگی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ (6) 'گلگشت' میں سفر روس کا ذکر ہے۔ 1974 کا روس، تاشا کی رفاقت اور پھر صدیوں کی یوکرینی تاریخ، متعدد قصے، کہانیاں، ڈراموں کے بابت جانکاری وغیرہ اس رپورتاژ کا موضوع ہے، جس سے روس کی تہذیب وثقافت، تعلیم وتربیت، گھریلو زندگی کے رکھ رکھاؤ سے قاری یقیناً مستفید ہوتا ہے۔

چھٹی جلد میں پانچ رپورتاژ ہیں جن کے نام اس طرح ہیں:

(1) 'کوہ دماوند' میں ایران کے سفر کا تذکرہ ہے۔ (2) 'جہان دیگر' میں امریکہ کے سفر کا ذکر ہے۔ (3) 'قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے' اس میں مختلف ملکوں کی روداد یا یہ کہہ لیں کہ یہ ایک عالم آشوب سے بھرپور رپورتاژ ہے۔ (4) 'خضر سوچتا ہے وولر کے کنارے' میں ہندوستان کی خوب صورت ریاست، جنت نشان کشمیر کا ذکر ہے۔ (5) 'دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں' حیدرآباد، دکن کی سیر وتفریح اور ادبی محفلوں کا ذکر ہے۔

'آئینہ جہاں' میں موجود تمام رپورتاژ میں قرۃ العین حیدر نے صنف رپورتاژ کو فنی اور تکنیکی رنگ میں رنگنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے رپورتاژ اردو رپورتاژ نگاری کے باب میں اہم اضافہ تو ہیں ہی ساتھ ہی قابل تقلید بھی ہیں۔ ان کے تمام رپورتاژ الگ الگ تکنیک میں لکھے ہوئے ہیں۔ ناولوں کی طرح ان کے رپورتاژ کا کینوس بھی بہت وسیع ہے۔ انھوں نے اپنے ناول اور افسانے کی طرح رپورتاژ میں بھی تاریخ وتہذیب کو خاص اہمیت دی ہے۔ اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر جمیل اختر اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''ان کے (قرۃ العین حیدر) تمام رپورتاژ الگ الگ تکنیک میں لکھے گئے ہیں اور اپنے ناولوں کی طرح وسیع کینوس کا احاطہ کرتے ہیں۔ تاریخ وتہذیب اور ثقافت کو یہاں بھی وہی اہمیت دیتی ہیں جو انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں دی ہے۔ ہر واقعہ، ہر بات کو اس کے وسیع تناظر میں دیکھنا اور برتنا اور وہ بھی اس طرح کہ اصل مقصد مرکز میں رہے اور تحریر بوجھل نہ ہو، یہ ان کا وصف خاص ہے۔ خوب صورت اور دل پذیر انداز بیان میں لکھی گئیں تحریریں دور بینی اور فکر انگیزی کی دعوت دیتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے یہ تمام رپورتاژ، رپورتاژ نگاری کے نئے اسٹائل سے اردو کے قاری کو متعارف کراتے ہیں۔ یہ تمام رپورتاژ مقلدین کے لیے چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔''

'آئینہ جہاں' کے مرتب ڈاکٹر جمیل اختر اردو کے معروف ومستند محقق اور ناقد مانے جاتے ہیں۔ ان کی تحقیق کا موضوع فکشن ہے۔ اب تک ان کی متعدد کلیات تحقیق وتدوین کے بعد شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں کلیات بلونت سنگھ قابل ذکر ہے۔ اشاریہ آج کل کی تدوین اشاریہ سازی کے باب میں اہم اضافہ ہے۔ عصمت چغتائی کے افسانے بھی ان کی تحقیق کا حصہ ہیں۔ اب تک موصوف نے قرۃ العین حیدر کے ادبی سرمایے کو سات جلدوں میں ترتیب وتدوین کے بعد شائع کیا ہے، مزید چار جلدوں پر کام کر رہے ہیں۔ آئینہ جہاں (جلد پانچ اور چھ) میں 'رپورتاژ' شامل ہیں۔ ان دونوں جلدوں کا مقدمہ ایک ہی ہے، جس میں مرتب اپنا درد بیان کر رہا ہے کہ کس قدر ظالم دنیا نے ایک عالمی شہرت یافتہ ادیبہ اور مصنفہ کو فراموش ہی نہیں کیا بلکہ بیچ دیا۔ بیچنے سے مراد ان کی جائیدادیں، ان کی یادگاریں، ان سے منسوب بہت ساری چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر جمیل اختر نے خوب صورت ماضی اور قرۃ العین حیدر سے اپنی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی زندگی ہی میں میں نے ان کے ادبی سرمایے کو یکجا کر کے پیش کیا تھا لیکن قرۃ العین حیدر سخت بیمار ہو گئیں اور پھر زندگی نے وفا نہ کی۔ وہ اس دار فانی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اس وقت سے لے کر وہ آج تک ان کی تحریریں یکجا کرنے میں مصروف ہیں۔ واضح رہے کہ کسی بھی شخصیت کے ادبی سرمایے کی جمع آوری آسان کام نہیں۔ ظاہر ہے اس راہ میں قدم قدم پر دشواریاں ہیں لیکن اس کا صلہ یہ ہے کہ مصنفین کے ساتھ ساتھ مرتبین بھی زندہ جاوید ہو جاتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ایک نایاب رپورتاژ کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''ان دو جلدوں میں کل گیارہ رپورتاژ ہیں۔ دس تو پہلے مختلف صورتوں میں موجود تھے، گیارہواں گم تھا۔ یہ میری تحقیق ہے۔ یہ اضافہ اہم ہے۔ یہ رپورتاژ 'پدماندی کنارے' ہے جو بنگلہ دیش کے بارے میں ہے۔'' اس جاں گسل کام اور اہم اضافے کے لیے مرتب اور کونسل دونوں اس اہم ادبی دستاویز کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ باقی چار جلدیں بھی جلد از جلد اردو کے قارئین تک پہنچے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنونِ لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں. کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159

تحقیق و تنقید

دیویندر ستیارتھی (مونوگراف)

مصنف: پرکاش منو، مترجم: حسن ثنیٰ
صفحات: 164، قیمت: 50 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: ساہتیہ اکادمی دہلی
مبصر: محمد حسین
سیکنڈ فلور، بلڈنگ نمبر B-552، گلی نمبر 22، ذاکر نگر، نئی دہلی

زیر مطالعہ کتاب دیویندر ستیارتھی کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں پر مشتمل مونوگراف ہے۔ کتاب اصلاً ہندی میں پرکاش منو نے تصنیف کی ہے۔ اسے اردو کا جامہ حسن ثنیٰ نے پہنایا ہے۔ دیویندر ستیارتھی ایک ہشت پہلو شخصیت کا نام ہے۔ اردو، پنجابی، ہندی اور انگریزی میں نہ صرف مہارت رکھتے تھے بلکہ انھوں نے ان چاروں زبانوں کو اپنے علمی اور ادبی اظہار کے لیے بحسن وخوبی استعمال بھی کیا۔ ان کے ناول، افسانے، سفرنامے اور شاعری کا خاصا ذخیرہ پنجابی، ہندی، اور اردو میں ہے۔

ہندوستان بھر میں پھیلے لوک گیتوں کی طرف پڑھے لکھے طبقے کو متوجہ کرنے کی کوشش کی وجہ سے ستیارتھی کو بے حد شہرت ملی۔ انھوں نے ملک کے کونے کونے میں جا کر الگ الگ بولیوں اور زبانوں کے لوک گیتوں کو مقامی لوگوں سے سن کر تحریر کیا اور انھیں ملک کے علمی حلقوں تک پہنچایا۔ اس سلسلے میں انھیں بے پناہ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جس جنون اور جذبے کے ساتھ ستیارتھی نے یہ کام کیا شاید ہی کوئی اور کر سکتا۔ انھوں نے تکمیل جنوں کے لیے گھربار تک چھوڑ دیا۔ پھر شادی ہوئی تو بیوی کو بھی بے سمت سفر کا ہم سفر بنالیا اور جب بیٹی ہوئی تو ننھی بیٹی کو بھی نگر نگر کے سفر میں ہم رکاب بنالیا۔ کبھی ٹکٹ کبھی بے ٹکٹ، کبھی فاقہ کش ان کا سفر جاری رہا۔ پرکاش منو کا تحریر کردہ اور حسن ثنیٰ کا ترجمہ شدہ یہ مونوگراف ستیارتھی کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ پرکاش منو لکھتے ہیں:

''جہاں بھی کوئی اچھا لوک گیت سننے کو ملتا، وہ (ستیارتھی) بیٹھ کر کاپی میں لکھنے لگتے''...... اس مسافر کے پیر بغیر تھکے چلتے رہے، کہیں کچھ کھانے کو ملا تو کھا لیا نہیں تو بھوکے ہی سو گئے، بس سر میں یہ سودا تھا کہ کوئی بھی اچھا لوک گیت ملے تو وہ کاپی میں درج ہونے سے نہ رہ جائے۔ دریں اثنا ان کی شادی ہوئی تو بیوی بھی ساتھ ہو لیں، اسی دوران میں ان کی بیٹی ہوئی تو وہ بھی ننھی سی لوک یاتری بن گئی'' (ص 23)

ہندوستان کے طول وعرض میں جا کر لوگوں سے مل کر ان کے قریب رہ کر دیہی و ارضی زندگی سے متعلق ستیارتھی کا مشاہدہ اتنا گہرا ہو گیا کہ ان کے ناول، افسانے اور نظموں میں ہندوستان کے گاؤں اور عوام کی متحرک زندگی نظر آتی ہے۔ کتاب میں پرکاش منو نے ستیارتھی کے ناولوں میں عوامی زندگی کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں تو افسانوں پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے افسانوں میں مذکور گاؤں اور عوام کو درپیش مسائل کا بھی ذکر کیا ہے۔

چونکہ یہ کتاب ہندی سے ترجمہ ہو کر اردو میں آئی اس لیے اس کے ترجمے کی خوبی پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ بہترین اور کامیاب ترجمے کی پہچان یہی ہے کہ وہ ترجمہ کی بجائے تخلیق محسوس ہو۔ حسن ثنیٰ کے اس ترجمے کو پڑھ کر بالکل یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ تخلیق ہے۔

کتاب کئی ابواب پر مشتمل ہے جن میں ستیارتھی کے سفرِ مسلسل اور دوران سفر پیش آئے حیرت انگیز واقعات سے لے کر ستیارتھی کی فکری پرواز اور علمی و ادبی اڑان کی کہانیاں درج ہیں۔ رسالہ 'آج کل' کی ادارت سے لے کر ناولوں، سفرناموں، افسانوں، یادداشتوں، نظموں اور گیتوں کے معرض وجود میں آنے تک کی داستان موجود ہے۔

کتاب کے اخیر میں مصنف نے ہندی، اردو اور پنجابی میں موجود ستیارتھی کی شعری اور نثری تصنیفات کی ایک فہرست بھی تیار کی ہے۔ اس فہرست میں پنجابی اور ہندی کے علاوہ ان کی اردو تصنیفات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اردو میں لوک ادب پر مبنی دو کتابوں کے نام اس فہرست میں ہیں۔ 'میں ہوں خانہ بدوش' اور 'گائے جا ہندوستان' علاوہ ازیں 'نئے دیوتا' اور 'بانسری بجتی رہی' کے نام سے دو افسانوی مجموعوں کو بھی اس فہرست میں دیکھا جا سکتا ہے۔ شہر شہر آوارگی کے نام سے دو جلدوں میں عبدالسمیع نے ستیارتھی کے افسانوں کو جمع کیا ہے۔ اس کا بھی ذکر اس فہرست میں ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اس مختصر مونوگراف میں ستیارتھی کی زندگی کے احوال وکوائف سے لے کر ان کے فکروفن اور علمی و ادبی کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس لیے ادبی شخصیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

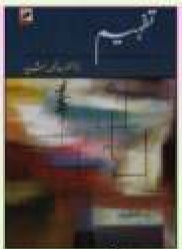

تفہیم

مصنف: ڈاکٹر صالحہ رشید
صفحات: 168، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2017
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی
مبصر: ڈاکٹر عبدالناصر، C-24، اوکھلا وہار، نئی دہلی 25

پیش نظر کتاب 'تفہیم' ڈاکٹر صالحہ رشید کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل 14 مضامین شامل ہیں۔ اپنے پہلے مضمون میں انھوں نے 'ہندوستان میں پالی، عربی، فارسی اور اردو ادب — کل اور آج' کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اس کا ادبی، تاریخی اور ثقافتی پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ البتہ ان کے جو مضامین عربی و فارسی زبان کے حوالے سے قلم بند ہوئے ہیں وہ زیادہ اہم ہیں جن سے قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان میں 'فارسی صحافت کا ارتقا اور ہندوستانی فارسی ادب میں اس کے نقوش'، 'امام محمد غزالی اور کیمیائے سعادت'، 'سفینۃ الاولیاء میں ذکر عارفات الصالحات اور رابعہ بصری'، 'ایرانی تصوف اور مولانا جلال الدین رومی' اور 'شاہنامہ فردوسی' کے چند نسوانی کردار علامہ شبلی نعمانی کے قلم سے' وغیرہ ہیں۔

مجموعہ کے پہلے مضمون 'ہندوستان میں پالی، عربی، فارسی و اردو ادب-کل اور آج' میں ان کا یہ خیال درست ہے:

''جتنے خارجی نسل کے لوگ ہندوستان آئے اتنے شاید ہی کسی دوسرے ملک میں گئے ہوں۔ غیر آتے گئے اور اس طرح یہاں کے ماحول میں گھل مل گئے کہ ان کی الگ شناخت ہی نہ رہی۔ یہی ہم آہنگی یہاں کی خصوصیت ہے جو ہر سچے ہندوستانی کی پہچان بن چکی ہے۔ مذہب ہندوستانی تہذیب کا محور ہے۔ وہ مذہب جو نہ ہی کسی راہ میں مانع ہے اور نہ مخالف۔'' (تفہیم ص 17)

پالی پراکرت کا ذکر یہاں سب سے پہلے کیا گیا ہے لیکن ان کی تفصیل زیادہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں گوتم بدھ کی مذہبی تعلیمات درج کی گئی تھیں اور اس کے قدیم نسخے اشوک کی لاٹوں کے کتبے میں ہی ملتے ہیں۔ موجودہ وقت میں ان کا چلن ختم ہو چکا ہے اس لیے اس کو پڑھنے کی از سر نو ضرورت ہے۔ بعد ازاں ہندوستان کی قدیم یونیورسٹیوں کا ذکر بھی آیا ہے جہاں بودھ مذہب کی تعلیم کے علاوہ دیگر علوم بھی پڑھائے جاتے تھے۔ اس باب میں مصنفہ نے دو قدیم یونیورسٹیوں ٹکشلا (پنجاب) اور نالندہ (بہار) کا ذکر کیا ہے لیکن وکرم شیلا (بھاگلپور، بہار) کا ذکر ان سے چھوٹ گیا ہے۔

'فارسی صحافت کا ارتقا اور ہندوستانی فارسی ادب میں اس کے نقوش' کے عنوان سے جو

مضمون پیش کیا گیا ہے اس میں صحافت کی تعریف اور عہد بہ عہد اس کے ایران اور ہندوستان میں ارتقا کا ذکر ہے۔ پہلے یہ خاص حکومت کا شعبہ تھا مگر بعد میں اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا اور یہ عوامی شعبے میں آج ساری دنیا میں رائج ہو چکا ہے عہد مغلیہ کے خاتمہ کے بعد جب انگریزی عہد میں چھاپہ خانے کا دور شروع ہوا تو 20 اپریل 1822 کو کلکتہ میں راجہ رام موہن رائے نے دنیا کا پہلا فارسی اخبار 'مرآۃ الاخبار' جاری کیا جس کے بعد ہند کی دیگر زبانوں بہ شمول اردو میں بھی صحافت کا آغاز و ارتقا ہوا۔ اس ضمن میں مصنف کا یہ بیان صحیح ہے:

بلاشبہ موجودہ صحافت اسی عمل کے ارتقا کا نتیجہ ہے۔'' (ص 51)

اپنے اگلے مضمون 'امام احمد غزالی اور کیمیائے سعادت' میں عہد سلجوقیہ کے نامور صوفی اور ماہر اسلامیات امام محمد غزالی کا بیان ہے جو پانچویں صدی ہجری میں ایران کے غزالہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ تحصیل علوم کے بعد مدرسہ نظامیہ بغداد میں صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے اور کافی عرصے تک فرائض منصبی ادا کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ تصوف کی جانب راغب ہوتے چلے گئے اور اہل تصوف کے حلقے میں شامل ہو گئے ان کی اہم تصانیف میں 'احیاء العلوم والدین' چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک شاہکار تصنیف ہے جسے اسلامی علوم و فنون کا انسائیکلو پیڈیا بھی کہا جاتا ہے۔ عربی کے علاوہ ان کی دو یادگار تصانیف 'وصیت نامہ' اور دوسری 'کیمیائے سعادت' ہے۔ اردو زبان میں بھی اس کا ترجمہ 'اکسیر ہدایت' کے نام سے منشی نول کشور نے شائع کیا تھا۔ یہاں اس مضمون کی بڑی خامی یہ ہے کہ 'کیمیائے سعادت' سے کچھ حوالے بھی پیش کیے جاتے تو یہ مضمون کافی عمدہ ہو سکتا تھا۔

داراشکوہ کی تصنیف 'سفینۃ الاولیا' میں 'ذکر عارفات الصالحات' کے تحت 18 عارفانہ خواتین کا ذکر کرتے ہوئے رابعہ بصری کا ذکر چوتھے نمبر پر درج ہے جو اپنے وقت کی زبردست عالمہ فاضلہ خاتون تھیں۔ آپ کی پوری زندگی عشق حقیقی سے لبریز تھی۔ وہ عرب نظم و نثر میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ گفتگو کرنے میں بھی ماہر تھیں۔

'ایران تصوف اور جلال الدین رومی' نامی مقالے میں ان کے روحانی پیشوا شمس تبریز کا ذکر ہے اور ان کے شاگرد خاص حسام الدین کا نام بھی آیا ہے جن کی تحریک پر رومی نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی 'مولوی معنوی' لکھی جو آج تک ساری دنیا میں پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔

یہ مضمون بھی طوالت کا متقاضی تھا لیکن مصنف نے اسے تشنہ طلب ہی رکھا۔ کاش وہ اس جانب کچھ اور توجہ کرتیں تو بہتر ہوتا۔

آخر میں علامہ شبلی نعمانی کی مشہور تصنیف 'شعرالعجم' کے چوتھے حصے میں شامل فردوسی کے شاہنامے کا ذکر ہے۔ اس حصے کے تیسرے باب میں انھوں نے 'عورتوں کی قدردانی' کے نام سے ایک عنوان قائم کیا ہے۔ اسی عنوان سے انھوں نے 'شاہنامہ فردوسی کے چند نسوانی کردار' شبلی نعمانی کے قلم سے' اخذ کیا ہے۔ شبلی نعمانی نے عورتوں کی حق تلفی کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ مجموعے میں شامل دیگر مضامین بھی خوب ہیں جو مصنف کے وسیع مطالعے کی دین ہیں۔

مضامین ہاشمی

مصنف رناشر: وسیم حیدر ہاشمی

صفحات: 288، قیمت: 500 روپے

مبصر: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، شعبۂ اردو، ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ 825301 (جھارکھنڈ)

زیر نظر کتاب 'مضامین ہاشمی' وسیم حیدر ہاشمی کے 17 تبصراتی، تجزیاتی اور تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ وسیم حیدر ہاشمی اردو دنیا میں ایک افسانہ نگار، شاعر اور مترجم کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے 'کرچیاں' 2007، 'مرغ کا سفر' 2010، اور 'گوہر پس انداز' 2014 اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی اردو کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ 2013 میں ان کے 13 ادبی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'رثائی ادب کے چند پہلو' کے نام سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس مجموعے کو ادبی حلقے میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اب موصوف 17 ادبی و تنقیدی مضامین کا ایک اور حسین گلدستہ 'مضامین ہاشمی' کے عنوان سے لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ اپنے اس تازہ ترین مجموعہ 'مضامین' میں انہوں نے مختلف ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور محققوں کے ادبی کارناموں کی بابت اپنی رائے کا اظہار صاف گوئی اور بے باکی کے ساتھ کیا ہے۔ مشمولہ مضامین کی نوعیت اور تنوع کا اندازہ ان کے عنوانات سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

'پروفیسر حنیف نقوی: ذاتی تاثرات'، 'صحافت اور ہندوستان کے چند ابتدائی اخبار'، 'مشاہیر ادب کے کلام میں ذکر بے ثباتی'، 'چکبست پر انیس کے اثرات'، 'حضرت ہوش جونپوری کی نظم گوئی'، 'تعشق کے کلام میں ذکر بے ثباتی اور 1857 کا لکھنؤ'، 'پریم چند کے افسانوں میں بھارت کی غلامی اور بدحالی کی کسک'، 'ادراک کا گوشۂ مشفق خواجہ'، 'نذیر بنارسی کا نثری اسلوب'، 'منٹو کا افسانہ 'موذیل' کا تجزیہ'، 'ہم عصر فنی و ادبی تشخص کا تقابلی مطالعہ'، 'سجاد ظہیر کا ایک کردار نعیم الدین'، 'بکرم سین جین جوہر کے ایوان غزل کا جائزہ'، 'پروفیسر قمر رئیس: ذاتی تاثرات'، 'ڈاکٹر محمد ممتاز راشد کا توسن خیال'، 'ڈاکٹر مینا نقوی کی غزل گوئی کا اجمالی جائزہ' اور 'عاصم محمد آبادی کی نثری خدمات'۔

پہلا مضمون تاثراتی نوعیت کا ہے، جس میں مصنف نے معروف محقق حنیف نقوی کی ذاتی زندگی، ان کے عادات و اطوار اور کارکردگی کی مکمل تصویر کشی کی ہے۔ 'چکبست پر انیس کے اثرات' ایک عمدہ مضمون ہے جس میں میر انیس اور چکبست کے کلام کا تقابل نہایت ہنرمندی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ 'حضرت ہوش جونپوری کی نظم گوئی' میں ہوش کی چند نظموں کے تجزیے کے بعد ان کی فکری و فنی جہات کو روشن کرتے ہوئے ان کے کلام میں بے ثباتی کے عناصر کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس مضمون کے ابتدائی حصے میں میر انیس کا ذکر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ 'تعشق کے کلام میں ذکر بے ثباتی اور 1857 کا لکھنؤ' ایک وقیع مضمون ہے جس میں مصنف نے تعشق کے کلام میں ذکر بے ثباتی کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے وافر مثالیں پیش کی ہیں اور ان اسباب کو بھی نشان زد کیا ہے جن کے باعث تعشق مرثیہ گو کی حیثیت سے انیس و دبیر کے مانند مشہور و معروف نہیں ہو سکے۔

'مشاہیر ادب کے کلام میں ذکر بے ثباتی' (از: انیسویں تا بیسویں صدی عیسوی) بھی ایک قیمتی تحقیقی مضمون ہے جس میں مصنف نے تلاش و جستجو کے بعد انیسویں اور بیسویں صدی کے چند اہم شعرا میر، غالب، مومن، ذوق، فانی، اقبال، سودا، چکبست، میر انیس، مرزا دبیر، بہادر شاہ ظفر، سرور جہاں آبادی، نظیر اکبر آبادی، ہاشم، مرزا شوق وغیرہ کے کلام میں بے ثباتی کے عناصر کو آشکار کیا ہے لیکن یہاں بھی ان کا زور بیان میر انیس پر کچھ زیادہ ہی صرف ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

وسیم حیدر ہاشمی فکشن کی تنقید کی طرف بھی مائل رہے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں پریم چند، منٹو اور سجاد ظہیر کے حوالے سے شامل مضامین ان کی زود حسی اور باریک بینی کے آئینہ دار ہیں۔

''ہم عصر فنی و ادبی تشخص کا تقابلی جائزہ'' ایک طویل مضمون ہے جو اپنے عنوان کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتا ہے۔ اس مضمون میں وسیم حیدر نے مظفر حنفی اور ناوک حمزہ پوری

کی شخصیت اور شاعری کا تقابلی مطالعہ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ 'ادراک کا گوشۂ مشفق خواجہ' ایک تبصرہ نما مضمون ہے جس میں مشفق خواجہ کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے مضامین پر توجہ کم کی گئی ہے اور ادراک کے مدیر سید حسن عباس کی شخصیت اور کارناموں پر زیادہ زور صرف کیا گیا ہے۔

بہر طور اس کتاب میں بعض ایسے مضامین ہیں جن کی ادبی اور تنقیدی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وسیم حیدر ہاشمی تنقید کو برتنے کے فن سے واقف ہیں۔ ان کا اسلوب بھی سادہ، عام فہم اور ترسیلی ہے۔ کتابت وطباعت عمدہ اور گیٹ اپ دلکش ہے۔ لیکن 288 صفحات پر محیط اس کتاب کی قیمت 500 روپے بہت زیادہ ہے۔

بہار وبنگال کے صحافی

مصنف: ظفر انور

صفحات: 192، قیمت: 100 روپے

ناشر: ظفر انور شکر پوری

مبصر: خان محمد رضوان، D-703، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

صوبہ بہار کا شمار ملک کے علمی اور ادبی افق پر نمایاں ہے۔ جس طرح صنعت وحرفت اور علوم وفنون میں بہار نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ صحافت کے میدان میں بھی آزادی سے قبل ہی سے اہم فریضہ انجام دے رہا ہے۔ بہار میں سب سے پہلے 1853 میں آرہ سے 'نور الانوار' شائع ہوا پھر 1856 میں پٹنہ سے اور 1856 ہی میں گیا سے ویکلی رپورٹ کی شکل میں جاری ہوا۔ اگر ہم بہار میں اردو صحافت کا جائزہ لیں تو 1853 سے تا حال اخبارات کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جو صحافت کے میدان میں نمایاں کام انجام دے رہے ہیں۔

کتاب 'بہار وبنگال کے صحافی' ظفر انور شکر پوری کی تصنیف ہے۔ اس سے قبل ان کی ایک کتاب 'دہلی کے 50 صحافی' منظر عام پر آچکی ہے، جسے دہلی اردو اکادمی نے انعام سے بھی نوازا تھا۔ اہل علم نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مصنف معروف صحافی ہیں اور مثبت صحافتی سوچ کے ساتھ تقریباً تین دہائی سے صحافتی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ظفر انور شکر پوری ان معدودِ چند صحافیوں میں ہیں جنھوں نے پوری عمر صرف ایماندارانہ صحافت کی، اور سچ کا ساتھ دیا ہے، انھوں نے پوری ایک نسل کی تربیت کی ہے اور بتایا ہے کہ سچی صحافت دراصل کہتے کسے ہیں، اردو صحافت جس کا معیار روز بروز گرتا جارہا ہے، ظفر انور جیسے بے باک، ایماندار اور صاحب قلم صحافی نے ہمیشہ سے یہ کوشش کی ہے کہ اردو صحافت کا وقار دوبارہ بحال ہو۔ ظفر انور نے کبھی بھی مصالحت اور مفاہمت کی صحافت نہیں کی۔

اس کتاب میں بہار وبنگال کے 42 بیالس معروف اور اہم صحافیوں پر تحریر ہے اور 30 صحافیوں کی تصویریں سرورق پر شامل کی گئی ہیں۔ مصنف نے اس کتاب کے دو حصے کیے ہیں۔ پہلے حصے میں بہار وبنگال کے 28 اٹھائیس ان صحافیوں کو شامل کیا ہے جو بقید حیات ہیں اور دوسرا حصہ مرحومین کے لیے قائم کیا گیا ہے، اس حصے میں بہار وبنگال کے ۱۴ چودہ صحافیوں کو شامل کیا گیا ہے، اس کتاب کے آخری صفحے پر مصنف نے بہار کے تقریباً نوے صحافیوں کی ایک فہرست شامل کی ہے جن میں کچھ گزر چکے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو حیات ہیں اس فہرست کی مدد سے آگے کام کرنے میں مزید آسانی ہوگی۔ اس کتاب میں مصنف کے 42 صحافیوں پر جامع مضامین ہیں۔ سب سے پہلے بہار میں اردو صحافت، کے عنوان سے مختصر مگر جامع اور معلوماتی مضمون ہے اس میں انھوں نے بہار میں اردو صحافت کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور عہد بہ عہد جائزہ پیش کیا ہے، دوسرا مضمون ''مغربی بنگال میں اردو صحافت' کے عنوان سے ہے اس مضمون میں مصنف نے مغربی بنگال میں اردو صحافت کی تاریخ اور ترویج واشاعت کا غائر مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ تمام ہی صحافیوں پر تعارفی، تبصراتی اور صحافتی مضمون شامل کیے ہیں، یہ ایک عمدہ اور معلوماتی کام ہے، بلکہ مزید اس کام کو آگے کرنے کی اشد ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ چوں کہ ابھی اور بھی ایسے صحافی ہیں جن پر قلم اٹھانا باقی ہے' ظفر انور کے اس کام کو سرسری نہیں لیا جاسکتا، یہ ایک تحقیقی کام ہے اور کافی محنت سے کیا گیا کام ہے، تمام ہی مضامین عرق ریزی کا ثبوت پیش کرتے ہیں، توقع ہے کہ مصنف اس کام کو آگے بڑھائیں گے۔ اس کتاب کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے تیار کی گئی ہے، جب کہ تصاویر میں بھی مراتب کا خیال رکھنا چاہیے تھا، کتاب میں کہیں کہیں پروف کی غلطیاں در آئی ہیں توقع ہے کہ آئندہ اصلاح کرلی جائے گی۔ یہ کتاب نہ صرف صحافت کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے مفید اور معلوماتی ہے بلکہ صحافت سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بھی یکساں مفید اور کارآمد ہے۔ یہ کتاب ہر سرکاری اور ذاتی لائبریریوں کی ضرورت ہے، توقع ہے اہل علم اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

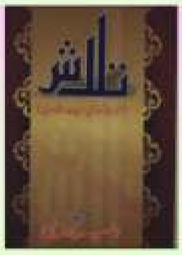

تلاش (اکبرالہ آبادی: حیات وشاعری)

مرتبہ وناشر: رضیہ پروین

صفحات: 336، قیمت 500 روپے، سنہ اشاعت 2017

مبصر: ڈاکٹر ریحان حسن

شعبۂ اردو فارسی، گورونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر، پنجاب

اکبرالہ آبادی ان قد آور شعراء میں ہیں جنھوں نے اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری سے اردو زبان کے ذخیرہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے عوام کو مغرب کی اندھی تقلید سے روکنے کے لیے شاعری کو وسیلۂ اظہار بنایا اور یہ باور کرایا کہ انگریزوں کی تہذیب بے روح ہے لیکن مشرقی تہذیب انسان کو مہذب ہی نہیں بناتی بلکہ یہ تہذیب انسان کی کامیابی وکامرانی کی کلید بھی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ جدیدیت کے مخالف نہ تھے بلکہ روایت کو چھوڑ کر جدیدیت اختیار کرلینے کے مخالف تھے۔ ان کا دل مذہبی درد اور مشرقی تہذیب کی محبت سے پر تھا چنانچہ انھوں نے جن باتوں کو قوم وملت کے لیے مضر سمجھا اس کی انھوں نے بھرپور مخالفت کی حتی کہ سرسید سے بھی ٹکر لینے سے گریز نہیں کیا چونکہ اس مخالفت میں ان کی نیت صاف تھی ملک وقوم کے لیے بے پناہ درد تھا اس لیے آج بھی ان کے افکار وخیالات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ رضیہ پروین کی ترتیب کردہ کتاب 'تلاش (اکبرالہ آبادی: حیات اور شاعری)' بھی اکبرالہ آبادی کے انھیں خیالات اور ملک وقوم سے محبت سے واقف کرانے کی ایک کوشش ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'تلاش (اکبرالہ آبادی: حیات اور شاعری)' مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اکبرالہ آبادی کی رنگارنگ شخصیت اور اردو زبان وادب کے سلسلے میں ان کے عطا کا اعتراف ہے۔ ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کا مقدمہ 'بیت الغزل' کی حیثیت رکھتا ہے جس میں انھوں نے اکبر کی زندگی کے مختلف جہات پر تحقیقی نظر ڈالی ہے اور یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ موتی لال نہرو کی کوٹھی کا نام دراصل اکبر نے ہی 'آنند بھون' رکھا تھا۔ اکبر سے متعلق اس قبیل کی تحقیقات کے علاوہ مرتبہ کی علمی وادبی صلاحیتوں کا انھوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے ایسا وہ کیوں کر نہ کرتے اس لیے کہ رضیہ پروین نے

مجموعۂ مضامین میں جو فکری بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے وہ سراہے جانے کے لائق ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں اکبرالہ آبادی سے متعلق انتخاب مضامین میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ قاری کے علم میں اضافہ ہو کتاب میں اکبر سے متعلق جن عنوانات کے تحت مضامین جمع کیے گئے ہیں ان میں اکبر کی علامت سازی، اکبر بحیثیت مکتوب نگار، اکبرالہ آبادی اور غیرت قومی، اکبر کے کلام میں انگریزی قوافی کا حسن، اکبر اور مغرب، اقبال اور اکبر، اکبر کی حقیقت پسندی، اکبر اور نئی علامات، اکبر اور ظرافت اور اکبرالہ آبادی کا پیغام محبت وغیرہ ایسی مضامین ہیں جو اکبر شناسی کی نئی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ مرتب نے صرف نئے اور اچھوتے عنوان کا انتخاب کیا ہے اور بیشتر ایسے لکھنے والوں کے مضامین جمع کیے ہیں جن کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔

مجموعہ مضامین میں رضیہ پروین نے اکبرالہ آبادی کے سنہ ولادت کا تعین کرتے ہوئے اکبر کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ جس خوبی سے کیا ہے وہ بھی قابل تحسین ہے۔ کتاب میں پروفیسر نیر مسعود کا مضمون 'اکبر کی علامت سازی' اہم تحریر ہے جس سے اردو زبان میں اکبر کی عطا کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ شاہ اجمل فاروق ندوی اور ڈاکٹر شاداب تبسم کا مضمون ہمیں اکبر کی مکتوب نگاری کی صلاحیت سے واقف کرانے کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت اور افکار و خیالات کو سمجھنے کا موقع بھی فراہم کراتا ہے نیز پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے اکبرالہ آبادی کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری پر جس انداز سے خامہ فرسائی کی ہے وہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر شمس تبریز خاں کا مضمون بھی وقیع ہے جس میں انھوں نے اکبر کی شاعری کا اردو میں مرتبہ کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اکبرالہ آبادی کی پوری شاعری انگریزی تہذیب کے خلاف صدائے احتجاج تھی اس حوالے سے شاہ نواز قریشی کا مضمون بھی اہمیت کا حامل ہے۔

'تلاش اکبرالہ آبادی: حیات اور شاعری' میں ایک اہم مضمون پروفیسر سید احتشام حسین کا 'اکبر کا ذہن' ہے جس میں اکبر کی نئی راہ اور نئے اسلوب پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو ادب میں ان کے نت نئے اجتہادات سے روشناس کرایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایمن تنزیل کا مضمون 'اکبر کے چند لطائف: اشعار کی روشنی میں' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح سے اس کتاب میں شامل تمام مضامین مرتبہ کی تحقیقی بصیرت اور اکبر سے والہانہ لگاؤ کے عکاس ہیں۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب اور طباعت بہتر ہے البتہ کمپوزنگ کی بعض جگہوں پر کچھ غلطیاں بھی راہ پاگئی ہیں جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ غلطیاں بھی غالباً جان بوجھ کر کی گئی ہیں بہرحال یہ غلطیاں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ درستگی کا خیال ضرور رکھا جائے گا۔

مجموعی طور پر مرتبہ کی یہ کتاب اکبرالہ آبادی کی حیات اور فنی کمالات کے اہم گوشوں کی تفہیم کے لیے معاون ہے، رضیہ پروین اس اہم اور اچھی کتاب کے لیے مبارکباد کی مستحق ہیں۔

تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش

ترتیب و تہذیب: ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی

ص: 480، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2017

مبصر: اسلم چشتی (پونے، انڈیا)

عصر حاضر کے ادبی رسائل و جرائد میں 'تمثیل نو' اپنی ضخامت اور معیار کے لحاظ سے ایک منفرد جریدہ ہے۔ اس کے مدیر اعزازی ڈاکٹر امام اعظم ہیں جن کا تعلیمی و ادبی دنیا میں ایک مقام و مرتبہ ہے۔ بحیثیت محقق و ادیب یہ ادبی دنیا میں جانے مانے بھی جاتے ہیں۔ یہ جریدہ ان کی صحافتی صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے۔

'تمثیل نو' کا مستقل قاری ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ اس کا ہر شمارہ نمبر کا درجہ رکھتا ہے اور اس قدر ادبی مواد پڑھنے کے لیے ملتا ہے کہ طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔ ادبی تشنگی مٹ جاتی ہے لیکن یہ اتنا ضخیم ہوتا ہے کہ اسے قسط وار پڑھنا پڑتا ہے۔ میں چونکہ اس کے مطالعے کا عادی ہو چکا ہوں اس لیے پورا پرچہ پڑھے بغیر نہیں رہ پاتا۔

مرتب موصوف نے اپنے موثر مقدمے کے علاوہ اہم قلمکاروں کے مضامین، تبصرے اور آراء اس کتاب میں شامل کر کے اسے باوقار بنا دیا۔ کتاب کی ترتیب یوں ہے: پہلے اعتراف نامہ (مقدمہ از ڈاکٹر ابرار احمد جراوی) اور 'تمثیل نو، ایک تجزیاتی مطالعہ (ڈاکٹر سرور کریم) اس کے بعد منظومات کا باب جس میں پروفیسر عبدالمنان طرزی، اختر جاوید، پروفیسر منصور عمر، احسان ثاقب، امان خاں دل، مختار ٹونکی، علاء الدین حیدر وارثی، علقمہ شبلی، انجم عظیم آبادی، حلیم صابر، احمد علی برقی اعظمی اور مرزا رفیق شاکر کے 'تمثیل نو' کے موضوع پر منظوم تحسین نامے ڈاکٹر امام اعظم اور 'تمثیل نو' سے قربت اور محبت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

دوسرا باب 'منثورات' کے عنوان سے ہے۔ اس میں کل 24 مضامین 'تمثیل نو' پر کئی زاویوں سے لکھے ہوئے ہیں۔ تمام لکھنے والے ادبی مقام و مرتبے کے حامل ہیں۔ یہ مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لکھنے والوں کی طویل فہرست کے ابتدائی نام ملاحظہ فرمائیں۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر قاسم فریدی، پروفیسر سلیمان اطہر جاوید، پروفیسر ثوبان فاروقی، نقشبند قمر نقوی بخاری، نسیم محمد جان، پروفیسر وہاب قیصر، پروفیسر مجید بیدار، یٰسین احمد، رفیق شاہین اور ڈاکٹر محسن جلگانوی! تیسرا باب تبصرے چوتھا باب اعترافیہ، اس کے بعد خشونت سنگھ کا کالم اور شاہد اقبال کا 'تمثیل نو' کا اشاریہ اور آخر میں ڈاکٹر وکیل احمد (ایڈووکیٹ) کی 'تمثیل نو' کے مارچ 2001ء تا جون 2017ء تک کے شماروں کی فہرست شامل کی گئی ہے۔

سلیقے سے مزین ترتیب کی دلکشی مطالعہ سے شوق کو بڑھاتی ہے اور قاری یکے بعد دیگرے نگارشات پڑھنے کی طرف راغب ہوتا ہے۔ مجھے تو پڑھنے میں سہولت محسوس ہوئی، یہ ایک نفسیاتی بات ہے کہ سلیقے سے شائع کی گئی چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر ابرار اس کے لیے داد کے مستحق ہیں۔

اس کتاب کی انفرادیت یہ بھی ہے کہ یہ صرف ایک جریدے کے اوصاف، خدمات اور خوبیوں کو دور حاضر کے اہم لکھنے والوں کے مضامین، تبصرے، اعترافیہ اور آراء اس میں شامل ہیں۔ اس طور طریق کا کام میری نظر سے پہلی بار گزرا ہے۔ اس کے ہر باب میں شامل مضامین کے اقتباسات یہاں دے دیے جائیں تو 'تمثیل نو' کی اہمیت کھل کر سامنے آجائے گی لیکن طوالت کے خدشے سے میں ایسا کرنے سے قاصر ہوں۔ صرف ایک باب 'اعترافیہ' کے کچھ اقتباسات پر اکتفا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اقتباسات بھی کم اہم نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:

'تمثیل نو' کے تمام مضامین، نظمیں، افسانے و غزلیں وغیرہ رسالہ تیار کرنے والوں کی ایمانداری اور محنت کا احساس دلاتی ہیں اور اگر اسی محنت اور لگن سے ہمارے ادیب صحافی منہمک رہیں تو پھر کسی کو اردو کے مستقبل سے مایوس ہونے کی چنداں ضرورت نہ ہوگی۔'' (احمد ابراہیم علوی مدیر روزنامہ 'آگ' لکھنؤ کتاب ہذا ص: 333)

'تمثیل نو' ڈاکٹر امام اعظم کی ادارت میں نکلنے والا ایک ایسا رسالہ ہے جس میں متنوع قسم کے مضامین شامل ہوتے ہیں اور علاقائی ادب کی کچھ جھلکیاں بھی ہوتی ہیں۔

مضامین کا انتخاب بھی اچھا ہوتا ہے۔ محدود وسائل کے باوجود رسالہ نکالنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔......'' (حقانی القاسمی، کتاب ہٰذا ص: 338)

''ماہنامہ 'تمثیل نو' دربھنگہ جدید تر شعری اور ادبی رجحانات کا ترجمان ہے اور اردو کے فروغ کے لیے نمایاں خدمات انجام دے رہا ہے......''

(انوار فیروز، راولپنڈی پاکستان ص: 339)

اس کتاب میں شاہد اقبال کا مرتب کیا ہوا تمثیل نو کا اشاریہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے ادب کے اسکالرس کو تحقیقی کام میں ضرور مدد ملے گی۔ فلیپ پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی خصوصی تحریر ہے جس میں انھوں نے مدیر ''تمثیل نو'' کے کام کی تعریف بھی کی ہے اور مشورے بھی دیے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''آپ نے 'تمثیل نو' میں 1985. کے بعد اردو شاعری، فکشن، اردو تنقید کے منظر نامے میں جو تبدیلیاں آئی ہیں، ان پر مباحثہ قائم کرکے ایک اچھا اقدام کیا ہے......''

(فلیپ کی رائے)

'تمثیل نو: ادبی صحافت کا نقش' کا احاطہ کرنا، مشمولات پر بات کرنا آسان کام نہیں لیکن میں نے اپنی بساط کے مطابق جو کچھ لکھا وہ بہت ہی کم ہے۔ میں اس کتاب کے مرتب ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ڈاکٹر امام اعظم کے صحافتی کارنامے 'تمثیل نو' کو چار کی رائے کے ساتھ پیش کرنے کا مستحسن اقدام کیا ہے۔

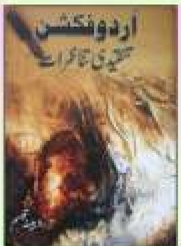

اردو فکشن تنقیدی تناظرات

مصنف: روبینہ تبسم

صفحات: 219، قیمت -/250، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر رشید اشرف خان، شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی

'اردو فکشن: تنقیدی تناظرات' جواں سال ادیبہ روبینہ تبسم کی پہلی تنقیدی کاوش ہے۔ روبینہ تبسم بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں لیکن اس کتاب میں شامل مضامین ان کی تنقیدی بصیرت کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ کتاب میں کل 18 مضامین شامل ہیں جن میں 9 مضامین افسانے سے متعلق ہیں اور انھیں 'افسانے کی تنقید' کے عنوان سے شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح بقیہ 9 مضامین 'ناول کی تنقید' کے عنوان سے شامل ہیں۔ افسانے کے ضمن میں شامل مضامین میں منٹو کے افسانوں کی تکنیک اور منٹو تنقید پر ایک ایک مضمون شامل ہے۔ بیدی پر چار مضامین 'بیدی کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع'، 'بیدی کے افسانوں میں کردار نگاری نگاری'، 'بیدی کے افسانوں میں بچوں کی نفسیات' اور 'بیدی کا افسانہ 'غلامی' ایک تجزیاتی مطالعہ' کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے فن و تکنیک پر دو مضامین اور قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں مشترکہ تہذیب کے عنوان سے ایک مضمون شامل ہے۔ ناول کے باب میں کرشن چندر کے ناول 'ایک عورت ہزار دیوانے' کے تناظر میں ان کی انقلابی و اشتراکی بصیرت کو دریافت کرنے کی کامیاب انتقادی سعی کی گئی ہے۔ عصمت کے ناول 'معصومہ' کی تعبیر و تشریح میں روبینہ تبسم نے اعتدال نقد کو ملحوظ رکھا ہے۔ کتاب کے اس حصے میں جاسوسی ناول اور ابن صفی کے حوالے سے کل چار مضامین شامل ہیں جو مصنفہ کے ذوق ادب اور وسعت نظر کا پتہ دیتے ہیں۔ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو فکشن میں جاسوسی ناولوں کے تخلیقی خصائص کی نشاندہی کرنے میں عموماً سہل پسندی اور بے دلی کا مظاہرہ کیا گیا ہے جب کہ مغربی ادب میں جاسوسی فکشن کو وقیع اور معتبر مقام حاصل ہے۔ مصنفہ نے جاسوسی فکشن کی ادبی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ابن صفی کے فنکارانہ امتیازات پر معروضی اور سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ان مضامین کے علاوہ کشمیری لال ذاکر کے فکر و فن پر دو مضامین اور ناول 'کاغذی گھاٹ' وجودی تناظر میں تنقیدی مطالعہ یہ مضامین شامل ہیں۔

مصنفہ نے آغاز میں اپنے بعض مضامین کے بارے میں وضاحت بھی کردی ہے جس سے مضامین کے تئیں قاری کے تجسس میں اضافہ ہوتا ہے مثلاً 'بیدی کے حوالے سے تحریر کیے گئے مضامین سے متعلق لکھتی ہیں کہ'' چار مضامین بیدی کے افسانوں کی تنقید کے متعلق ہیں، جس میں 'کردار نگاری' کے ضمن میں تحریر کیا گیا مضمون خصوصاً اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ حسب روایت فلیٹ، راؤنڈ، سماجی یا نفسیاتی تناظر میں نہیں پیش کیا گیا ہے۔'' آگے احمد ندیم قاسمی کے بارے میں لکھے گئے مضامین کی بابت لکھتی ہیں: ''بالعموم احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کے متعلق تحریروں میں سماجی صورت حال، پنجاب کی دیہی زندگی اور عورتوں کے مسائل کو موضوع بنایا جاتا ہے لیکن یہ مضامین اس لحاظ سے اہم ہیں کہ اس میں ان کے واقعہ، راوی، بیانیہ اور تکنیک کے برتنے کے انداز کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔'' غور کریں تو یہی اس کتاب کا اختصاص بھی ہے کہ موضوع یا تھیم سے بحث کرکے افسانے کا تجزیہ پیش کرنے کے علی الرغم افسانے کے فنی و تکنیکی مضمرات کو مرکزی حوالہ بنایا گیا ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ مصنفہ کے ذوق ادب اور دقت نظر کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ انھوں نے زیر بحث افسانوں اور ناولوں کے متعلق روایتی قسم کے معروضات پیش کرنے سے گریز کیا ہے اور کسی نئے اور منفرد تخلیقی پہلو کو پیش کرنے پر خصوصی توجہ دی ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ بشمول روبینہ تبسم نئے لکھنے والے متن، متعلقات متن اور شعریات پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ابھی سیکھنے کے مرحلے میں ہیں دھیرے دھیرے تنقید کے ان نئے Tools پر ان کی گرفت مضبوط ہوگی۔ بہر حال ان کی یہ تحریریں ایک نئی تازگی کا احساس دلاتی ہیں۔ روبینہ تبسم کی تنقیدی بالغ نظری کے علاوہ جو بات متاثر کرتی ہے وہ ان کی زبان ہے۔ اول تو وہ صحیح زبان لکھتی ہیں جو کہ فی زمانہ ایک بڑی بات ہے اس پر مستزاد یہ کہ تنقید کی زبان جس سنجیدگی اور نظم و ضبط کا تقاضا کرتی ہے اس کو بھی وہ ملحوظ خاطر رکھتی ہیں لہٰذا ان سے مزید کارآمد تنقیدی تحریروں کی توقعات باندھنا بے جا نہ ہوگا۔ اس کتاب کے متعلق یہ امید بجا طور پر کی جاسکتی ہے کہ اردو کے ادبی حلقے میں اسے خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوگی جس سے مصنفہ کو اپنا انتقادی سفر جاری رکھنے کی تحریک اور حوصلہ ملے گا۔

مضامین

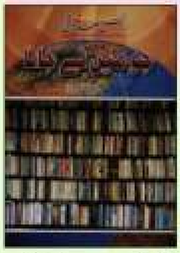

جو میں نے جانا

مصنف: رئیس صدیقی

صفحات: 160، قیمت: 160، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: تخلیق کار پبلشر، دہلی

مبصر: فیضان الحق، روم نمبر 58، تاپتی ہاسٹل، جے این یو نئی دہلی 67

'جو میں نے جانا' رئیس صدیقی صاحب کے 39 مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں 1996 سے لے کر 2015 کے بیچ لکھے گئے مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین ماہنامہ یوجنا، اردو دنیا، پیش رفت، باجی اور فلمی ستارے کے علاوہ روزنامہ راشٹریہ سہارا اور انقلاب کی زینت بن چکے ہیں۔ اس مجموعے میں مختلف ادبی، اخلاقی، فلمی، مذہبی اور

سیاحتی مضامین شامل ہیں۔ موضوعات کی رنگارنگی اور دلچسپ انداز بیان کتاب کی اہم خصوصیت ہے۔

اس لڑی کے ابتدائی مضامین مرزا غالب کی شاعری، اقبال کے قومی شعور، اور پریم چند کی فطرت شناسی کو دلچسپ طریقے سے بیان کرتے ہیں، رئیس صدیقی صاحب نے غالب فہمی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کی شاعری کے دس اہم نکات بیان کیے ہیں اور اقبال کی وطن دوستی و قومیت کو ان کی نظموں کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ پریم چند کی فطرت شناسی اور شیریں زبانی پر خاص توجہ دی ہے۔ آغا جانی کی خودنوشت سوانح 'سحر ہونے تک' کا تعارف دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے جس سے قاری کے دل میں کتاب پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

وطن عزیز ہندوستان اور اس کے جانبازوں کے متعلق چار مضامین اس میں شامل ہیں، جن میں بہادر شاہ ظفر کی پہلی جنگ آزادی میں قیادت، چندر شیکھر آزاد کی جاں نثاری، اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرض شناسی کو مختصر سوانحی خاکوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، س کے علاوہ قومی پرچم کے متعلق 'پرچم ہند' کے عنوان سے ایک معلومات افزا مضمون پیش کیا گیا ہے۔

رئیس صدیقی صاحب نے کچھ اصلاحی اور اخلاقی مضامین بھی لکھے ہیں۔ جن میں مولانا رومی اور ان کی مثنوی، شیخ سعدی کی گلستاں اور بوستاں، شیخ سعدی کی دانشمندی۔ قوال کے آئینے میں، اور عبدالرحیم خانخانہ اور ان کی سخاوتیں شامل ہیں۔ وقت کی قیمت اور ہمیت کے متعلق 'وقت زندگی کا قیمتی سرمایہ' ایک اہم مضمون ہے۔ 'بڑی قیمتی شے ہے زندگی' یک ایسا مضمون ہے جو مسرت و شادمانی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ہنر سکھاتا ہے۔

مجموعے میں فلمی مضامین کو بھی جگہ دی گئی ہے، جو فلم صنعت سے مصنف کی واقفیت کا پتہ دیتے ہیں، ان مضامین میں دادا صاحب پھالکے، ستیہ جیت رے، وی شانتا رام، محبوب خان، عشرت حسین عرف ونو دکمار اور ہیما مالنی وغیرہ کا تعارف ان کی خدمات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، مشہور گلوکار نصرت فتح علی خان کے متعلق ایک اہم مضمون 'جہان موسیقی کا جوگی۔ نصرت فتح علی خان' بھی اس میں شامل ہے۔

کمال صدیقی صاحب صحافت سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، انھوں نے اس مجموعے میں تین بڑی شخصیتوں کے انٹرویوز شامل کیے ہیں۔ ان میں ادب اطفال کے اہم خدمت گزار، شاعر و قلم کار شفیع الدین نیر، بزرگ صحافی اور شاعر حاجی انیس دہلوی اور مقبول شاعر بشیر بدر شامل ہیں۔

سیر و سیاحت کے متعلق دو مضامین 'مسلم ذوق فن تعمیر' اور 'منالی: وادی کشمیر کا حقیقی عکس' شامل ہیں۔ مسلمانوں کے فن تعمیر کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے مشاہدے کا سہارا لیا ہے، اسی طرح اپنے قارئین کو وادی کشمیر کی عینی سیر کرائی ہے، وہاں کے مشہور مقامات جگت سکھ اور وشِشٹھ وغیرہ کا تعارف بھی پیش کیا ہے۔

کھیل کود سے متعلق مصنف کے دو مضامین 'ہاکی ابتدا اور ارتقا' کے آئینے میں' اور تیر و کمان پچاس ہزار سال پرانا ہتھیار نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔ اس کے علاوہ مصنف نے احمد وصی کی کتاب 'تحریریں'، محمد خلیل کی 'حیوانات کی دنیا' اور صاحب علی کے تیار کردہ مونوگراف ریاض خیر آبادی پر تبصرے کیے ہیں۔

رئیس صدیقی صاحب نے مذہبی موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ ہم روزہ کیوں رکھیں، رمضان کا اہم پیغام: صلہ رحمی اور عید ملن جیسے مضامین ان کی مذہبی معلومات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اردو کا رشتہ سائنس سے جوڑنے اور اردو زبان کو متمول بنانے کے لیے انھوں نے ایک اہم مضمون 'اردو اور سائنس' لکھا ہے جو اس مجموعے کی زینت ہے، صنعت سے متعلق ان کا مضمون 'پلاسٹک کا کمال' ایک منفرد مضمون ہے، اس میں پلاسٹک کی پیداوار اور اس کے روزگار کو بیان کیا گیا ہے، مجموعے کا آخری مضمون 'تحریری گفتگو کا آرٹ' خطوط نویسی کے اصول و ضوابط بیان کرتا ہے۔

رئیس صدیقی صاحب کے یہ تمام مضامین ادبیت و علمیت سے پر ہیں، انھوں نے اپنی تحریر میں آسان زبان اور سادگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ جیسا کہ 'عرض مصنف' کے تحت مجموعے کے شروع میں وہ لکھتے ہیں: ایک میڈیا پرسن کی حیثیت سے میں اپنی معلومات آسان زبان و انداز میں آپ سے شیئر کر رہا ہوں۔ یہی سادگی اور صفائی مضامین کی خوبصورتی کا راز بن گئی ہے

ناول

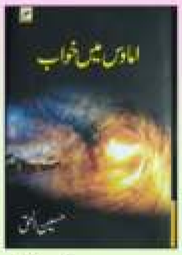

اماوس میں خواب

مصنف: حسین الحق سنہ اشاعت 2017

صفحات: 347 قیمت: 350 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: محمد محفوظ الحسن، دار العلی، نیو کالونی، نیو کریم گنج، گیا

حسین الحق اپنے معاصرین میں اپنے منفرد لب و لہجے، انداز بیان اور فکر و فلسفے کی وجہ سے بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 'فرات' اور 'بولو مت چپ رہو' جیسے ناول بھی ان کی تخلیقات میں اہم اور نمایاں ہیں۔

حسین کا تازہ ترین ناول 'اماوس میں خواب' ان کے مشاہدے، جذبے اور احساس کا آئینہ ہے۔ اس ناول کا بیانیہ روایتی بیانیہ سے کچھ الگ ہے۔ خواب سے ناول کی ابتدا ہوتی ہے اور اس کا اختتام بھی خواب ہی پر ہوتا ہے۔ ایک خواب ماضی قریب کے انتشار اور بحرانی کیفیتوں سے گزرتا ہوا حال کے تلاطم خیز منظر نامے کی تشکیل کرتا ہے تو دوسرا خواب ملگجے مستقبل کے دھندلکوں میں گڈمڈ نظر آتا ہے۔ شروع میں ایک شعر ہے جو موجودہ تناظر میں ناول کے قصے کی معنویت پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔ ایک بے چینی ہے جو کسی کروٹ چین لینے نہیں دیتی ہے۔ ذرا سا سکون لینے نہیں پاتا کہ دوسری آزمائش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

میرے خیال میں یہ ناول ایک ایسا استعاراتی بیانیہ ہے جس میں برصغیر اور اس کے اطراف کے ممالک میں ایک خاص طبقہ اس بیانیہ کا مرکزی ہدف ہے جو اپنے وجود کی بقا کی کشاکش، کش مکش اور ناگفتہ بہ حالات سے چھٹکارا حاصل کرنے کی چھٹپٹاہٹ میں ہے۔ مگر وہ جتنا ہاتھ پاؤں مارتا ہے اتنا ہی ناکردہ گناہی کی سزا پاتا نظر آتا ہے۔

ناول کا ہیرو اسماعیل ہے۔ یہ اسماعیل ایک علامت ہے یا استعارہ ہے۔ یہ وقت طے کرے گا مگر اتنا طے ہے کہ وہ صبر و ضبط کا اور ناموافق حالات کو موافق بنانے کے لیے جد و جہد کا ایک نمونہ ہے۔ اسمٰعیل فساد میں سب کچھ کھو دینے کے بعد کسمپرسی کی حالت میں بھی خواب دیکھتا ہے یہ خواب ایران، افغانستان، اور مشرق وسطی کے انتشار، بے چینی اور کش مکش کا اشاریہ ہے۔ خواب سے بیداری کے بعد جنگل اور ندی کنارے کا منظر...... استعارہ ہے یا اشاریہ ہے، اچھے دنوں کی واپسی کا۔ ملنگ کی درگاہ پھر وہاں کا منظر اور ایک فقیر کا ملنا یہ بھی استعارہ ہے۔ موجودہ حالات میں مل جل کر اتحاد و اتفاق کے

مظاہرے کا اور صوفی سنتوں کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر زندگی گزارنے کا۔ خواب سے بیداری کے بعد کا یہ منظر نامہ دراصل استعارہ ہے، اسمٰعیل کی زندگی کی نئی شروعات اور جد وجہد کا۔

اسی قصے کی ایک کڑی ناول کا ہیرو اسمٰعیل ہے جو ممبئی میں لٹتا ہے تو بہار آ کر بس جاتا ہے جہاں سے اس کے اجداد نے نقل مکانی کی تھی۔ یہ نقل مکانی اولاد اسمٰعیل کو وراثت میں ملی ہے، یہ ایک تاریخی تسلسل ہے جو اس وقت تک باقی رہے گا جب تک یہ کائنات باقی ہے۔ ممبئی سے بہار آنے اور پھر بم بلاسٹ میں موت ہو جانے تک کا عرصہ طویل ہے۔ اس عرصے میں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں عموماً اور بہار میں خصوصی طور پر سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی تہذیبی، تمدنی، اخلاقی اور تعلیمی سطح پر جو تبدیلی ہوئی اور جس طرح یہاں کے نظام زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہے۔ ان کو بڑی فنی چابکدستی کے ساتھ ناول میں سمویا گیا ہے۔

حسین کے اسلوب کی شگفتگی ابتدائی فلسفیانہ اوراق کو چھوڑ کر قاری کو اپنی گرفت میں لیے رہتی ہے۔ حسین نے اس ناول میں سیاست، مذہب، تصوف، تہذیب اور تعلیم کے موجودہ منظر نامے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ناول کا مرکزی خیال میری نظر میں یہ ہے کہ کسی مخصوص نظریے کے تحت زندگی تو گزاری جاسکتی ہے، حکومت نہیں کی جاسکتی۔ کامیاب حکمرانی کے لیے موجودہ تناظر میں ہم خیالی سے زیادہ ہم سفری اہم ہے۔ اگر ہم سفر مل گیا تو ایک خاص ہدف تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے ہندوستان کی نجات ہم خیالی سے زیادہ ہم سفری میں ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ آزادی کے بعد سے اب تک ہندوستانی مسلمان جس نفسیاتی اذیت اور کش مکش میں مبتلا ہے اور جس کشا کش کا شکار ہے اور جس بے اعتباری کی فضا میں سانس لے رہا ہے اور جس ناکردہ گناہی کا مجرم گردانا جا رہا ہے اور اس سے نجات کی ہر کوشش میں وہ مزید الجھنوں کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا اظہار یہ اس ناول کو کہا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں موجودہ وطنی منظر نامے کا استعارہ 'اماوس' ہے اور اماوس کے اس اندھیرے سے نکلنے کی کوشش کو 'خواب' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یا پھر اماوس کو آپ آج کی سنگینیوں کا استعارہ کہہ سکتے ہیں اور خواب کو اچھے دنوں کا استعارہ۔

میری رائے میں اماوس کی تاریکی میں دیکھے گئے اس خواب کی تعبیر تبھی خوش آئند ہوگی جب اس اندھیرے کو چیر کر صبح روشن کے لیے اجتماعی اور شعوری تگ و دو کی جائے، انفرادی کوشش ایک لمحے کے لیے روشنی کا جھماکا تو بن سکتی ہے مگر راہ کے پتھر اور خار زاروں کو ہٹا کر منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتی ہے۔

حسین الحق کا یہ ناول کئی طرح کے سوالات کھڑا کرتا ہے۔ توقع ہے حسین کا یہ ناول ادب نوازوں کے درمیان موضوع بحث رہے گا۔

شاعری

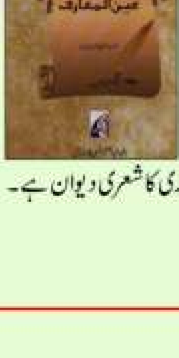

عین المعارف (دیوان آسی)

شاعر: حضرت آسی غازی پوری، مرتب: حضرت فانی گورکھپوری

صفحات: 416، قیمت: 400، سنہ اشاعت: 2017

ناشر: شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی

مبصر: امتیاز سرمد A-170، گراؤنڈ فلور 3

سوریا اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی 95

زیر تبصرہ کتاب معروف صوفی شاعر حضرت آسی غازی پوری کا شعری دیوان ہے۔

حضرت آسی کی وفات کو سو سال سے زائد عرصہ گزر گیا، لیکن کلام آسی کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ روز افزوں اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ یہ دیوان پہلے بھی متعدد بار زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔ پہلی بار اسے محمد اظہر مرچنٹ نے سلیمان پریس بنارس سے 1917 میں شائع کرایا، دوسری بار آسی پریس گورکھپور سے شائع ہوا اور تیسری بار ادارہ یادگار آسی غازی پوری، کراچی، پاکستان سے 1988 میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ کراچی والا نسخہ صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے معتبر ہے اور اہمیت کا حامل بھی۔ اسی نسخے کو بنیاد بنا کر انجمن فیضان رشیدی، کمرہٹی، کلکتہ نے 1997 میں اسے شائع کیا تھا۔ نسخہ کراچی کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن، نئی دہلی نے جنوری 2017 میں اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

دیوان آسی 'عین المعارف' کے مرتب سید شاہد علی سبز پوش فانی گورکھپوری ہیں، جو حضرت آسی کے تلمیذ ارشد، مرید وخلیفہ اور جانشین تھے۔ انھی کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس نسخے کی تصحیح، تحقیق اور نظر ثانی کی ذمے داری معروف ناقد، محقق اور شاعر ڈاکٹر فضل الرحمٰن شرر مصباحی (سابق صدر: شعبۂ معالجات، طبیہ کالج، قرول باغ، دہلی) نے بحسن وخوبی انجام دی ہے۔

416 صفحات پر مشتمل اس دیوان کے باب تعارف میں طبع شدہ نسخوں کے سرورق کا عکس اور کلام آسی کا اشاعتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس اشاعتی جائزے میں فاضل گرامی ابرار رضا مصباحی نے کلام آسی کی اشاعت کے تعلق سے اپنا تحقیقی نقطۂ نظر پیش کر کے قارئین کے لیے معلومات کا بیش بہا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ یقیناً موصوف کی یہ تحریر حضرت آسی پر تحقیق کرنے والوں کے لیے سنگ میل ثابت ہوگی۔ نقد و نظر کے باب میں 'حضرت آسی کی شاعری' کے عنوان سے مجنوں گورکھپوری کا مقالہ شامل ہے، جس میں انھوں نے آسی کے کلام کے محاسن بیان کرتے ہوئے خوب نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ آسی غازی پوری کے کلام کے تعلق سے مرزا غالب، علامہ کیفی چریا کوٹی، مولانا محمد علی جوہر، عارف ہسوی، پروفیسر حامد حسن قادری، عبدالسلام ندوی، پروفیسر کلیم الدین احمد، فراق گورکھپوری، شمس الرحمٰن فاروقی جیسے مشاہیر اور یکتائے روزگار کے تاثرات اس نسخے کو مزید وقیع بناتے ہیں۔

حضرت آسی کے احوال و آثار کا جائزہ لیتے ہوئے مرتب دیوان، سید شاہد علی سبز پوش فانی گورکھپوری نے آسی غازی پوری کے حالات کو تفصیلی طور پر پیش کیا ہے۔

حضرت آسی ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ اسلوب و زبان کے لحاظ سے ان کا بڑا مرتبہ ہے۔ ان کی شاعری عشق و محبت کی شاعری ہے۔ انھوں نے خیال بندی کا سہارا لے کر عشق حقیقی کو عشق مجازی کا جامہ پہنایا ہے۔ تصوف کے تمام تر اہم مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ حضرت آسی نے صوفیانہ اقدار کا پاس و لحاظ جس انداز سے کیا ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں کم ہی ملیں گی۔ اس حوالے سے عہد حاضر کے معروف ناقد شمس الرحمٰن فاروقی نے دو ٹوک کہا ہے:

''حضرت آسی سکندر پوری کے کلام میں خواہ وہ غزل ہو خواہ رباعی، اردو زبان کی سلاست، شگفتگی اور برجستگی کے وہی انداز نظر آتے ہیں جو ہمارے تمام بڑے شعرا کا خاصہ ہیں۔ چوں کہ خیال بندی کے رنگ میں تجریدی، پیچیدہ لیکن غیر حقیقی مضامین بیش از بیش بندھتے ہیں، اس لیے متصوفانہ مضامین اور تصوف کی سرمستی اور ربوبیت کے انداز خیال بندی سے بہت بعید ہیں۔ آسی سکندر پوری صاحب کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ دبستان ناسخ کے میر ہیں، ان کا کمال دراصل یہ ہے کہ انھوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا،

یعنی خیال بندی کے رنگ میں تصوف بھر دیا۔

واقعی آسی کی شاعری زبان و بیان کے لحاظ سے اہل نظر کو دعوت فکر و نظر دیتی ہے، یاران نکتہ داں کو صلائے عام دیتی ہے اور سالکان راہ طریقت کی راہ نمائی کرتی ہے۔ آسی کا یہ دعویٰ بھی ان کی سخن فہمی کی راہیں ہموار کرتا ہے۔

شعر گوئی نہ سمجھنا کہ میرا کام ہے یہ
قالب شعر میں آسی فقط الہام ہے یہ

آسی کا کلام ان کے زمانے کے اہم اخبارات و رسائل کی زینت بنتا تھا اور شعری ذوق رکھنے والوں کے لیے تسکین کا سامان فراہم کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوان کی اشاعت کے ساتھ ساتھ آپ کے کلام کا انتخاب بھی الگ الگ ناموں سے شائع ہوتا رہا ہے۔ حضرت آسی کے یہاں تصوف اور تغزل کی جلوہ گری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

حسن کی کم نہ ہوئی گرمی بازار ہنوز
نقد جاں تک لیے پھرتے ہیں خریدار ہنوز
عاشقی میں ہے محویت در کار
راحت وصل و رنج فرقت کیا

مرزا غالب کا مشہور زمانہ شعر ہے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اس شعر کے مفہوم کو ذہن میں رکھ کر آسی کا درج ذیل شعر ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔

قطرہ وہی کہ روکش دریا کہیں جسے
یعنی وہ میں ہی کیوں نہ ہوں تجھ سا کہیں جسے

حاصل گفتگو یہ کہ دیوان آسی کی تازہ ترین اشاعت مثالی ہے۔ عمدہ کاغذ، کلاسیکی رنگ لیے ہوئے سرورق، مضبوط جلد بندی، نفیس طباعت اور آسی شناسی کے باب میں قابل قدر مواد؛ یہ تمام خصوصیات اب تک کی تمام تر اشاعتوں سے اسے ممتاز کرتی ہیں۔ اس مستحسن اقدام کے لیے شاہ عبدالعلیم آسی فاؤنڈیشن کے تمام ترذمے داران مبارک باد کے مستحق ہیں۔

سماجیات

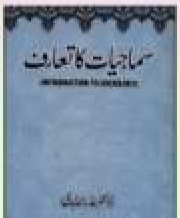

سماجیات کا تعارف

مصنفہ: ڈاکٹر عذرا عابدی

صفحات: 373، قیمت: 280 روپے، سنہ اشاعت: مئی 2017

ناشر: نور پبلی کیشنز، دریا گنج نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر خواجہ محمد ضیاء الدین، البیرونی مرکز برائے سماجی اخراج و شمولیتی پالیسی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد 500032 (تلنگانہ)

اس کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے یہ جاننا اردو قارئین کے لیے بے حد ضروری ہے کہ ہندوستان ایک کثیر لسانی ملک ہے اور ہندوستان میں جتنی زبانیں اور بولیاں ہیں ان سب کو بھارت کے آئین میں شمار کیا گیا ہو ایسا نہیں ہے۔ متعدد بولیوں اور زبانوں والے اس ملک میں اردو کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ یہ اس زبان کی سادگی اور سلاست ہے جس کے سبب یہ عام لوگوں میں مقبول اور رائج ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو میں سماجی علوم پر تصانیف کی ضرورت کو آج کے دور میں بھی محسوس کیا جا رہا ہے۔

'سماجیات کا تعارف' جو علم سماجیات کے طلباء کے لیے ڈاکٹر عذرا عابدی صاحبہ کی طرف سے ایک بہترین کوشش کے طور پر تحریر کی گئی اس کی ضرورت کئی سال سے تمام طلبا اور قارئین کو تھی۔ اس کتاب سے وہ طلبا استفادہ کر رہے ہیں جو اپنی مادری زبان اردو میں سماجیات مضمون کو پڑھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرا طبقہ وہ بھی ہے جو اردو سے محبت رکھتا ہے اور اردو میں مواد تلاش کرتا ہے۔ میں نے اپنے پندرہ سال کے تدریسی سفر میں ان طلباء کو دیکھا ہے جو اردو میں مواد دستیاب نہ ہونے کے سبب مختلف قسم کی دقتوں کا سامنا کرتے ہیں۔ اس مسئلے کا حل پیش کر کے ڈاکٹر عذرا عابدی نے خود کو مبارک باد کا مستحق قرار دیا ہے۔

علم سماجیات کے ضمن میں مصنفہ کی یہ نمایاں کوشش پچیس عنوانوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ عنوانات ہیں جنھیں ہم علم سماجیات کے ابتدائی تصورات کہتے ہیں۔ پہلا باب 'سماج' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے حالانکہ یہ باب دوسرے نمبر پر اور دوسرا باب 'سماجیات' پہلے باب میں ہونا چاہیے تھا کیونکہ سماجیات ایک ایسا مضمون ہے جس کے ذریعے سماجی علوم کے تمام طلبا کو سماجیاتی علم حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دوسرا باب طویل اور سماجیات کی ارتقا و نشو ونما سے جڑا ہے۔ بیسویں صدی نے جس طرح ترقی کی ایک نئی مثال پوری دنیا کے سامنے پیش کی ہے وہ قابل غور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 1874 میں ہیل یونیورسٹی میں اور 1889 میں فرانس میں سماجیات مضمون شروع کیا گیا۔ یہ باب دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ علم سماجیات دوسرے سماجی علوم کے مقابلے زیادہ دلچسپ اور عمدہ اس لیے ہے کہ یہ سماج کے مختلف مسئلے اور مسائل پر اظہار خیال کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی ایک اہم پہلو اس کتاب میں ملتا ہے کہ مصنفہ نے سماجی اداروں کو تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے اور مختلف سماجی اداروں سے قارئین کو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے جس میں مذہبی ادارے، معاشی ادارے، سیاسی ادارے، شادی، خاندان وغیرہ شامل ہیں۔

مصنفہ نے جہاں اپنی محنت اور علمی کاوشوں کے ذریعے علم سماجیات کو عام قارئین تک پہنچانے کی کوشش عام فہم زبان میں کی ہے تو دوسری طرف اس کتاب کے ذریعے یہ سمجھنے میں ہمیں آسانی بھی ہوتی ہے کہ کس طرح علم سمایات ایک سماجی سائنس کی حیثیت رکھتا ہے۔ بیشک قارئین کو علم سماجیات کو پڑھنے کا ایک بہترین موقع عذرا عابدی صاحبہ نے اپنی اس تصنیف کے ذریعے دیا ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ نے عالم کاری کے دور میں ابھرتے ہوئے کچھ اہم تصورات جیسے کثیر اکائیت، کثیر ثقافتیت، ثقافتی اضافیت، تکثیریت وغیرہ کو بھی شامل کیا ہے جو بے حد معلوماتی ابواب ہیں۔

یہ کتاب اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے تمام طلبا کے لیے مفید ثابت ہوگی اور ان کے علم میں اضافے کا سبب بنے گی۔ کتابیات کو اور بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ آئندہ کے شمارے میں اس سمت توجہ دینے کی ضرورت ہے تا کہ قارئین اور بہتر مواد دوسرے ذرائع سے بھی حاصل کر سکیں۔ اپنی نیک خواہشات اور دلی مبارکباد مصنفہ کو پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ دوسرے موضوعات پر بھی کتابیں مستقبل میں تحریر کریں گی تا کہ اردو کے ذریعے علم سماجیات کے طلبا معیاری مواد حاصل کر سکیں۔

■

عبدالحی

نئی دہلی عالمی کتاب میلے میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام

کل ہند مشاعرے کا انعقاد

پرگتی میدان میں نئی دہلی عالمی کتاب میلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ایک کل ہند مشاعرے کا ہنس دھونی تھیٹر میں انعقاد کیا گیا۔ مشاعرے کے آغاز میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے سبھی شعرا کا استقبال کیا۔ انھوں نے مشاعروں کی اہمیت وافادیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ مشاعرے ہماری مشترکہ تہذیب کا اٹوٹ حصہ رہے ہیں اور مشاعروں نے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کی اشاعتی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ساتھ ہی نیشنل بک ٹرسٹ کا بھی شکریہ ادا کیا۔ اس کل ہند مشاعرے کی صدارت ممبئی سے تشریف لائیں شاعرہ محترمہ رعنا تبسم نے کی جب کہ نظامت بنگلور سے آئے شاعر شفیق عابدی نے انجام دی۔ اس مشاعرے میں گلزار دہلوی، وسیم بریلوی، شہپر رسول، پاپولر میرٹھی، لتا حیا، نصرت مہدی، افضل منگلوری جیسے معروف شعرا نے اپنے کلام سنائے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کے شکریے کے ساتھ مشاعرہ شام ساڑھے پانچ بجے اختتام کو پہنچا۔ مشاعرے کے آخر تک شائقین کی بڑی تعداد موجود رہی۔ پیش ہیں مشاعرے میں پڑھے گئے کچھ منتخب اشعار:

آپس میں یہاں کوئی بھی لڑنا نہیں چاہتا
کچھ لوگ مگر پیار سے رہنے نہیں دیتے
مختلف مذاہب کے لوگ ساتھ رہتے ہیں
ایک ملک ہے ایسا جس کو ہند کہتے ہیں
تمھارے آنے کی دن بھر تو آس رہتی ہے
پھر اس کے بعد طبیعت اداس رہتی ہے
جو اپنی زندگی سے خوش نہیں ہے
وہ دنیا میں کسی سے خوش نہیں ہے
جو اوروں کی خوشی سے خوش نہیں ہے
خدا اس آدمی سے خوش نہیں ہے
پہلے رہتے تھے مکانوں میں بڑے چین سے لوگ
اور اب ذہن میں لوگوں کے مکاں رہتے ہیں
(سریندر شجر)

فکر و احساس کی خوشبوؤں سے زندہ ہیں
دل میں جلتے ہوئے شعلوں کے لیے زندہ ہیں
(شفیق عابدی)

چھا گئی ساری فضا پر یہ ستم گر بن کر
وہ جیے گا جو رہے گا یہاں خنجر بن کر
جب لبوں پر آگیا اس کی جفاؤں کا گلہ
اس نے برجستہ اسے میرا مقدر کہہ دیا
(قاری فضل الرحمٰن انجم، ہاپوڑ)

رشتوں میں روگ پھیلا ہے سرطان کی طرح
گھر کے ہی لوگ ملتے ہیں انجان کی طرح
بستی میں چند لوگ سلیقے کے رہ گئے
گلشن سمٹ کر ہوگیا گلدان کی طرح
قبضے میں لیے بیٹھا رہا سارا سمندر
کنجوس نے ایک بوند بھی خیرات نہیں کی
(شفیق بجنوری شفق)

دوست اردو کی ہوں ہندی کی نگہبان ہوں میں
گیت اور غزلوں کی کھوئی ہوئی پہچان ہوں میں
اپنے دل میں مجھے تھوڑی سی جگہ دے دیجیے
آپ کے شہر میں دو پل کی ہی مہمان ہوں میں
(شبانہ شبنم اجین، مدھیہ پردیش)

کوئی کب جان کے سرگرم سفر ہوتا ہے
گھر تو جیسا بھی ہو ہر حال میں گھر ہوتا ہے
مرحلے عشق کے سب نیٹ پر طے ہوتے ہیں
اب کتابوں میں کوئی پھول نہ پر ہوتا ہے
(پروفیسر فاروقی بخشی، حیدرآباد)

وہ نہیں میرا مگر اس سے محبت ہے تو ہے
یہ اگر رسم و رواجوں سے بغاوت ہے تو ہے
سچ کو میں نے سچ کہا جب کہہ دیا تو کہہ دیا
اب زمانے کی نظر میں یہ حماقت ہے تو ہے
دوست بن کر دشمنوں سا وہ ستاتا ہے مجھے
پھر بھی اس ظالم پہ مرنا اپنی فطرت ہے تو ہے
کب کہا میں نے کہ وہ مل جائے مجھ کو
وہ غیر نہ ہوجائے مجھ سے بس اپنی حسرت ہے تو ہے
(دیپتی مشرا، ممبئی)

نئی زمین بنانے میں وقت لگتا ہے
اس آسمان تک آنے میں وقت لگتا ہے
ابھی سمیٹ نہ خود کو تو اے صدائے جنوں
کسی کسی کو جگانے میں وقت لگتا ہے
ہم وہ رسوائے زمانہ ہیں کسی بھیس میں ہوں
دور ہی سے ہمیں پہچان لیا جاتا ہے
دیوار اٹھانے کی تجارت نہیں آئی
دلی میں رہے اور سیاست نہیں آئی
بکنے کو تو سب بک گیا بازار میں لیکن
جو آپ بتاتے تھے وہ قیمت نہیں آئی

(عبیداعظم اعظمی،ممبئی)

وہ جب بساط پر مہروں کو چال دیتا ہے
تو ہار جیت کے خانے میں ڈال دیتا ہے
وہ اپنی مرضی کا مالک ہے اپنی مرضی سے
خوشی کسی کو کسی کو ملال دیتا ہے
شاید کہ میسر ہوا دیوار کو روغن
اب کہ تیرے گھر میں کلینڈر نہیں دیکھا

(ذکی طارق،غازی آباد)

میں ہوں جس حال میں اے میرے صنم رہنے دے
تیغ مت دے میرے ہاتھوں میں قلم رہنے دے
میں تو شاعر ہوں مرا دل ہے بہت ہی نازک
میں پٹاخے سے ہی مر جاؤں گا بم رہنے دے
نہ بنگلا نہ ٹی وی نہ پکچر سنیما
نہ سیونگ آکاؤنٹ نہ جیون کا بیا
مجھے ایک رنڈوے کی خواہش پتہ ہے
ولیمہ ولیمہ ولیمہ ولیمہ
میری عمر کیا ہے یہ کیوں پوچھتی ہو
کہیں عشق کا جوش ہوتا ہے دھیما

(پاپولر میرٹھی،میرٹھ)

سارے جہاں میں سب سے جو پیاری زبان ہے
وہ فخر ہند اردو ہماری زبان ہے
منہ سے تو بولیے ذرا محسوس ہوگا خود
واللہ کتنی خستہ کراری زبان ہے
ہندوستان کی بیٹی کو کرتا ہے جگ سلام
ہندی کی بہن اردو جو پیاری زبان ہے

(افضل منگلوری،اتراکھنڈ)

عشق میں مجنوں و فرہاد نہیں ہونے کے
یہ نئے لوگ ہیں برباد نہیں ہونے کے
یہ جو دعوے ہیں محبت کے ابھی ہیں جاناں
اور دو چار برس بعد نہیں ہونے کے
کیا کہا توڑ کے لاؤ گے فلک سے تارے
دیکھو ان باتوں سے ہم شاد نہیں ہونے کے
گھر لیے پھرتی ہوں تمھارے پیچھے
تم لیکن ہو کہ آباد نہیں ہونے کے
ہم نے خود پہنی ہے وفا کی زنجیر نصرت
ہم خود سے آزاد نہیں ہونے کے

(نصرت مہدی،بھوپال)

ماں تو بس ماں ہوتی ہے
تیری میری کہاں ہوتی ہے

(ڈاکٹر نریندر کمار،ہریانہ)

یہ بات جانتے ہیں میرے ہمنوا بھی
میزان حق پہ اپنا سخن تولتی ہوں میں
اب کیا ملے گی مجھ کو سزا آپ سوچیے
میرا قصور یہ ہے کہ سچ بولتی ہوں میں

(لتا حیا،ممبئی)

اس نے سیلاب کی تصویر بنا بھیجی تھی
اسی کاغذ سے مگر ناؤ بنا دی میں نے

میری نظر کا مدعا اس کے سوا کچھ بھی نہیں
اس نے کہا کیا بات ہے میں نے کہا کچھ بھی نہیں
جس سے نہ کہنا کبھی جس سے چھپانا تھا کبھی
سب کچھ اسی سے کہہ دیا مجھ سے کہا کچھ بھی نہیں
اب کے بھی اک آندھی چلی اب کے بھی سب کچھ اڑ گیا
اب کے بھی سب باتیں ہوئیں لیکن ہوا کچھ بھی نہیں

(پروفیسر شہپر رسول،دہلی)

تاریخ وطن حسن وفا ہے اردو
ہر ذرے پہ بھارت کے فدا ہے اردو
آزادی کی تحریک پہ ڈالو تو نظر
کھل جائے گا یہ راز کہ کیا ہے اردو

(گلزار دہلوی،نوئیڈا)

زمیں تو جیسی ہے ویسی ہی رہتی ہے لیکن
زمین بانٹنے والے بدلتے رہتے ہیں
میں اک ندی کی طرح بہہ رہا ہوں صدیوں سے
اگر ٹھہر گیا ہوتا تو جھیل ہوجاتا
آسماں اتنی بلندی پہ جو اتراتا ہے
بھول جاتا ہے زمیں سے ہی نظر آتا ہے
ضروری ہے کہ تہمت ہی لگاؤ بے وفائی کی
محبت آزمانے کے طریقے اور بھی تو ہیں
لہراتی بل کھاتی چڑیا ہوا سے کہتی لگتی ہے
اڑنے پر آؤ تو دنیا کتنی چھوٹی لگتی ہے
کل اک گاؤں کی بڑھیا میری کار سے جب ٹکرائی
بولی تیرا دوش نہیں ہے ہمیں کو دکھت ناہی
بھٹکتے مرضی سے اپنی کہیں بھی کھوجاتے
ہم اپنے بس کے ہی کب تھے کہ تیرے ہوجاتے
ہم اپنی سطح سے گر ہی نہیں سکے ورنہ
بہت سے لوگ ہمارے بھی ساتھ ہوجاتے

(وسیم بریلوی)

تم کو اپنا ہم سفر جب کہہ دیا تو کہہ دیا
اب نہیں دنیا کا ڈر جب کہہ دیا تو کہہ دیا
دل کی ویرانی کا سارا حال ان کے روبرو
ہو نہ ہو ان پر اثر جب کہہ دیا تو کہہ دیا
انتہائے شوق سے مجبور ہوکر حال غم
کیا کہیں بار دگر جب کہہ دیا تو کہہ دیا
ان کے نقش پا کو اپنی منزلوں کا رہنما
ہم نے بے خوف و خطر جب کہہ دیا تو کہہ دیا

(رعنا تبسم،ممبئی،صدر مشاعرہ)

■

Abdul Hai
ahaijnu@gmail.com

عالمی اردو نامہ

چھ زبانوں کا ماہر حافظ عبدالرحمٰن اوزار پی ایچ ڈی

رباط: دنیا بھر میں نابینا افراد تو بے شمار ہوں گے مگر بصارت سے محروم بعض لوگ قدرت کی کچھ دیگر صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ ایسے ہی ایک نابینا مراکش کے جنوبی شہر یکان کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہونے والے عبدالرحمٰن اوزار ہیں۔ مرکز اطلاعات فلسطین نے اس باہمت مراکشی نوجوان کی صلاحیتوں پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ عبدالرحمٰن اوزار نابینا ہونے کے باوجود چھ زبانوں کا ماہر، حافظ قرآن اور پی ایچ ڈی کا طالب علم ہے۔ اوزار کو پیدائش کے محض دو ماہ کے بعد ایک بیماری نے بصارت سے محروم کر دیا۔ جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوا تو اسے مراکش میں نابینا بچوں کے لیے قائم کردہ ایک اسکول میں داخل کر دیا گیا جہاں سے اس نے میٹرک کا امتحان اعلیٰ نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ ترک خبر رساں ادارے اناطولیہ سے بات کرتے ہوئے عبدالرحمٰن نے کہا کہ جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو مجھے احساس ہوا کہ نابینا پن پر غلبہ پانے کا واحد راستہ تحصیل علم ہے۔ انتیس سالہ عبدالرحمٰن نے بتایا کہ میں نے فرانسیسی ادب کی تعلیم کے حصول کے لیے مراکش کی قاضی عیاض یونیورسٹی میں داخلہ لیا، مگر کالج میں بہتر تعلیمی کارکردگی پر مجھے میڈیکل کے شعبے میں داخلہ مل گیا۔ طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسلامیات میں گریجویشن کی اور ایم اے میں تخصص کے بعد اسلامی قانون میں اعلیٰ ڈاکٹریٹ میں داخلہ لے لیا۔ عبدالرحمٰن اوزار نے کئی دوسرے علوم وفنون سیکھے جن میں موسیقی، انفارمیشن ٹیکنالوجی کا کورس بھی شامل ہیں۔ جو چھ زبانیں حافظ عبدالرحمٰن نے سیکھیں، ان میں فرانسیسی، جرمن، انگریزی، اسپانوی اور امازیغی زبانیں شامل ہیں۔ اس عرصے میں اس نے بریل کی مدد سے قرآن کریم پڑھا اور اسے مکمل حفظ کیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 20 جنوری 2018

مشاعرہ جشن جمہوریہ کا انعقاد

دمام: سفارت خانہ ہند سعودی عرب کا سالانہ مشاعرہ جشن جمہوریہ سعودی عرب کے چار بڑے شہروں ریاض،

جبیل، دمام اور جدہ میں منعقد ہوا جس سے مملکت میں مقیم پانچ ہزار سے زائد پرستاران اردو محظوظ ہوئے۔ پہلی مرتبہ مشاعرہ چار شہروں میں منعقد کرنے کا سہرا ہندوستانی سفارت خانے کے فرسٹ سکریٹری ڈاکٹر حفظ الرحمٰن کے سر جاتا ہے۔ خیال رہے کہ وزارت خارجہ ہند کے اعلیٰ عہدے داروں کی ایک فہرست ہے جنھوں نے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمات انجام دیں ہیں، ان میں مالک رام، حسن نعیم دلیپ سنگھ، ذکر الرحمٰن اور ہمارے دور میں ڈاکٹر حفظ الرحمٰن اعظمی شامل ہیں۔ اس سال ہندوستان سے 10 شعرا کو مدعو کیا گیا تھا جن میں مظفر حنفی، وسیم بریلوی، فیاض فاروقی، عقیل رضوی، سردار سلیم، لیاقت جعفری، علینہ عترت، اقبال اشہر، ابرار کاشف، ندیم شاد اور نعیم فراز شامل تھے۔ ریاض میں مشاعرہ انٹرنیشنل انڈین اسکول کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ محفل کا آغاز ندیم شاد کی نعت پاک سے ہوا۔ اقبال اشہر نے اپنی مشہور زمانہ نظم اردو پیش کی۔ مشاعرے کی خاص بات یہ تھی کہ کسی ایک شاعر نے نہیں بلکہ ہر ایک شاعر نے بے پناہ داد حاصل کر کے مشاعرہ لوٹا۔ محفل کا باضابطہ آغاز نعیم فراز کے کلام سے ہوا۔ محفل کے روح رواں ڈاکٹر حفظ الرحمٰن نے مہمان شعرا اور سامعین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ پچھلے کئی برسوں سے سفارت خانہ کئی ایک ثقافتی پروگرام منعقد کرتا رہا ہے اور مستقبل میں بھی یہاں مقیم ہندوستانی خواتین و حضرات کے لیے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ سفیر ہند احمد جاوید نے شمع روشن کر کے مشاعرے کا آغاز کیا۔ مشاعرہ کی صدارت مظفر حنفی اور نظامت ابرار کاشف نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 جنوری 2018

قانونی اصطلاحات کی آسان تفہیم وتعبیر کی ضرورت: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں لیگل پینل کی میٹنگ کا انعقاد

نئی دھلی: قانونی دستاویزات کی اہمیت ہمیشہ رہتی ہے اس کی اہمیت اور معنویت سے انکار ممکن نہیں۔ ہماری عدالتوں کی زبان فارسی اور اردو پر مشتمل ہے۔ اس حوالے سے جو اصطلاحات عدالتوں اور محکمۂ پولیس میں مستعمل ہیں، عہد حاضر کے متعلقہ افسران کو اس کو سمجھنے میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کونسل ان پریشانیوں کے حل کے لیے سہ روزہ ریفریشر کورس کا انعقاد صدر دفتر دہلی کے علاوہ مختلف ریاستوں میں کرنے جا رہی ہے۔ جس میں حکومت ہند کے مختلف شعبہ جات مثلاً محکمۂ پولیس، تفتیشی ایجنسیاں، سی بی آئی، این آئی اے، آئی بی کے علاوہ محکمۂ مالیات اور عدلیہ سے متعلق حضرات کو مدعو کرے گی۔ اور ایسے ماہرین قانون سے خدمات لے گی جو نہ صرف اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھتے ہوں بلکہ عدلیہ کے طریقۂ کار سے بھی واقف ہوں۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ لیگل پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس سے نہ صرف ان اداروں کے افسران کو افہام وتفہیم میں آسانی ہوگی بلکہ اردو داں طبقہ کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ اس میٹنگ کی صدارت معروف ماہر قانون پروفیسر طاہر محمود نے کی۔ انھوں نے ڈاکٹر ظفر محفوظ نعمانی کی کتاب 'بین الاقوامی قانون' کی عنقریب اشاعت پر خوشی کا اظہار کیا اور کونسل کے ڈائرکٹر کی کاوشوں کی ستائش کی۔

اس موقعے پر جناب احتشام عابدی نے ایک تجویز پیش کی کہ کونسل ٹیکس اور جی ایس ٹی سے متعلق عام فہم زبان میں ایسی کتاب لائے جس سے سماج کے ایک بڑے طبقے کو فائدہ پہنچ سکے۔ قانونی سمجھ نہ ہونے کے سبب مالی نقصان اور وقت کی بربادی ہوتی ہے۔ تمام ممبران نے اس تجویز کو منظوری دی۔

میٹنگ میں پروفیسر طاہر محمود، پروفیسر خواجہ عبد المنتقم، جناب احتشام عابدی، ڈاکٹر افضل قادری، ڈاکٹر محمد ظفر محفوظ نعمانی کے علاوہ کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر ڈاکٹر محمد فیروز عالم، ریسرچ اسسٹنٹ محترمہ ذیشان فاطمہ اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 23 جنوری 2018

قومی اردو کونسل میں فارسی پینل میٹنگ کا انعقاد

نئی دہلی: آج کے عہد میں وہی زبانیں زندہ و تابندہ ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر روزگار سے جڑی

ہیں۔ اردو، فارسی و عربی ہندوستان میں ایسی زبانیں ہیں جو روزگار سے بہت دور ہیں۔ اس لیے ان زبانوں میں یونیورسٹی کے اندر ڈراپ آؤٹ کا ایک بڑا مسئلہ درپیش ہے۔ کونسل ان زبانوں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے کئی اہم تجاویز پر غور وخوض کر رہی ہے۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں منعقدہ فارسی پینل کی میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ پچھلی سرکار نے فارسی اور عربی کو یو پی ایس سی کے امتحانات سے یہ کہہ کر نکال دیا کہ غیر ملکی زبانیں ہیں جب کہ ان زبانوں میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا ایک بہت بڑا سرمایہ موجود ہے۔ آج کی میٹنگ میں کئی اہم فیصلے لیے گئے اور کئی اہم تجاویز کو منظوری بھی دی گئی۔ اس میٹنگ کی صدارت پروفیسر چندر شیکھر نے کی۔ اس موقع پر انھوں نے ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ کے حوالے سے پینل کے تمام ارکان سے تبادلہ خیال کیا اور کہا کہ اس پروجیکٹ کو اس سال کے اخیر تک تکمیل دے دی جائے گی۔ میٹنگ میں خصوصی مدعو پروفیسر ماہ رخ مرزا (شیخ الجامعہ خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی و فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ) نے شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ میری یونیورسٹی کا واحد مقصد ان زبانوں کا فروغ ہے لیکن ڈراپ آؤٹ کا جو مسئلہ ہے وہ تشویش ناک ہے۔ انھوں نے حکومت ہند اور ریاستی حکومت سے ان زبانوں کے پڑھنے والوں کے لیے خصوصی وظیفے کی گزارش بھی کی۔

اس میٹنگ میں پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر طلحہ رضوی برق، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، پروفیسر حسن عباس، پروفیسر وجیہ الدین، پروفیسر عمر کمال الدین، پروفیسر قمر غفار، پروفیسر ماہ رخ مرزا کے علاوہ پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال، اسسٹنٹ ڈائرکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی، جناب امتیاز احمد (ریسرچ اسسٹنٹ)، جناب ساجد الحق (ٹیکنکل اسسٹنٹ) اور ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 جنوری 2018

مظفر حسین کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشست

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین کی اچانک موت نے ہمیں بے سہارا کر دیا۔ کونسل کا پورا خاندان سوگوار ہے اور ان کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔ اللہ انھیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔ وہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ نہایت ہی ایماندار، منکسر المزاج اور شریف النفس انسان تھے۔ یہ باتیں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے صدر دفتر میں کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین کے انتقال پر منعقدہ تعزیتی نشست میں کہیں۔ انھوں نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ وہ بہت مخلص اور جذباتی قسم کے انسان تھے۔ کونسل کے حوالے سے وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن صحت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کام کو آگے نہیں لے جا سکے۔ واضح رہے کہ پدم شری مظفر حسین کا 13 فروری 2018 کو ہیرا نندنی اسپتال ممبئی میں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے جسد خاکی کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ ممبئی کے کھروڈی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ وہ 78 سال کے تھے۔ ان کی پیدائش 1945 جھولیہ

(راجستھان) میں ہوئی تھی۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ اور ان کی بیٹی ہیں۔ ڈائرکٹر موصوف نے مزید کہا کہ ان کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا اور وہ بلند پائے کے صحافی بھی تھے۔ بالخصوص اردو کے فروغ کے لیے بہت سنجیدہ تھے۔ کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ نے اپنے تعزیتی پیغام میں ان کے سوانحی کوائف پیش کیے۔ اس موقع پر کونسل کے تمام افسران وارا کین موجود تھے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 فروری 2018

یوم جمہوریہ کے موقعے پر پرچم کشائی کی تقریب

نئی دہلی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند کے صدر دفتر میں یوم جمہوریہ کے موقع پر پرچم کشائی کی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں کونسل کے ذمے داران اور عملے نے شرکت کی۔ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر جناب کمل سنگھ نے پرچم کشائی کی۔ کونسل کے عملے نے ہندوستانی قومی ترانہ 'جن گن من' پیش کیا اور سبھی اسٹاف نے ترنگے کو سلامی دی۔ اس موقع پر جناب کمل سنگھ نے کہا کہ یوم جمہوریہ ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے، آج ہی کے دن ہندوستان کا دستور عمل میں آیا تھا۔ ہمیں اپنے ملک کے تئیں ہمیشہ قربانی کا جذبہ رکھنا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان نے ہندوستان کی جمہوری اقدار کی پاسداری میں اہم رول ادا کیا ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 جنوری 2018

طلباء میں مطالعے کا شوق اور تعلیمی ذوق و جستجو پیدا کرنے کی ضرورت

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے موبائل وین کا لاتور میں پرتپاک استقبال

لاتور: مرکزی حکومت کے وزارت انسانی وسائل کے زیر انصرام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے موبائل وین برائے کتب فروخت کا لاتور میں پرتپاک استقبال کیا گیا۔ لاتور میونسپل کونسل کے کارپوریٹر احمد خاں پٹھان، صحافی محمد مسلم کبیر، تنظیم اردو اساتذہ (فوقانوی) کے ضلع صدر سید نصرت قادری، ادارہ ادب اسلامی لاتور کے سید واجد پرچھنوی، شیخ عبدالستار سر، سماجی کارکن سراج پٹیل، محی الدین سر، صبیحہ باجی، محمد عظمٰن صہیب کبیر اور ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول کی طالبات نے کتب خرید کر اس موبائل وین کا استقبال کیا۔ لیبر کالونی علاقے کے اردو اسکولوں کے طلباء، اساتذہ اور شائقین اردو کی سہولت کے لیے پہلے مرحلے میں یہ کتب سے بھری وین دوپہر تک رکی۔ اور بعد ازاں تاج الدین بابا نگر، شاہ ولی محلہ اور مولانا آزاد اردو ہائی اسکول، تاج الدین بابا اسکول، الفلاح اردو ہائی اسکول کے طلبا و اساتذہ کی سہولت کے لیے وین لے جائی گئی۔ لاتور کی لیبر کالونی میں موبائل وین سے کتب کی فروخت سے قبل طلبا سے خطاب کرتے ہوئے صحافی محمد مسلم کبیر نے کہا کہ طلبا میں مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے لیے ان کی اپنی پسند اور آسان کتب دستیاب کرانی چاہیے اور یہ کام قومی کونسل نے کیا ہے جہاں سے نہایت مناسب قیمت پر کتب دستیاب ہوتی ہیں۔ اس موقعے پر سید نصرت قادری نے سائنسی و تحقیقی کتب کے مطالعے کے فوائد بتائے۔ سید واجد سر نے ادبی و اخلاقی کتب سے استفادے کے لیے کہا اور کارپوریٹر احمد خاں پٹھان نے بھی طلبا کو کتب خریدنے اور مطالعے سے رغبت پیدا کرنے کی نصیحت کی۔

روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی، 6 فروری 2018

سرسید کی عصری معنویت

نئی دہلی: سرسید احمد خاں کے دوسوسالہ جشن ولادت کے موقع پر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'سرسید کی عصری

معنویت' کے موضوع پر سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کا افتتاحی اجلاس منعقد ہوا۔ صدارتی خطبے میں پروفیسر طلعت احمد وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے سرسید احمد خاں کو ملک وقوم کا مجدد اور محسن قرار دیتے ہوئے کہا کہ ان کے نزدیک مسلم قوم اور ہندوستان دونوں کی نجات اور فلاح تعلیم اور اتحاد میں مضمر ہے۔ انجینئرنگ آڈیٹوریم، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں موجود سینکڑوں اساتذہ اور طلبہ کے درمیان کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ماہر سرسید پروفیسر افتخار عالم خاں (سابق ڈائریکٹر، سرسید اکیڈمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے سرسید کے نظریۂ دین و دنیا پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سرسید مذہب کو عقائد تک محدود رکھنا چاہتے تھے اور وہ اس خیال کے حامل تھے کہ امور دنیا سے مذہب کا تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سرسید کا ایک اہم ترین کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے مذہب کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور وہ اندھی تقلید کے قائل نہ تھے بلکہ تغیر پسندی اور سماجی ارتقا کے علمبردار تھے۔ اس موقعے پر فرانس کے معروف مستشرق اور اردو زبان کے مشہور اسکالر پروفیسر آلیس دزولیئر نے بحیثیت مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سرسید احمد خاں کا تصور زبان و ادب اور نظریۂ مذہب و تہذیب کی معنویت اور افادیت اکیسویں صدی میں اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا سرسید کے افکار و نظریات کا مطالعہ نئی تحقیق وتنقید کی روشنی میں ضروری ہوگیا ہے۔ اس موقعے پر ڈین فیکلٹی برائے انسانی علوم والسنہ پروفیسر وہاج الدین علوی نے سرسید کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر تعلیمی اور اصلاحی تحریک کو مذہب، تہذیب، تاریخ اور زبان و ادب کے شعبوں میں مؤثر ترین اجتہادی کارنامے سے تعبیر کیا۔ استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہپر رسول نے تمام بیرون اور اندرون ملک سے تشریف لائے مندوبین کا خیر مقدم کیا۔ افتتاحی اجلاس میں شعبۂ اردو کے سالانہ مجلّہ 'ارمغان' کے تازہ شمارے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ یہ شمارہ کلاسیکی شعری اصناف کی تحقیق وتنقید پر مشتمل ہے نیز اس موقعے پر شعبہ کے اساتذہ اور ریسرچ اسکالرز کی تازہ شائع شدہ کتابوں کا اجرا بھی ہوا۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت سیمینار کے کنوینر پروفیسر احمد محفوظ نے کرتے ہوئے کہا کہ یہ سیمینار اپنے موضوع، مقالہ نگار اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگی کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ پروگرام کا آغاز حافظ نوراللہ کی تلاوت کلام پاک اور اختتام پروفیسر شہزاد انجم کے کلمات تشکر پر ہوا۔

سیمینار کے دوسرے دن دو اجلاس منعقد کیے گئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی اور پروفیسر قدوس جاوید نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر الطاف احمد اعظمی نے 'سرسید اور جدید علم کلام'، پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے 'خطبات احمدیہ: ایک قابل قدر علمی کاوش'، پروفیسر خالد محمود نے 'سرسید کا سفرنامہ مسافران لندن'، پروفیسر مظہر مہدی نے 'اقامت گاہ، تربیت اور ذہن سازی: نوآبادیاتی علی گڑھ 1877-1907'، پروفیسر کوثر مظہری نے 'آثارالصنادید: کل اور آج' اور ڈاکٹر رشید اشرف خاں نے 'سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد' کے عنوان سے اپنے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر الطاف احمد اعظمی اور مظفر حسین سید نے کی۔ اس اجلاس میں پروفیسر آلیس دزولیئر نے 'سرسید کا نظریۂ تعلیم اور مولانا آزاد کی نگاہ'، پروفیسر قدوس جاوید نے 'سرسید کی عصری معنویت'، پروفیسر شہباز انجم نے 'سرسید بحیثیت صحافی'، پروفیسر شہزاد انجم نے 'سرسید کی تاریخ نگاری' اور ڈاکٹر سرورالہدیٰ نے 'سرسید کے تہذیبی تصورات' کے عنوان سے اپنے مقالات پیش کیے۔ دونوں اجلاس کی نظامت ڈاکٹر محمد آدم اور ڈاکٹر محمد مقیم نے کی۔

سرسید اپنی روشن خیالی، تعقل پسندی، سائنسی شعور اور مدبرانہ شخصیت کے سبب ہمارے لیے آج بھی آئیڈیل کا درجہ رکھتے ہیں۔ سرسید کی علی گڑھ تحریک صحیح معنوں میں ایک ہمہ جہت انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور آج بھی اس کی معنویت و افادیت مسلم ہے۔ ان خیالات کا اظہار سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کے اختتامی اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کیا۔ اس اجلاس میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ تمام تحریکات کا نقطۂ آغاز علی گڑھ سے جا ملتا ہے۔ اپنے زمانے کی منفی اقدار کو چیلنج کرنا سرسید کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ سرسید کے بعد ہندوستان میں جو بھی مثبت تبدیلی آئی وہ سب علی گڑھ تحریک کی دین ہے۔ انھوں نے مزید زور دیتے ہوئے کہا کہ سرسید نے قدیم مواد کے خمیر سے ایک نئے نظام کا ڈھانچہ تیار کیا۔ اختتامی اجلاس میں صدر شعبہ پروفیسر شہپر رسول نے استقبالیہ خطاب میں اس سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار میں پیش کیے گئے بیس مقالات کی علمی اور تحقیقی وتنقیدی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کے کنوینر پروفیسر احمد محفوظ نے سیمینار کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے تمام مقالات کو سرسید کے حوالے سے بامعنی اور سیمینار کے مقاصد سے ہم آہنگ قرار دیا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر خالد مبشر نے کی اور ڈاکٹر ندیم احمد نے اظہار تشکر کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' 3 فروری و روزنامہ 'خبریں' 4 و 5 فروری 2018

احسان دانش: حیات اور خدمات

لونی: نیشنل کونسل فار پروموشن آف اردو اور عالم دنیا ایجوکیشنل اینڈ کلچرل سوسائٹی کے زیر اہتمام احسان دانش: حیات

اور خدمات کے موضوع پر ہند بینکویٹ ہال پریم نگر لونی میں ایک سیمینار کا اہتمام کیا گیا، جس کے کنوینر شگفتہ حسین تھے۔ سیمینار کی صدارت آزاد ہیلپ فاؤنڈیشن انڈیا کے چیئرمین حاجی محمد صغیر نے کی۔ سیمینار کے مہمان خصوصی نگم پارشد لونی محمد صلاح الدین تھے۔ محمد صلاح الدین نے کہا کہ احسان دانش بہت بڑے شاعر تھے اور انھوں نے اردو زبان کے ارتقا میں بہت مدد کی ہے، جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ مولانا فہیم رضا نے کہا کہ اس طرح کے سیمینار مستقبل میں بھی کرنے کی ضرورت ہے، جس سے آگے آنے والی پیڑھی کو فائدہ پہنچے۔ انھوں نے آگے کہا

کہ تعلیم حاصل کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ سید ریاض الحسن جعفری صدر باغ سوسائٹی نے کہا کہ آنے والی پیڑھی کو تعلیم دینے کی اشد ضرورت ہے۔ سوسائٹی کے صدر شکرار حسین نے کہا کہ مستقبل میں سوسائٹی زیادہ سے زیادہ طلبہ کو اردو کی تعلیم دلانے کی کوششیں کرے گی۔ حاجی محمد صغیر، محمد صلاح الدین، مولانا عزیز الاشرفی، نفیس احمد ترکی، سید ریاض الحسن جعفری، محمد اعجاز انصاری، شیلا ناز، مولانا فہیم رضا اور شکرار حسین کے ہاتھوں احسان دانش کی حیات وخدمات پر مبنی میگزین کا اجرا کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جنوری 2018

اردو میں بچوں کا ادب

سہارنپور: اردو ادیب شاعر اور لوک فنکار حضرت امیر خسرو کے زمانے سے مسلسل ادب اطفال کے تئیں

اپنی ذمے داریاں بڑے جوش وخروش کے ساتھ ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ باتیں صحافی اور ادیب اسد رضا نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہیں۔ بیدار خواتین کی تنظیم 'پرچم' کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی اشتراک سے منعقدہ ایک روزہ قومی سیمنار بعنوان 'اردو میں بچوں کا ادب' میں انھوں نے کہا کہ بچے بھی اپنی تخیلاتی اختراع کی بدولت اپنے بڑوں کا تعاون کرتے چلے آرہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان بچوں کے اختراعی اظہار کو تلاش کریں۔ بچوں کی حوصلہ افزائی کی نت نئی راہیں ہموار کی جائیں اور ان گوہروں کو مزید آبدار بنایا جائے تاکہ بچوں کی زندگی اور زیادہ بامعنی اور بامقصد ہوسکے۔ مہمان خصوصی سائنس کی دنیا کے سابق مدیر معروف سائنس داں محمد خلیل (دہلی) نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہندوستان میں امیر خسرو سے لے کر شمیم احمد صدیقی تک بچوں کا ادب تحریر کررہے ہیں اور اردو ادب نے ہمیشہ بچوں کی صحیح رہنمائی کی ہے۔ ساتھ ہی ان میں آپسی بھائی چارہ، محبت پیار، احترام اور حب الوطنی کے پیغام کو فروغ دیا ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ معروف ادیب حقانی القاسمی نے اپنے پرمغز مقالے میں کہا کہ آج کا بچہ دنیا کو اپنی مٹھی میں دبائے ہم سے آگے کی دنیا دیکھ رہا ہے جسے سمجھانا اب اتنا آسان نہیں رہا۔ جتنا ہم سمجھتے رہے ہیں، بدلتے زمانے کے ساتھ بچوں کی نفسیات بھی گڑبڑائی ہیں اور ادیب کی دشواریاں بھی بڑھی ہیں۔ بچوں کا ادب تخلیق کرنا جو پہلے بھی آسان کام نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن اب جتنا دشوار ہوتا جارہا ہے اتنا دشوار بھی نہ تھا، اس لیے آج کے ان حالات میں بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ آج ادیب کی ذمہ داریاں پہلے سے زیادہ بڑھی ہیں۔ اتراکھنڈ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اور مشہور شاعر ڈاکٹر افضل منگلوری نے کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے جو عوام کے دلوں کو جوڑنے کا کام کرتی ہے۔ اردو میں بچوں کا ادب بچوں کی بہتر پرورش کرنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ پنجاب اردو اکادمی کے سابق سکریٹری نے کلیدی خطبے میں اردو میں بچوں کے ادب کی تاریخ اور عہد حاضر میں اس کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ عہد حاضر میں اردو میں معیاری بچوں کے ادب کی تخلیق نہیں ہورہی ہے جبکہ نصف صدی قبل اسماعیل میرٹھی، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، پیارے لعل، ڈاکٹر ذاکر حسین، منشی پریم چند، علامہ اقبال وغیرہ نے عمدہ ادب کی تخلیق کی ہے۔ پرچم کی سربراہ اور اس پروگرام کی کنوینر ڈاکٹر قدسیہ انجم نے نظامت کی اور مہمانان کا استقبال کیا۔ دیگر مقررین میں سینٹرل یونیورسٹی کشمیر کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر راشد عزیز، افسانہ نگار ترنم جہاں شبنم (دہلی)، شیخ نگینوی (بجنور)، ریسرچ اسکالر عبدالکریم (ہماچل پردیش)، ڈاکٹر شاہد زبیری، محمد موسیٰ (پنجاب) شامل تھے۔ عروج احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 30 جنوری 2018

اردو میں غیرافسانوی نثری اصناف

جلگاؤں: 7 جنوری 2018 "دنیا میں وقوع پذیر ہونے والی حقیقتوں اور انسانی زندگی کے معاملات اور رویوں کو قصہ کہانی کے برعکس جس نثر میں پیش کیا جاتا ہے اسے غیر افسانوی نثر کہا جاتا ہے۔ ایک عرصہ تک اردو میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر کا تصور نہیں تھا مگر اب مطلع صاف ہوگیا ہے اور غیر افسانوی نثری اصناف کا تصور واضح ہوکر مسلم ہوگیا ہے" مذکورہ خیالات کا اظہار معروف نقاد وسلیم شہزاد نے ادارہ شاہین لائبریری جلگاؤں اور قومی کونسل (نئی دہلی) کے اشتراک سے منعقدہ ادبی سیمینار بعنوان 'اردو میں غیر افسانوی نثری اصناف' کے موقعے پر اپنے صدارتی خطبے میں کیا۔ شاہین لائبریری نے اپنی سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے امسال بھی ایک ادبی سیمینار کا انعقاد اینگلو اردو ہائی اسکول (جلگاؤں) کے وسیع ہال میں کیا، تقریب کا آغاز رفیق پٹوے نے تلاوت کلام پاک سے کیا بعد ازاں یاسر عظیم نے نعت پیش کی۔ الحاج عبدالغفار ملک نے شمع فروزی کے ذریعہ سیمینار کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ مبین احمد نے مہمانان کا تعارف کرایا و گل پوشی کی رسم ادا کی۔ دو سیشن پر مشتمل اس سیمنار کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری نے 'تذکرہ نویسی'، ایم مبین نے 'سفر نامہ نگاری'، ڈاکٹر عظیم راہی نے 'مکتوب نگاری' تو اجلاس دوم میں خورشید حیات نے 'تبصرہ نویسی'، نور الحسنین نے 'خاکہ نگاری' اور معین الدین عثانی نے 'انشائیہ نگاری' جیسے موضوعات پر پرمغز مقالات پیش کیے۔ سید ذاکر حسین نے سوالات کے ذریعہ مکالمہ قائم کیا۔ شرکا نے بھی اس سیمنار کی ادبی فضا کو اپنے سوالات کے ذریعے سازگار بنایا۔ اس موقعے پر پروفیسر ڈاکٹر اقبال شاہ، ڈاکٹر ہارون، بشیر پروفیسر غیاث عثانی، ایڈوکیٹ ستیش پوار اور اشوک کوتوال بطور مہمانان خصوصی موجود تھے۔ مشتاق کریمی نے نظامت کے فرائض بحسن و خوبی انجام دیے جبکہ رسم شکریہ مقیم احمد نے ادا کی۔

پریس ریلیز: وسیم عقیل شاہ، 17 جنوری 2018

اردو زبان وادب میں خواتین کا کردار

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے 'اردو زبان و ادب میں خواتین کا کردار' کے موضوع پر ایک روزہ سیمنار کا انعقاد قصبہ بلاری کے محمد علی جوہر انٹر کالج میں کیا گیا۔ مہمان خصوصی ممبر اسمبلی محمد فہیم نے شمع روشن کرکے سیمنار کا آغاز کیا۔ سیمنار کی صدارت حاجی محمد عثمان نے کی و نظامت کے فرائض تمیم احمد نے انجام دیے۔ نہرو یوتھ کلب ہاتھی پور چتو کے زیر اہتمام منعقدہ سیمنار میں سینٹرل یونیورسٹی کشمیر کے پروفیسر ڈاکٹر راشد عزیز، جے این یو کے ڈاکٹر شفیع ایوب، مہاتما گاندھی میموریل ڈگری کالج کے ڈاکٹر عابد حسین حیدری، آزاد

ڈگری کالج کے ڈاکٹر شہزاد ترکی، ڈاکٹر معراج الحسن، مشرفی انجم، عظمیٰ، گلشن جہاں، ڈاکٹر ناصر، مولانا آل حسن وغیرہ نے مقالے پیش کیے۔ ممبر اسمبلی محمد فہیم نے کہا کہ اردو زبان کسی ایک مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ تمام مذاہب کی زبان ہے اردو ادب سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ کلب کے صدر محمد جان نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی ایڈیشن، 1 فروری 2018

اردو لوک گیت میں ہندوستانی سماج کی عکاسی

سنبھل: 23 دسمبر 2017 کو شعبۂ اردو ایم جی ایم پی جی کالج سنبھل کی طرف سے قومی کونسل برائے فروغ اردو

زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے ایک نیشنل سیمینار بعنوان 'اردو لوک گیت میں ہندوستانی سماج کی عکاسی' کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح مہمان خصوصی رسالہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مدیر پروفیسر صغیر افراہیم نے شمع روشن کر کے کیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت سابق ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق نے کی۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف نے سیمینار کے موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہندوستانی سماج کو سمجھنے کے لیے اردو لوک گیت کا مطالعہ ضروری ہے۔ کالج کے جوائنٹ سکریٹری جناب سنجے اگروال نے ہندوستان کے مختلف حصوں سے تشریف لائے اسکالرس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ گاؤں کے ماحول میں گائے جانے والے لوک گیتوں میں ہندوستانی سماج بخوبی نظر آتا ہے۔ انھوں نے متعدد گیتوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوک گیت ہماری مشترکہ تہذیب کے آئینہ دار ہیں۔

اس موقعے پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ نے کہا کہ لوک گیت اردو اور ہندی کی مشترکہ وراثت ہے۔ یہ گیت ہمارے سماج کے مختلف مسائل کے عکاس ہیں۔ یہ شادی بیاہ، تہوار، فصل، موسم، پیدائش، مذہبی وقومی رسومات کو اتنے پر لطف انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ہندوستانی سماج کی ایک خوبصورت تصویر ہمارے

سامنے آجاتی ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ لوک گیت ہندوستانی سماج میں رچے بسے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی فلموں کا بھی اردو لوک گیتوں سے خاص رشتہ رہا ہے۔ آج بھی ہماری رسومات اور تہواروں میں یہ لوک گیت رائج ہیں گویا ہندوستانی رسومات لوک گیتوں کے بغیر آج بھی نامکمل سمجھی جاتی ہیں۔ افتتاحی اجلاس کے صدر سابق ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق نے سیمینار کے موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کی نشو ونما میں لوک گیتوں کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ آخر میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر عابد حسین حیدری نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اس سیمینار کے انعقاد کا مقصد یہ ہے کہ ہماری نئی نسل اپنے قومی ورثہ سے واقفیت حاصل کرتی رہے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شہزاد احمد نے کی۔

سیمینار کے پہلے تکنیکی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر ثوبان سعید نے کی۔ اس اجلاس میں گلشن جہاں (سنبھل)، یوسف رامپوری (دہلی)، ارشاد سیانوی (دہلی) ڈاکٹر عارفہ مسعود (مرادآباد) اور ڈاکٹر قمر عالم (علی گڑھ) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر رضاء الرحمٰن نے کی۔ دوسرا اجلاس ڈاکٹر کشور جہاں زیدی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں عزہ معین (دہلی) فیضان سعید (رامپور) ڈاکٹر شیخ نگینوی (نگینہ بجنور) ڈاکٹر فرقان سنبھلی (علی گڑھ) اور ڈاکٹر ریاض احمد (سنبھل) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس سیشن کی نظامت ڈاکٹر شہزاد احمد نے کی۔ اجلاس 1 بجے سیمینار ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاد ڈاکٹر قمر عالم نے کی۔ جس میں ڈاکٹر ثوبان سعید (لکھنؤ) صبا ناز (سنبھل) ثوبیہ طارق (سنبھل) پروفیسر شریف احمد قریشی (رامپور) شہپر شریف (رامپور) نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس سیشن کی نظامت عزہ معین نے کی۔ دوسرا متوازی اجلاس اردو بھون میں ڈاکٹر فرقان سنبھلی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر کشور جہاں زیدی (سنبھل) شفیق الرحمٰن برکاتی (سرسی) پروفیسر ممتاز عرشی (رامپور) اور ڈاکٹر علی عباس (چنڈی گڑھ) نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت گلشن جہاں نے کی۔

ظہرانہ کے بعد کانفرنس ہال میں ایک لوک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جو دیر رات تک چلتا رہا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر شریف احمد قریشی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر ممتاز عرشی سابق ریجنل ڈائرکٹر ہائر ایجوکیشن حکومت اترپردیش نے شرکت کی۔ جبکہ مہمان اعزازی کی حیثیت سے پروفیسر محمد حسین جعفری (سابق ڈین یونانی میڈیکل کالج جے پور راجستھان) موجود تھے۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر عابد حسین حیدر، پرنسپل/کنوینر سیمینار، 10 جنوری 2018

شاہ مبارک آبرو: شخصیت وفن

گوالیار: 28 جنوری 2018 کو آدرش سماج سیوا شکشا سمیتی اور انجمن ترقی اردو گوالیار کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے یک روزہ ریاستی سیمینار بعنوان 'شاہ مبارک آبرو: شخصیت وفن' کا انعقاد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کے صدر نیاز محمد (صدر مدھیہ پردیش اقلیتی کمیشن بھوپال) اور مہمان خصوصی محترمہ پرمیلا واجپئی (رکن نسوانی کمیشن ایم پی) نیز ڈاکٹر امرجیت بھلا (رکن مدھیہ پردیش اقلیتی کمیشن بھوپال) تھے۔ دوسرے اجلاس کے صدر پروفیسر خالد محمود

(سابق صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی نئی دہلی) رہے۔ تیسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر سجاد حسین جعفری (گورنمنٹ گرلس کالج، کھرگون) نے کی۔ مقامی اور مختلف مقامات کے مندوبین میں ضیا فاروقی بھوپال، ڈاکٹر قمر گوالیاری، وقار صدیقی گوالیار، ڈاکٹر سیفی سرونجی سرونج، ڈاکٹر وسیم انور ساگر، ڈاکٹر نصرت سلطانہ گوالیار، ڈاکٹر محمد صادق سیہور، شبانہ نکہت انصاری گوالیار وغیرہ نے مختلف عنوانات پر مقالے پیش کیے۔

سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری (صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ کے آر جی کالج گوالیار) نے استقبالیہ خطبہ نیز نظامت کے فرائض انجام دیے اور آدرش سماج سیوا شکشا سمیتی کے ڈائرکٹر جناب پروین پوار نے اظہار تشکر ادا کیا۔

پریس ریلیز: وسیم افتخار انصاری، گوالیار، 2 فروری 2018

اسلامی مخطوطات کی اشاعت میں 'دائرۃ المعارف العثمانیہ' کی خدمات

حیدرآباد: سدرہ ویمنس ویلفیئر سوسائٹی حیدرآباد کے زیراہتمام منعقدہ دو روزہ بین الاقوامی سمینار بعنوان 'خدمات دائرۃ الملعارف العثمانیه فی تحقیق المخطوطات العربیة المنادرۃ' بزبان عربی سمینار کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا خلیل احمد ندوی نظامی سابق ماہر کتابت محکمہ آثار قدیمہ، حکومت ہند و صدر صمدانی گروپ آف انسٹی ٹیوٹس نے کہا کہ ساتویں صدی ہجری میں جب عالم اسلام تاتاریوں کے حملوں کی زد میں انتشار کا شکار ہوا تو بیشتر اہل علم وفن نے ہندوستان کا رخ کیا۔ نظام دکن نے ان ماہرین کو اپنے پاس بلا کر ہر طرح کی سہولت دی۔ انیسویں صدی عیسوی میں عالم عرب جب مغرب کے توسیع پسندانہ عزائم کا شکار ہوا تو نادر و نایاب عربی مخطوطات کا بیشتر حصہ حکومت حیدرآباد نے اپنے پاس جمع کیا۔ ان مخطوطات کو زیور طباعت سے آراستہ کرکے عوام تک پہنچانے کے لیے دائرۃ المعارف قائم ہوا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے منعقدہ انٹرنیشنل سمینار سے خطاب میں پروفیسر سید جہانگیر صدر شعبہ عربی انفلو یونیورسٹی وبانی ومہتمم جامعۃ الحرمین، حیدرآباد نے پڑھے گئے مقالوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دائرۃ المعارف العثمانیہ عربی کے احیاء کا ہندوستان میں قدیم ادارہ ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب ممالک کے محققین بھی دائرہ کے مخطوطات ومطبوعات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ عربی اسلامی علم کی تحقیق ونشر واشاعت میں دائرۃ المعارف کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ مولانا پروفیسر عبدالمجید نظامی سابق صدر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی و سابق ڈائرکٹر دائرۃ المعارف العثمانیہ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اندرون و بیرون ملک موجودہ مراکز علمیہ میں دائرہ کے مطبوعات کا بہت چرچا ہے۔ اسلامی علوم وفنون سے متعلق مخطوطات جن میں تفسیر، اصول حدیث، رجال، اسانید، سیر وتراجم، مناقب، فقہ، تصوف، کلام، عقائد، تاریخ، ادب، فقہ، عربیہ، معانی، فلسفہ، نحو، ریاضیات، طب، انتساب اور پانی وغیرہ سے متعلق مخطوطات کا قابل قدر مجموعہ دائرہ میں موجود ہے۔ عربی ورثہ کی حفاظت میں دائرۃ المعارف کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ یمن کے ڈاکٹر محمد الخلیدی نے بھی پرمغز گفتگو کی۔

جمعیۃ ماجدامارت نے عالمی سطح پر پائے جانے والے عربی اسلامی مخطوطات کے نسخوں یا تصاویر کے ذریعے اپنے پاس پانچ لاکھ کی تعداد میں مخطوطات جمع کیے ہیں۔ اس میں بیشتر حصہ ہندوستان کا ہے۔ ڈاکٹر علی داؤد سلیمان (عراق) نے حدیث کے مخطوطات کی تحقیق ونشر میں دائرۃ المعارف کی خدمات پر بات کرتے ہوئے کہا کہ حدیث سے متعلق بے شمار مخطوطات یہاں موجود ہیں اور بہت سے شائع بھی ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر عادل طٰہٰ لطیف (عراق) نے کہا کہ اسلامی تہذیب و تمدن، سماجی اصلاحات، انسان کی فکری اٹھان پر مشتمل عربی مخطوطات کا دائرۃ المعارف میں جو کام ہوا وہ عالم عرب اسلام کے ساتھ تمام بنی نوع انسان کے لیے مفید ہے۔

ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی کنوینر نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ مولانا محمد انواراللہ خان نظامی نائب صدر فانوس آرگنائزیشن نے شرکا میں اسناد تقسیم کیں۔ مولانا محمد انور الدین صدیقی کوآرڈینیٹر انٹرنیشنل سمینار نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 12 دسمبر 2018

عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری

لکھنؤ: خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی، فارسی یونیورسٹی میں 'عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری' کے موضوع پر اشرف سوشل ویلفیئر سوسائٹی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے سمینار منعقد ہوا۔ سمینار کا افتتاح الہ آباد یونیورسٹی سے تشریف لائے معروف ادیب ونقاد پروفیسر علی احمد فاطمی نے کیا۔ پروفیسر موصوف نے عصمت چغتائی کے فکر وفن پر گفتگو کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک اور اردو افسانے پر روشنی ڈالی اور عصمت چغتائی کے افسانوں کی اہمیت کو واضح کیا اور اردو افسانے کے زریں عہد کی ممتاز افسانہ نگار سے متعلق سمینار کے انعقاد پر مسرت کا اظہار کیا۔ پروفیسر سید شفیق احمد اشرفی نے سمینار کے مقاصد اور غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے عصمت چغتائی کے فن پر بھی روشنی ڈالی اور کہا کہ عصمت چغتائی نے اردو افسانوں اور ناولوں میں جرأت اور بے باکی کی ایک نئی مثال قائم کی نیز انھوں نے عصمت کے افسانوں اور ناولوں کا از سر نو جائزہ لینے پر زور دیا۔ ڈاکٹر ثوبان سعید نے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خطبے میں عصمت چغتائی کے امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے فن، زبان اور ان کے افسانوں کے موضوعات پر نہایت اہم خیالات پیش کیے اور عصمت چغتائی کے ادبی مقام کو واضح کیا۔ اس کے علاوہ جن مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں معروف صحافی عبیداللہ ناصر، ڈاکٹر ثوبان سعید، ڈاکٹر وصی احمد اعظم انصاری، ڈاکٹر عبدالحق، رضوان احمد خان، سید سبط حسن نقوی، ڈاکٹر عبدالرب، ندیم عالم، وحید نواز کے نام قابل ذکر ہیں۔ سمینار کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد اکمل شاداب نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ ڈاکٹر ثوبان سعید کے کلمات تشکر کے ساتھ سمینار اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی 31 جنوری 2018

مشرقی پنجاب کا ادبی منظرنامہ

مالیرکوٹلہ: آلمائی انٹرنیشنل سوسائٹی (رجسٹرڈ) مالیرکوٹلہ کی جانب سے دوروزہ قومی سمینار بعنوان 'مشرقی پنجاب کا ادبی منظرنامہ' (اکیسویں صدی کے حوالے سے) 3-4 فروری 2018 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے بمقام آبان پبلک اسکول، آبان روڈ، بیرون مانا پھاٹک، مالیرکوٹلہ میں منعقد کیا گیا۔ 3 فروری کے پہلے اجلاس کی صدارت معروف شاعر ونقاد جناب ڈاکٹر محمد رفیع چیئرمین ایجوکیشنل کمیٹی پنجاب وقف بورڈ نے فرمائی۔ مہمان خصوصی چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ صدر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور ڈاکٹر مشتاق احمد وانی شعبۂ اردو، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوری اور ڈاکٹر مجاہدالاسلام شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، لکھنؤ مہمانانِ ذی وقار تھے۔ بزرگ شاعر سردار پنچھی بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ اس افتتاحی اجلاس کی نظامت قلم کار سالک جمیل براڑ نے کی۔ سالک جمیل براڑ نے ہی تمام مہمانان گرامی کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ مہمانِ ذی وقار ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مشرقی پنجاب کا حالیہ ادبی منظرنامہ بہت شاندار ہے۔ ڈاکٹر مجاہدالاسلام نے کہا کہ ہمیں اپنے بچوں کو اردو زبان پڑھانی چاہیے تبھی ہم اپنا حق ادا کرسکیں گے۔ 4 فروری بروز اتوار کو سمینار کا تیسرا اجلاس شروع ہوا جس کے صدور میں محمد بشیر مالیرکوٹلوی، رشید ملک، مکرم سیفی اور مہمان خصوصی میں سردار پنچھی، وشال کھلر، شمشاد شامل اور غلام نبی کمار تشریف فرما تھے۔ اس اجلاس کی نظامت افسانہ کلب کے جنرل سکریٹری ناصر آزاد نے کی اور ڈاکٹر سلیم زبیری، ڈاکٹر محمد مستمر، مجاہدالاسلام، ڈاکٹر فیض قاضی آبادی، ارشاد سیانوی، مشتاق احمد وانی، یوسف رامپوری اور محترمہ تبسم بانو نے مقالات پیش کیے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 7 فروری 2018

اردو اور تعلیم سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

وزیر اعظم مودی کی کتاب 'ایگزام واریئرس' کا اجرا

نئی دھلی: وزیر اعظم نریندر مودی کی طلبہ کے لیے لکھی گئی کتاب 'ایگزام واریئرس' ریلیز ہوگئی ہے۔ اس کا اجرا

سنیچر کے روز وزیر خارجہ سشما سوراج اور انسانی وسائل کی ترقی کے وزیر پرکاش جاوڈیکر نے کیا۔ وزیر اعظم مودی کی یہ کل ملا کر پانچویں اور امتحان سے جڑے ذہنی تناؤ کو ختم کرنے کے لیے پہلی کتاب ہے۔ دو سو آٹھ صفحات کی اس کتاب میں نہ صرف سادہ اور عملی تجاویز دی گئی ہیں، بلکہ وزیر اعظم نے خود اپنے تجربات کے ذریعے بھی بچوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ امتحان کی گھڑی سے کیسے نمٹا جائے۔ نہ صرف اسکولی امتحان بلکہ یہ کتاب تو زندگی کے امتحان کے لیے بھی مفید ثابت ہوگی۔ پوری کتاب کا فوکس بچوں کو امتحان کے بھوت سے نمٹنے کے لیے تیار رہنے اور ذہنی تناؤ سے نجات حاصل کرنے کے طریقوں پر ہے۔ پچیس منتروں والی اس کتاب میں ایک جگہ مودی میزائل مین کلام کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں "ایک امتحان کا نتیجہ کسی انسان کو جانچ نہیں سکتا۔ اے پی جے عبدالکلام فائٹر پائلٹ بننا چاہتے تھے لیکن موقع چوک گئے۔ مودی آگے کہتے ہیں کہ کلام امتحان میں ناکام ہونے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھے نہیں بلکہ وہ عظیم سائنس داں بن گئے جنھیں ہم ابھی تک یاد کرتے ہیں۔ چکنے کاغذ والی اس رنگین کتاب میں صرف ہدایت اور پیغام ہیں ہے، بلکہ یہ کتاب بات چیت کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کئی طرح کی مشق اور ان کے لیے بھی جگہ چھوڑی گئی ہے جو اسکولی بچوں کے لیے نہ صرف دلچسپ ہوگی بلکہ انھیں انگیج بھی کرے گی۔ مودی کے تمام دوسرے کاموں کی طرح اس میں ڈیجیٹل کا جادو بھی شامل ہے۔ بچے ہوں یا ان کے والدین یا پھر اساتذہ اس سے ہر شخص اپنے من کی بات کو فون کے ذریعے وزیر اعظم کے ساتھ ساجھا کر سکتا ہے۔ اس میں کسی اچھی ورک بک کی طرح بچے رنگ بھر سکتے ہیں اور موبائل سے کیو آر کوڈ کو اسکین کر کے اپنی تصویر وزیر اعظم کو بھیج سکتے ہیں۔ ایگزام واریئرس کے عنوان سے یہ کتاب پینگوئن اور بلیو کرافٹ فاؤنڈیشن نے شائع کی ہے۔ فی الحال یہ کتاب انگریزی میں ہے، لیکن جلد ہی اس کتاب کے کئی زبانوں میں آنے کا امکان ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 4 فروری 2018

جشن بھارت

نئی دھلی: ثقافتی تنظیم انڈیا ہیریٹیج سینٹر کے زیر اہتمام 'جشن بھارت' عنوان سے دو روزہ جشن کا انعقاد کیا گیا

جس کے پہلے مرحلے میں سابق صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی نے ایک اہم کتاب کی رونمائی کی جبکہ دوسرے مرحلے میں وطن عزیز کی خدمات میں سرگرم عمل شخصیات کو اعزاز و اکرام سے سرفراز کیا گیا اور کئی اہم کتابوں کی رونمائی دیگر معززین کے دست مبارک سے عمل میں لائی گئی۔ اس دوران استاد شعرا نے کلام پیش کیا۔ یوم جمہوریت کی مناسبت سے انڈیا ہیریٹیج سینٹر کے زیر اہتمام منعقد اس جشن کا افتتاح صدر جمہوریہ ہند کے سابق فنانس سکریٹری اشکول لواسہ کی فوٹو گرافی پر منحصر کتاب لونگ نیچر کو پیش کر کے کیا گیا۔ سابق صدر جمہوریہ پرنب مکھرجی نے جشن بھارت کے انعقاد کو وقت کی ضرورت بتایا۔ ڈاکٹر ہرش وردھن نے بھی ملک کے مختلف حصوں پر مبنی اس کتاب کی پذیرائی کی۔ دوسرے مرحلے میں فخر ہند شاعرہ پروفیسر مینو بخشی کی صدارت میں منعقد ہونے والے اس جشن میں مہمان معظم کے طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر میجر جنرل ضمیر الدین شاہ نے حصہ لیا۔ خیر مقدمی کلمات سینٹر کے سرپرست پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے پیش کیے۔ افتتاحی تقریر کے لیے کنیڈا سے آئے عالمی شہرت یافتہ ادیب ڈاکٹر تقی عابدی نے جنگ آزادی میں شعرائے کرام کے حوالے سے تقریر کی اور کہا کہ اردو زبان ایک انقلابی زبان ہے۔ اس دوران انھوں نے کئی شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ جنگ آزادی میں ان کی خدمات کو کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ انڈیا ہیریٹیج سینٹر کی جانب سے اس موقعے پر ممتاز آرٹسٹ کرن سونی گپتا، عالمی شہرت یافتہ شاعرہ نینا کمار، سر گنگا رام اسپتال کے چیئرمین ڈاکٹر ڈی ایس رانا، شاعر گوپال داس نیرج، سماجی کارکن دیول ماہیشوری، ڈی آئی کے شراف، ڈاکٹر دواکر گوئل، ڈی آئی جی لوو کمار کو فخر ہند اعزاز سے سرفراز کیا گیا جس کے بعد ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب کلام سعید کی رونمائی بھی ہوئی۔ ناظم محفل سلیم امروہوی نے وطن پرستی پر ایک نظم پیش کی جس کے بعد اظہر عنایتی رامپوری، نینا کمار، ڈاکٹر حنیف ترین، ڈاکٹر دواکر گوئل، استاد رضا سرسوی، پروفیسر مینو بخشی، ڈی آئی جی جمال واجد، اشیع رضا زیدی، چیمبر نقوی وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔ استقبال حیدر کمال و سابق انکم ٹیکس کمشنر چودھری نجیب اشرف نے کیا جبکہ شکریہ سینٹر کے نائب صدر اشیع رضا زیدی نے ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 جنوری 2018

بنگلہ اور اردو میڈیا کے درمیان روابط

نئی دہلی: بنگلہ دیش کے ہائی کمشنر سید معظم علی نے بنگلہ اور اردو میڈیا کے درمیان روابط کو بڑھانے اور ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ایک میکانزم بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ پریس کلب آف انڈیا کے زیر اہتمام اردو میڈیا کے ساتھ غیر رسمی ملاقات میں انھوں نے ہند-بنگلہ دیش تعلقات کے حوالے سے کہا کہ مختلف میدانوں میں دو طرفہ تعلقات کے لیے یہ سب سے بہترین دور ہے۔

بنگلہ دیش ہائی کمیشن کی طرف سے پہلی مرتبہ اردو میڈیا کے ساتھ روابط کی یہ پہلی سنجیدہ کوشش تھی جس میں سرکردہ اردو اخبارات اور نیوز پورٹل سے وابستہ سینئر صحافی، مدیران وغیرہ موجود تھے۔ پریس کلب انتظامی کمیٹی کے ممبر اور سینئر صحافی چوتھی دنیا کے 'اے یو آصف' نے مختصر تعارفی کلمات پیش کیے اور میٹنگ کو مفید و ثمر آور بنانے کی ضرورت پر زور دیا۔ پریس کلب آف انڈیا کے صدر گوتم لہری نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اردو میڈیا پریس کلب میں اپنی بھرپور نمائندگی اور موجودگی کا احساس کرائے۔ اسے پورا موقع فراہم کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیا کو اپنی طاقت بڑھانی چاہیے۔ یہ میٹنگ اس احساس کا مظہر ہے۔ پریس کلب کے سابق جنرل سکریٹری ندیم کاظمی کے علاوہ موجودہ جنرل سکریٹری ونے کمار وغیرہ موجود تھے، جبکہ سید معظم علی کے علاوہ ڈپٹی ہائی کمشنر و سفارت خانہ کے دیگر اہلکار بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 18 جنوری 2018

سرسید احمد خاں اور ان کی بصیرت

علی گڑھ: سرسید احمد خاں نے محسوس کرلیا تھا کہ کامیابی کے لیے جدید تعلیم ہی شاہ کلید ہے۔ آج سرسید

کے انتقال کے 120 سال کے بعد بھی ان کی فکر کو زندہ کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے مسلم یونیورسٹی کے اسٹریچی ہال میں اردو اکیڈمی کی جانب سے منعقدہ سہ روزہ قومی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہمیں قومی یکجہتی اور باہمی اتحاد پر زور دینا ہوگا، سرسید نے منافرت و منافقت کے ماحول میں بدگمانی کی خلیج کو پر کرنے کے لیے فکری اور عملی دونوں سطح پر روایت سے ہٹ کر قدم بڑھائے اور 1857 کی یلغار سے ہندوستانیوں خاص کر مسلمانوں کو بچانے میں پوری زندگی لگا دی۔ پروفیسر ارتضی کریم نے کہا کہ سرسید نے جس طرح لیک سے الگ ہٹ کر رویہ اپنایا اور فکری تجدید کا کام کیا آج پھر اسی فکری انقلاب کی ضرورت ہے۔ انھوں نے سوال اٹھایا کہ آج کوئی سرسید ہے جو صورت حال کی نزاکت کو سمجھے اور بدگمانیوں کو دور کرے؟ پروفیسر ارتضی کریم نے مزید کہا کہ این سی پی یو ایل 17 اکتوبر 2018 کو سرسید پر بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کر رہی ہے اور کونسل کی جانب سے سرسید کے سبھی خطبات و نگارشات کو یکجا کر کے شائع کیا جا رہا ہے جو معروف ادیب وصحافی ڈاکٹر مظفر حسین سید مرتب کر رہے ہیں جو کئی جلدوں پر مشتمل ہوگا۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور طلباء قدیم سے اپیل کی کہ وہ اس اہم کام میں تعاون کریں۔ صدر جلسہ وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ ہم بانی درسگاہ سرسید کے مشن اور ان کے پیغام کو آگے بڑھانے کے تئیں پرعزم ہیں، ہندوستان میں جدید تعلیم کی توسیع میں اے ایم یو کا شاندار رول رہا ہے۔ وائس چانسلر نے کہا کہ انھوں نے سرسید انڈومنٹ فنڈ قائم کیا ہے تاکہ تعلیمی بیداری اور سرسید کے مشن کا پیغام عام کرنے میں معاون ہو۔ پروفیسر تبسم شہاب نے کہا کہ سرسید کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں جو نظروں سے اوجھل ہیں انھیں سامنے لانا ہوگا۔ سرسید احمد خاں اور ان کی بصیرت' کے موضوع پر کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف اسکالر پروفیسر شان محمد نے کہا کہ کالج کے قیام کے لیے جب سرسید نے اشتہار دیا تو انھیں 1100 خطوط موصول ہوئے تھے جسے انھوں نے ایک ایک کر کے پڑھا، اس میں علی گڑھ خطہ کے راجہ، نوابین و تعلقہ داروں نے علی گڑھ میں ہی کالج کے قیام میں سب سے زیادہ دلچسپی دکھائی۔ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر راحت ابرار نے بتایا کہ ایم اے او کالج کا سنگ بنیاد 8 جنوری 1877 کو اس وقت کے وائسرائے لارڈ لیٹن نے ایک شاندار تقریب میں رکھا تھا اور نواب لطف علی خاں آصف چھتاری اور راجہ باقر علی خاں آف پنڈراول نے لارڈ لٹن کو توصیفی سند پیش کی تھی یہ اسٹریچی ہال اس کی یادگار ہے۔ پروگرام کے اختتام پر اردو اکادمی کے ڈاکٹر زبیر شاداب خاں نے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شارق عقیل نے ادا کیے۔

سیمنار کے دوسرے دن معروف ادیب وصحافی ڈاکٹر مظفر حسین سید نے کہا کہ سرسید ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی فکر کو آج اسی نظریہ سے آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج تک کسی نے سرسید کو ایک افسانہ نگار کے طور پر تسلیم نہیں کیا جبکہ ان کے انشائیوں میں متعدد جگہوں پر افسانوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ سرسید کی افسانوی نثر پر ایک جامع کتاب مرتب ہونی چاہیے۔ دوسرے سیشن کی صدارت کرتے ہوئے معروف افسانہ نگار پروفیسر طارق چھتاری نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سرسید کا بڑا وژن تھا کہ ہم اپنی روایات، تہذیب اور نظریات جو مسلسل ختم ہوتے جا رہے ہیں ان کی بازیافت کریں سیمنار میں جن اہم شخصیات نے اپنے مقالے پیش کیے ان میں پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر غضنفر علی، پروفیسر اسربیگ، پروفیسر اے آر فتیحی، پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر مظہر مہدی، ڈاکٹر گلفشاں خان، زبیر شاداب خان، پروفیسر شکیل احمد صمدانی کے نام شامل ہیں۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت اردو اکیڈمی مسلم یونیورسٹی کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر قاضی افضال حسین نے کی جبکہ تیسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر افتخار عالم اور چوتھے اجلاس کی صدارت پروفیسر فرحت اللہ خاں نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مشتاق صدف نے انجام دیے جبکہ شکریہ زبیر شاداب نے ادا کیا۔

سرسید کے مشن اور وژن کی بازیافت دور حاضر کی اہم ضرورت ہے۔ وہ اس بات کی متقاضی ہے کہ سرسید کی بصیرت کو عام کیا جائے۔ ان خیالات کا اظہار مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے وائس چانسلر پدم شری پروفیسر اختر الواسع

نے سرسید اکادمی میں منعقدہ سہ روزہ سیمینار کے تیسرے روز اختتامی اجلاس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے کیا۔ انھوں نے کہا کہ 19 ویں صدی میں سرسید اور ان کے رفقا نے 20 ویں صدی کی آنے والی نسلوں کے مستقبل کی فکر کی تھی اور ان کے لیے ایک لائحہ عمل ترتیب دیا جس کے نتیجے میں مدرسۃ العلوم، اے ایم او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وجود میں آئی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام ہوا، سائنٹفک سوسائٹی بنائی گئی، تہذیب الاخلاق اور علی گڑھ گزٹ جاری کیے گئے جس میں ہر موضوع پر قلم اٹھایا گیا، آج ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ 20 ویں صدی تو گزر چکی اور ہم 21 ویں صدی میں داخل ہوگئے ہیں تو آنے والی نسلوں کے لیے کون سا لائحہ عمل ترتیب دیں تاکہ ان کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کو دور کیا جاسکے۔ یہی ان کے مشن و وژن کے لیے پیش قدمی ہوگی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ڈائرکٹر سید رضا حیدر نے کہا کہ 19 ویں صدی کے بڑے مفکرین کا جب بھی ذکر ہوگا، ان میں تین نام سب سے نمایاں ہوں گے پہلے سرسید احمد خاں دوسرے علامہ اقبال اور تیسرے مولانا ابوالکلام آزاد۔ پروفیسر ایمریٹس فرحت اللہ خاں نے کہا کہ سرسید احمد خاں نے 150 سال قبل محسوس کرلیا تھا کہ تعلیم کے بغیر کسی قسم کی ترقی ممکن نہیں ہے۔ سیکولرازم ان کے تعلیمی مشن کا حصہ تھا، عصر حاضر میں ان کی معنویت مزید بڑھ گئی ہے۔ صدر جلسہ پروفیسر محمد زاہد نے منتظمین کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے اس سیمینار میں جن موضوعات کا احاطہ کیا ہے وہ سرسید شناسی میں اہم کردار ادا کرے گا اور سرسید کے مشن کو قومی سطح پر متعارف کرانے میں معاون ثابت ہوگا۔ اردو اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر راحت ابرار نے مہمانانِ گرامی و مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے تفصیلی رپورٹ پیش کی جس میں سیمینار میں پیش کیے گئے جملہ مقالہ جات کا تجزیہ شامل تھا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر مشتاق صدف نے انجام دیے اور اردو اکادمی کے ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر زبیر شاداب خان نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 تا 11 جنوری 2018

فارسی سرٹیفکیٹ کورس کے افتتاحی اجلاس کا انعقاد

نئی دھلی: ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی میں فارسی کلاسوں کے جدید سیشن کا افتتاحی اجلاس عمل میں آیا۔ پروگرام کا آغاز علی رضا نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ تقریب میں مرکز تحقیقات فارسی کے ڈائرکٹر احسان اللہ شکر اللہی اور ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی دہگاہی موجود

تھے۔ آقائی شکر اللہی نے طلبہ کا خیر مقدم کیا اور طلبہ کو عصر حاضر میں فارسی زبان کی اہمیت سے آشنا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں فارسی زبان کے اثرات کو مختلف شعبوں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس موقعے پر ایران کلچر ہاؤس کے کلچرل کاؤنسلر ڈاکٹر علی دہگاہی نے کہا کہ ہند و ایران کا رشتہ صدیوں پرانا ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان آٹھ سو سال تک حکومت کی سرکاری زبان رہی ہے، یہی سبب ہے کہ ہندوستانی تہذیب و ثقافت میں فارسی زبان کے اثرات آج بھی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ فارسی زبان شیریں زبان ہے جس کا سیکھنا آسان ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی تاریخ کو جاننے کے لیے فارسی زبان کا سیکھنا ضروری ہے کیونکہ تاریخ کے اصل منابع فارسی زبان میں موجود ہیں۔ اس موقعے پر فارسی کلاسوں کے استاد مہدی باقر اور ڈاکٹر عزیز مہدی نے بھی فارسی زبان کے تعلق سے اظہار خیال فرمایا۔ اس موقعے پر گزشتہ سیشن میں سطح اول اور سطح دوم کے کامیاب طلبہ کو ڈاکٹر علی دہگاہی اور آقائی شکر اللہی کے ہاتھوں سرٹیفکٹ تقسیم کیے گئے۔ مہدی باقر نے ترجمے کے فرائض انجام دیے جبکہ پروگرام کی نظامت علی ظہیر نقوی نے کی۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں طلبہ موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 جنوری 2018

ڈاکٹر ہاشم قدوائی کی علمی و ادبی خدمات

نئی دھلی: سابق ممبر پارلیمنٹ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صرف ایک بے باک سیاست داں ہی نہیں بلکہ ایک اچھے استاد، مفکر، مصنف، محقق، دانشور، ملی رہنما اور جنگ آزادی کے مجاہد بھی تھے اور ان کے نظریات اور خیالات کو آگے بڑھانے کی آج اشد ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے 'ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کی علمی و ادبی خدمات' کے موضوع پر منعقد تیرہویں محفوظ الرحمن یادگار لکچر کے دوران کیا۔ سابق آئی اے ایس افسر اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر خواجہ محمد شاہد نے کلیدی لکچر دیتے ہوئے مرحوم قدوائی صاحب کے ساتھ اپنے تعلقات کی روشنی میں ان کی متعدد خوبیوں کا ذکر کیا۔ خواجہ شاہد نے کہا کہ ڈاکٹر قدوائی کی کتابیں بیسویں صدی کی اہم دستاویز ہیں۔ خواہ ان کی سوانح حیات ہو یا پھر سردار پٹیل کے خطوط پر ان کے تبصرے یا پھر اخبارات کے نام لکھے ان کے خطوط، یہ سب ملک کے سیاسی اور تعلیمی ڈھانچے کو سمجھنے میں کافی معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی نے بھی اپنی یادوں کے حوالے سے بتایا کہ مرحوم قدوائی صاحب کا امتیازی پہلو طلبہ سے محبت تھا۔ دوسری نمایاں صفت ملت سے ان کا تعلق تھا۔ ان کی اصل وفاداری اسلام اور مسلمانوں سے تھی اور آزادی کے بعد کے سیاسی حالات میں انھوں نے جس طرح بے باکی کے ساتھ مسلمانوں کے کاز کی حمایت کی اس کے لیے بڑی اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے۔ پروفیسر سلیم قدوائی نے اپنے والد کی ذاتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ مرحوم کی زندگی نہایت سادہ تھی، ان میں وضع داری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، وہ معمولات کے بہت پابند تھے، وہ بے کار نہیں بیٹھا کرتے تھے۔ یہ چیزیں آج کے دور میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر معین الدین جینابڑے کے علاوہ اردو بک ریویو کے ایڈیٹر محمد عارف اقبال اور دہلی یونیورسٹی کے سابق پروفیسر عبدالحق نے ڈاکٹر ہاشم قدوائی کے نظریات، خیالات اور خدمات کو آگے بڑھانے کی ضرورت کو اجاگر کرتے ہوئے اس کے لیے قدوائی اکیڈمی قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ معروف صحافی سہیل انجم نے پروگرام کی نظامت کی اور پروگرام کے منتظم ڈاکٹر سید احمد خان نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 5 فروری 2018

دھلی:

مشاعرہ جشن جمہوریت

نئی دھلی: دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا نے کہا کہ ہمیں اردو کے لیے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ خود اتنی طاقتور ہے کہ اپنا کام خود کرلے گی۔ اس کا مقصد ہی سماج میں امن و ادب کو قائم کرنا ہے مگر ہمیں درمیان سے ہٹنے کی ضرورت ہے تبھی وہ بہتر طریقے سے کام کر پائے گی۔ منیش سسودیا دہلی کے تاریخی قلعہ معلی (لال قلعہ) کے آنگن میں ہر سال منعقد ہونے والے دہلی اردو اکادمی کے مشاعرہ جشن جمہوریت میں مہمان خصوصی کے طور پر خطاب کر رہے تھے۔ اس موقعے پر ان کے ہمراہ دہلی کے وزیر برائے خوراک و رسد عمران حسین

اور سینئر عاپ لیڈر دلیپ پانڈے کے علاوہ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر شہپر رسول بھی موجود تھے۔ مشاعرے میں افتتاحی تقریر کرتے ہوئے نائب وزیر اعلیٰ نے اردو زبان کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ لال قلعہ کا یہ تاریخی مشاعرہ جمہوریت قائم کرنے کے لیے پیش کی جانے والی قربانیوں کو یاد دلانے کے لیے منعقد کیا جاتا ہے مگر دیکھنا یہ بھی ہے کہ اس جمہوریت کو بچانے میں ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔ نائب وزیر اعلیٰ نے بزرگ شاعر گلزار دہلوی کے ساتھ وہاں موجود بھی شعرا کرام کا پھولوں سے استقبال کیا۔ اس موقعے پر وزیر خوراک ور سد عمران حسین نے کہا کہ سرکار اردو کے لیے بہت کام کررہی ہے جس کے اثرات آئندہ 2 سال میں سب کو نظر آجائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہماری وراثت ہے اور اس وراثت کو سنبھالنے کی ضرورت ہے۔ استقبالیہ تقریر میں دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین ڈاکٹر شہپر رسول نے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں اور اپنے بزرگوں کو یاد رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے یا یوں کہہ دوں کہ وہ زندگی کو آئینہ کردیتا ہے۔ آخر میں سکریٹری ایس ایم علی نے بھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 جنوری 2018

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی میں توسیعی لکچر

نئی دهلی: انڈو عرب کلچر سینٹر کے کانفرنس ہال میں شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے عربی مصادر کی اشاعت میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کردار پر سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی نے توسیعی لکچر دیا، جبکہ الجزائر کے مشہور رہنما اور مصلح، نیز تعلیمی، ثقافتی اور دینی تحریک کے روح رواں محمد البشیر ابراہیمی کی عربی زبان کے دفاع میں خدمات پر الجزائری ریسرچ اسکالر محب الدین ایمان کا پی ایچ ڈی مناقشہ منعقد ہوا۔ محب الدین ایمان نے شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پروفیسر عبدالماجد قاضی کے زیرنگرانی ڈاکٹری کی تھیسس مکمل کی۔ پروگرام کا آغاز کرتے ہوئے شعبۂ عربی کے استاذ پروفیسر عبدالماجد قاضی نے تمام مہمانان اور بالخصوص پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی کا استقبال کرتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا اور قدیم عربی مصادر کی اشاعت میں ہندوستان کے عظیم الشان کردار کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کو اس بات پر فخر ہے کہ اس نے بغداد، بیروت، دمشق اور قاہرہ سے بہت پہلے عربی کے بنیادی مصادر کی اشاعت پر توجہ دی اور دائرۃ المعارف حیدرآباد اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ جیسے اداروں نے عرب اداروں پر سبقت حاصل کی۔ فاضل استاذ پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی نے اپنے خطاب میں ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کا تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایشیاٹک سوسائٹی 15 جنوری 1874 میں قائم ہوئی، کلکتہ کے فورٹ ولیم میں سپریم کورٹ کے جج رابرٹ چیمبرز کے زیرصدارت منعقدہ ایک میٹنگ میں مشہور برطانوی مستشرق سر ولیم جونز نے مشرقی علوم وفنون اور تہذیب وثقافت کی تحقیق کے لیے اس سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ اس سوسائٹی نے پہلی کتاب 'رامائن' کا انگلش ترجمہ شائع کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جنوری 2018

ادب اطفال کے متعلق منعقدہ مذاکرہ

نئی دهلی: ''ہر دور میں ادبا و شعرا نے ادب اطفال کی اہمیت محسوس کی اور اسے پروان چڑھانے کی اپنی سی فکر کی

ہے۔ اس ذیل میں اردو شعرا و ادبا کے متعدد نام لیے جاسکتے ہیں۔ ادب اطفال نئی نسل کی تربیت کا نہایت اہم ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ بظاہر بہت آسان لگتا ہے، لیکن حقیقت میں بڑی ریاضت و جاں فشانی کا طالب ہوتا ہے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے بچوں کے ماہ ناموں کا ایک سلسلہ شروع ہوا، جو کچھ اتار چڑھاؤ کے ساتھ مسلسل جاری ہے۔ اس سلسلے میں ایک قابل قدر اضافہ جنوبی ہند کے ایک چھوٹے سے شہر بھٹکل سے نکلنے والے رسالے ماہ نامہ 'پھول' کے ذریعے ہوا ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ بچوں کی تربیت میں نمایاں کردار ادا کرے گا۔'' ان خیالات کا اظہار معروف شاعر و ناقد ڈاکٹر تابش مہدی نے بزم شہباز دہلی کے زیراہتمام ادب اطفال کے متعلق منعقد ہونے والے علمی مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ جلسے کے مہمان خصوصی محمد خلیل نے ادب اطفال کے میدان میں اپنی چالیس سالہ خدمات کے تجربات بیان کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان میں بچوں کا ادب تخلیق کرنا بڑا مشکل کام ہے، کیونکہ اس میں حوصلہ افزائی کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں۔ اردو والوں کو اس جانب توجہ دینی چاہیے۔'' ماہ نامہ صلاح کار کے چیف ایڈیٹر عبدالغفار صدیقی نے 'ادب اطفال، اہمیت اور طریقۂ کار' کے عنوان پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے اپنے مقالے میں بچوں کے رسائل کو زیادہ مفید بنانے کے لیے قیمتی تجاویز پیش کیں۔ مدرسہ سبیل السلام کے مہتمم مولانا جنیدالرحمٰن ندوی نے قرآن و حدیث کی روشنی میں ادب اطفال کی اہمیت اور اس کے خد وخال واضح کیے۔ انھوں نے کہا کہ ''بچوں کا ادب زمانے کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے والا بھی ہونا چاہیے اور اس کی اساس تربیت کے نبوی اصولوں پر بھی ہونی چاہیے۔'' بھٹکل سے آئے ہوئے وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے ماہ نامہ 'پھول' کے ایڈیٹر مولانا عبداللہ ندوی نے اپنے تجربات سے اہل مجلس کو واقف کراتے ہوئے کہا کہ ''ہم لوگوں نے ماہ نامہ پھول کو ایک رسالے کے طور پر نہیں، بلکہ ایک تحریک کے طور پر شروع کیا ہے۔ پروگرام کا آغاز عبدالمقیت ندوی کی تلاوت سے ہوا، جب کہ مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی کی دعا پر جلسہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 14 جنوری 2018

'اردو پڑھاؤ اردو بچاؤ' مہم کا آغاز

نئی دهلی: اردو زبان کو معاشرے میں عام کرنے، نئی نسلوں کو اس سے آشنا کرانے نیز وارڈ کے بورڈوں میں ہندی کے ساتھ اردو کے استعمال کرانے کی غرض سے

سرسید مشن فار انڈیا کی جانب سے 'اردو پڑھاؤ اور اردو بچاؤ' مہم کا آغاز گلی نمبر 5 کبیر نگر سے قومی ترانے کے ساتھ کیا گیا جو دہلی کے مختلف علاقوں میں تنظیم کے

'تیج بہادر سپرو کی شخصیت اور ادبی خدمات' پر منعقدہ سمینار

کارکنان دورہ کرکے نکڑ ناٹک کے ذریعے اردو کی جانب لوگوں کا ذہن مبذول کرائیں گے اور ہر وارڈ میں کم سے کم دو پروگرام کرائے جائیں گے جس کے لیے اتوار کا دن مخصوص کیا گیا ہے۔ آغاز مہم کی جو سب سے اہم بات رہی ہے وہ یہ کہ جس چوک (گلی نمبر 5 چوک) سے اردو مہم کا آغاز کیا گیا اس چوک کا نام اردو چوک رکھ دیا گیا ہے جس کا باضابطہ طور پر اردو چوک کے نام سے بورڈ بھی لگا دیا گیا ہے۔ اس موقعے پر مقامی کونسلر ساجد خان کو میمورنڈم بھی دیا گیا جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ وہ بورڈ پر ہندی کے ساتھ ساتھ اردو کا بھی استعمال کریں۔ تنظیم کے صدر ذاکر حسین نے کہا کہ ہم رونا روتے ہیں کہ اردو ختم ہو رہی ہے اور حکومتیں توجہ نہیں دے رہی ہیں مگر اس طرف کوئی بھی توجہ نہیں دیتا کہ ہمارے بچے اردو کتنا پڑھ رہے ہیں یا ہم اردو کو لے کر کتنے سنجیدہ ہیں۔ اس تحریک کا مقصد یہی ہے کہ جو لوگ اس زبان سے بے توجہی کا مظاہرہ کر رہے ہیں انھیں اردو کی طرف راغب کیا جائے۔ نائب صدر فرقان خان نے کہا کہ اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے اپنے گھروں میں اردو اخبارات منگوائے جائیں تاکہ نئی نسلوں میں اردو کے تئیں بیداری آئے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جنوری 2018

اترپردیش:

تیج بہادر سپرو کی شخصیت اور ادبی خدمات

الہ آباد: تیج بہادر سپرو روشن ذہن کے مالک اور سیکولر ذہن رکھتے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ بہت اہم حصہ ہے۔ بہت کم عمر میں پورے ملک میں ان کو شہرت حاصل ہوگئی تھی۔ وہ اردو کے ایک زبردست شیدائی اور اس کی ثقافت کے امین تھے۔ ان خیالات کا اظہار شمس الرحمٰن فاروقی نے تیج بہادر سپرو کی شخصیت اور ادبی خدمات پر منعقدہ ایک روزہ سمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ جو اپنی تاریخ کو بھولتا ہے وہ اپنے مستقبل کو ضائع کر دیتا ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سید فاضل ہاشمی کی کتاب 'سر تیج بہادر سپرو شخصیت اور ادبی خدمات' کا اجرا عمل میں آیا۔ کرنل راج کمار کاک مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ریاستی یونیورسٹی الہ آباد کے وائس چانسلر پرفیسر راجیندر پرساد نے سمینار کا افتتاح کیا۔ کرنل کاک نے کہا کہ آج کا دن بہت تاریخی ہے کیونکہ ہم اس شخصیت کو یاد کر رہے ہیں جو سرتاپا ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کا نمائندہ تھا۔ ڈاکٹر سید فاضل حسین ہاشمی نے سپرو کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر مشتمل کتاب کے بارے میں کہا کہ یہ سپرو کو سمجھنے اور اس عہد کو دیکھنے کی ایک کوشش ہے۔ امید ہے اسے پسند کیا جائے گا اور ہندوستانی اکادمی کے اہم کاموں میں اسے شمار کیا جائے گا۔ ہندوستانی اکادمی کے سکریٹری کمار نے کہا کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اپنی تاریخ اور تہذیب کو محفوظ رکھیں اور اس سمت ہماری کوشش جاری ہے۔ اکادمی کے خزانچی روی نندن نے افتتاحی اجلاس کی نظامت فرمائی اور مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 جنوری 2018

سرسید اینڈ کنٹم پریری انڈیا

علی گڑھ: سرسید اورنس فورم کی جانب سے 'علی گڑھ مہوتسو' کے مکتا کاش منچ پر 9ویں قومی سمینار بہ عنوان 'سرسید اینڈ کنٹم پریری انڈیا' کا انعقاد کیا گیا جس میں مقررین اور معززین نے دورِ حاضر میں سرسید کی معنویت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہمان خصوصی ضلع کی مشہور ڈاکٹر اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی اہلیہ ڈاکٹر حمیدہ طارق نے کہا کہ سرسید بہت دور کی سوچ رکھتے تھے اور وہ اپنے دور سے آگے کی چیزوں کو سوچتے تھے۔ سرسید کا خیال تھا کہ ہمیں بڑے خواب دیکھنے چاہئیں کہ تاکہ اس کی تعبیر بھی بڑی ہو، سرسید کا مقصد ایک ایسی دانش گاہ بنانا تھا، جس کے دروازے بلاتفریق مذہب وملت سبھی کے لیے کھلے ہوں۔ ڈاکٹر حمیدہ طارق نے مزید کہا کہ سرسید کی معنویت آج بھی اتنی ہے جتنی 19ویں صدی میں تھی۔ آر ایف کے کمانڈنٹ ہلال فیروز نے کہا کہ سرسید کی شخصیت کو نکھارنے میں ان کی والدہ کا بڑا ہاتھ رہا۔ سرسید ہندو مسلم ایکتا کے طرف دار تھے۔ وہ لوگوں کو برابری کا حق دینے کے حق میں تھے۔ کمانڈنٹ صاحب نے سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے فورم کے صدر شکیل صمدانی کی بھرپور تعریف کی۔ انیس احمد انصاری، آئی پی ایس و کمانڈنٹ پی اے سی نے کہا کہ سرسید نے جس وقت دنیا میں قدم رکھا اس وقت کے حالات کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آگے چل کر انھوں نے قوم کی حالت کو سدھارنے کے لیے ایک لائحہ عمل تیار کیا اور اس کو کامیابی کے ساتھ پورا کیا۔ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ مسلم یونیورسٹی ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ کچھ ویلیوز (Values) بھی جڑی ہوئی ہیں۔ دورِ حاضر میں ویلیوز کو بہت خطرہ ہے اس لیے ہمیں سرسید کی شخصیت پر غور کرنے اور اس پر عمل کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ سرسید کی تعلیمات میں ہمیں صحیح حب الوطنی کا سبق ملتا ہے۔ اخیر میں پروفیسر قدوائی نے کہا کہ ہمیں ایک ایسے ہندوستان کی ضرورت ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کے خیالات اور جذبات کا احترام کریں۔ اس سمینار کو کیبنٹ ممبر متین اشرف، پارس گوڑ، اور سارہ صمدانی نے بھی خطاب کیا۔ اس موقعے پر سماج کی مختلف شخصیات کو ان کے کارناموں کے لیے اعزاز سے نوازا گیا۔ پروفیسر نواب علی خان (بیسٹ مینج منٹ) پروفیسر شافع قدوائی (لٹریچر)، پروفیسر نیر آصف (آرتھوپیڈکس)، ڈاکٹر ستیندر کمار جین (فیملی لٹریسی)، ڈاکٹر نجم الدین انصار (اینمل پروٹکشن)، کیپٹن اے کے سنگھ (نیشنل سروس)، نجم الدین عباسی (بیسٹ آفیسر)، ڈاکٹر پریت پال سنگھ (سوشل سروس) کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروگرام کی بہترین نظامت عائشہ صمدانی نے کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 جنوری 2018

غیر افسانوی نثر: اہمیت وافادیت

وارانسی: ادبی نگارشات میں تخلیقیت کا عمل ایک ناگزیر جزو کا حکم رکھتا ہے لیکن تخلیق کا دائرہ شاعری اور افسانہ تک محدود نہیں بلکہ غیر افسانوی نثر بھی تخلیقیت کے ذریعے ہی دلچسپ اور موثر بنائی جاسکتی ہے۔ غیر افسانوی نثر زبانوں کو ثروت مند بنانے اور دوسرے علوم سے اس کا رشتہ استوار کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ لہٰذا غیر افسانوی نثر کسی بھی اعتبار سے تخلیقی نثر سے کم تر نہیں۔ متذکرہ

شاد عظیم آبادی یادگاری تقریب کا منظر

رمز عظیم آبادی یادگاری تقریب

خیالات کا اظہار اردو کے معروف ادیب و محقق اور شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے استاد پروفیسر شہاب الدین ثاقب نے دستک ادبی فورم کے زیر اہتمام منعقدہ 'خصوصی لیکچر' بعنوان 'غیر افسانوی نثر: اہمیت و افادیت' کے تحت کیا۔ انھوں نے غیر افسانوی نثر کی مختلف اصناف کا تذکرہ کرتے ہوئے خاکہ، انشائیہ، سوانح، خودنوشت اور سفرناموں کی زبان سے بحث کی اور ان اصناف میں موجود تخلیقی رچاؤ اور زبان و بیان کی خوبیوں کی نشاندہی کی۔ انھوں نے کہا کہ خودنوشت، خاکہ یا انشائیہ میں انسانی قلب ماہیت کی جو کارفرمائی ہوتی ہے وہ داستانوں اور ناولوں سے ممکن نہیں۔ پروگرام کی ابتدا میں صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر مشرف علی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے دستک ادبی فورم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ یہ تنظیم طلبہ کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کو صیقل کرنے کا فریضہ انجام دیتی رہی ہے۔ یہ لیکچر سلسلہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ جلسے کی صدارت شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی نے کی۔ انھوں نے مہمان مقرر پروفیسر شہاب الدین ثاقب کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ موصوف عہد حاضر کے معتبر ادیبوں اور محققوں میں اپنی تحریروں اور فکر و شعور کے باعث بے حد محترم ہیں۔ ان کی تحریریں بے حد سنجیدہ، رواں اور دلائل و براہین سے پر ہوتی ہیں۔ پروگرام کی نظامت شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر محمد قاسم انصاری نے کی جبکہ اظہار تشکر کی رسم شعبہ کے استاد ڈاکٹر احسان حسن نے ادا کی۔

روزنامہ 'قومی تنظیم' لکھنؤ، 17 جنوری 2018

بہار:

شاد عظیم آبادی یادگاری تقریب

پٹنہ: شاد عظیم آبادی کی حیثیت نہ صرف یہ کہ کلاسیکی اردو شاعری میں مستند ہے بلکہ معماران دبستان عظیم آباد میں بھی ان کی حیثیت ممتاز و منفرد ہے۔ کم عمری سے ہی شعری ذوق اور مشق سخن نے ان کی شخصیت میں ایسا نکھار پیدا کر دیا کہ دنیائے ادب انھیں ہمیشہ تحسین کی نظر سے دیکھنے لگی۔ شاد عظیم آبادی کے یوم پیدائش کے موقعے پر 8 جنوری کو محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام منعقد شاد عظیم آبادی یادگاری تقریب میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مختلف دانشوروں اور ادیبوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ شاد عظیم آبادی فخر بہار اور فخر عظیم آباد ہیں۔ پوری اردو دنیا شاد پر ناز کرتی ہے اور بہار کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہ بہار میں پیدا ہوئے۔ معروف مورخ اور خدا بخش لائبریری کے سابق ڈائرکٹر امتیاز احمد نے صدارتی خطبے میں کہا کہ شاد ایک عظیم شاعر تھے مگر انھوں نے اردو شاعری کے علاوہ تاریخی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ انھوں نے شاد کی کتاب تاریخ بہار کے حوالے سے بتایا کہ اس کتاب سے اردو دنیا ناواقف ہے جبکہ انھوں نے اس کتاب کے ذریعے بہار کی عمومی تاریخ پیش کی جبکہ اس کے دوسرے حصہ میں انھوں نے عظیم آباد کی تہذیب و ثقافت سے روشناس کرایا ہے۔ افسانہ نگار ڈاکٹر شہناز فاطمی نے شاد کے حوالے سے کہا کہ وہ مصلح قوم اور قومی یک جہتی سے سرشار شاعر تھے۔ عالمی شہرت یافتہ جاوید دانش نے کہا کہ شاد عظیم آبادی غزل کے امام تھے۔ کناڈا کے اردو ادیب اور سخنور کے مدیر افضل امام نے کہا کہ شاد ایک عظیم شاعر تھے مگر بہار نے ان کی شخصیت شناسی نہیں کی جس کے وہ حقدار تھے ورنہ شاد صوبے تک سمٹ کر نہیں رہ گئے ہوتے۔ شاد کی شاعرانہ عظمت کے حوالے سے انھوں نے اقبال کا وہ حوالہ بھی پیش کیا جس میں اقبال نے کہا تھا کہ ''اگر لاہور سے عظیم آباد قریب ہوتا تو میں ان کی صحبت اختیار کرتا۔'' ڈاکٹر صفدر امام قادری نے کہا کہ شاد کے کلام بکھرے پڑے ہیں جن پر تحقیقی کام بہت ہی کم ہوا ہے۔ شاد عظیم آبادی کے خانوادے اور اسٹڈی کے سرپرست ڈاکٹر نثار احمد نے اس موقعے پر اپنے تاثرات پیش کیے۔ مقالہ نگاروں میں عارف حسن اور شرف الہدیٰ کے علاوہ محمد نوشاد عالم اور غلام حسین کے نام شامل ہیں۔ تقریب کا آغاز غلام رسول کے شعری کلام سے ہوا۔ اس موقعے پر افضل امام کناڈا کی کتاب 'اس نے لکھا تھا'۔ کلیم عاجز کے خطوط افضل امام کے نام' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ اس نشست کی نظامت اسلم جاوداں نے کی جبکہ دوسری شعری نشست پر تقریب کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 جنوری 2018

رمز عظیم آبادی یادگاری تقریب

پٹنہ: شاعری الفاظ کا کھیل ہے اور الفاظ جذبات سے آتے ہیں، جتنا کرب ہوگا الفاظ بھی اسی تناسب سے ذہن میں آتے ہیں۔ رمز کی شاعری کی عظمت یہ ہے کہ وہ لفظوں کی اڑان کو پہچانتے تھے اور اسی مناسبت سے اس کا استعمال کرتے تھے۔ رمز کا یہی کمال فن تھا جس سے ان کی شاعری اس بلندی تک پہنچ گئی۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے رمز عظیم آبادی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام 15 جنوری کو وہ اسیلیکھ بھون میں رمز عظیم آبادی کی یادگاری تقریب سے خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ رمز عظیم آبادی نے کبھی مدرسہ یا اسکول کا منھ ہی نہ دیکھا تھا مگر وہ بخوبی جانتے تھے کہ غیر متعین الفاظ سے حسن پیدا کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے الفاظ کے استعمال میں غیر معمولی توجہ برتی اور بیان کا حسن کمال ہے۔ معروف ناقد اور شاعر پروفیسر شاداب رضی نے کہا کہ رمز اردو کے عظیم شاعر ہیں مگر یہ بڑا المیہ ہے کہ ان کے ساتھ یہ بات وابستہ کر دی گئی ہے کہ وہ کم پڑھے لکھے شاعر تھے۔ انھوں نے کہا کہ شیکسپیئر بہت کم پڑھے لکھے تھے مگر اس کے باوجود وہ اتنے مقبول ہیں۔ انھوں نے رمز کی پیدائش، پیشہ اور وفات سے قطع نظر ان کی شاعری پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ زبیر احمد نے رمز کی شاعری پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ نامساعد حالات کے باوجود ان کی شاعری معیاری ہے اور ان کا شعر و سخن اردو ادب کا بڑا سرمایہ ہے۔ فخر الدین عارفی نے اپنے مقالے میں انھیں عظیم شاعر کہا۔ اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر امتیاز احمد کریمی نے رمز عظیم آبادی کا مختصر تعارف

پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ معاشی اور اقتصادی بدحالی کے باوجود مزمّر نے جس طرح شاعری کی اردو دنیا انھیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ نشست کی نظامت اسلم جاوداں نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جنوری 2018

اردو کے حوالے سے سمینار

سیتامڑھی: اردو کسی خاص مذہب یا مسلک کی نہیں بلکہ یہ مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور اردو کا ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی بقا میں اہم کردار ہے۔ اس زبان سے جہاں گفتگو میں چاشنی و حلاوت پائی جاتی ہے وہیں جنگ آزادی میں مجاہدین آزادی نے انقلاب پیدا کرنے کے لیے بھی اسے خوب استعمال کیا۔ اردو زبان کو رسم الخط کے ساتھ زندہ رکھنے کے لیے پائیدار کوشش کرنی ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار اردو ڈائرکٹوریٹ محکمہ کابینہ سکریٹریٹ حکومت بہار کے وزیر انتظام ضلع اردو زبان سیل کی طرف سے مقامی راجندر بھون میں منعقد سمینار میں سیتامڑھی کے ڈی ایم راجیو روشن نے اپنے خطاب کے دوران کیا۔ ڈی ڈی سی نے کہا کہ اردو کسی فرد تک خاص رہنے والی زبان نہیں ہے بلکہ ملک میں کسی نہ کسی بہانے ہر جگہ اردو کے بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اسے باقی رکھنے کے لیے مشترکہ طور پر جدوجہد کرنی ہوگی۔ ضلع اقلیتی فلاح و بہبود افسر بید ناتھ پرساد نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ آپسی اتحاد کی بقا کے لیے بہترین کڑی کے طور پر اردو ملی ہے اور اس کی ترویج و ترقی کے لیے ہمیں باہم کوششیں کرنا ہوں گی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جنوری 2018

فروغ اردو سمینار

سہرسہ: محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائرکٹوریٹ کی ہدایت پر ضلعی سطح پر اردو سیل کے زیر اہتمام مقامی کلا بھون سپر مارکٹ میں فروغ اردو سمینار کا افتتاح اے ڈی ایم دھریندر کمار جھا، ریڈ کراس کے صدر ڈاکٹر ابوالکلام، ضلع اوقاف کمیٹی کے سکریٹری پروفیسر طاہر، سابق ایم ایل سی محمد اسرائیل راعین نے مشترکہ طور پر شمع روشن کرکے کیا۔ ڈاکٹر ابوالکلام نے پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ اردو ریاست کی دوسری سرکاری زبان ہے، اس لیے اردو میں درخواستیں دی جائیں اور جواب بھی اردو میں دیا جانا چاہیے۔ اس موقعے پر اے ڈی ایم دھریندر کمار جھا نے کہا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، یہ تمام طبقوں کی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نصرت فتح علی خان اور غلام علی کی غزلیں بہت شوق سے سنتا ہوں۔ ملک

کرشن لال کی اردو کلاس

چنڈی گڑھ: کرشن لال پچھلی چار دہائیوں سے اردو زبان کی ترویج کے لیے دل و جان سے لگے ہیں۔ 'پنجابی میری مادری زبان ہے اور مجھے اس پر فخر ہے لیکن مجھے اردو سے اس قدر محبت ہے کہ میں اس کے لیے خون کا آخری قطرہ تک دے سکتا ہوں'

اب پاکستان میں شامل علاقے پٹن میں پیدا ہونے والے کرشن لال حکومت پنجاب کی جانب سے اس زبان کے فروغ کے پروگرام کے تحت 41 سال سے یہ زبان سکھا رہے ہیں۔ کرشن لال کہتے ہیں 'پہلے یہ میرا مشن تھا لیکن اب یہ میرا جنون بن گیا ہے'۔ کرشن لال محکمۂ آبپاشی میں کلرک کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں اردو پڑھانے کی جز وقتی ملازمت مل گئی کیونکہ وہ اس علاقے میں واحد شخص تھے جنھوں نے اس مضمون میں ایم اے کر رکھا تھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے اردو میں ڈاکٹریٹ کرنے والے پہلے شخص تھے۔ کرشن لال نے بی بی سی نیوز پنجابی کو بتایا کہ 'میرے والد وفات سے پہلے اسپتال میں داخل رہے۔ میں انھیں دیکھنے گیا تو انھوں نے گھڑی کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ اردو کی کلاس کا وقت ہو گیا ہے۔ میرے خاندان میں سبھی جانتے تھے کہ میری اس زبان کے ساتھ کتنی انسیت ہے۔' ان کے اس 6 ماہ کے مفت کورس میں درجن بھر طلبہ ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا 'دس سے پندرہ طلبا میں ریٹائرڈ ملازمین، بیورو کریٹ اور نوجوان سبھی شامل ہوتے ہیں۔'

کرشن لال کا کہنا ہے کہ ان کے کلاس میں آنے والے بیشتر افسران اردو اس لیے سیکھتے ہیں کیونکہ وہ شراب نوشی کے بعد اردو شاعری سنانا چاہتے ہیں جبکہ کئی نوجوان زبان کی باریکیاں سیکھنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ وہ اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

کھیل نہیں اے داغ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

انھوں نے مزید کہا کہ آزادی سے قبل انڈیا کی عدالتی اور مقامی دفتری زبان اردو تھی۔ سنہ 2001 کی مردم شماری کے مطابق ملک میں بولی جانے والی 22 زبانوں میں اب بھی اردو پانچویں بڑی زبان ہے۔ کرشن لال کا کہنا ہے 'اردو محض ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے۔ اگر سب اردو بولنا شروع کر دیں تو دنیا سدھرنے لگے گی۔ اگرچہ مجھے پنجابی ہونے پر فخر ہے لیکن اردو پنجابی جیسی کرخت زبان کی بہ نسبت ایک نرم گفتار زبان ہے۔'

بی بی سی اردو

کے بہت سارے لوگ اردو ادب اور اردو شاعری سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں۔ سابق ایم ایل سی محمد اسرائیل راعین نے کہا کہ اردو انقلابی زبان ہے، اس میں بڑی طاقت ہے۔ یہ کسی مذہب کی زبان نہیں ہے، اس زبان کو فروغ دینے میں سبھی طبقوں کا تعاون رہا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جنوری 2018

مہاراشٹر: ————————

گیٹ وے آف انڈیا پر کل ہند مشاعرہ

مہاراشٹر: یوم جمہوریہ کے موقعے پر ہر سال کی طرح اس سال کی بھی 26 جنوری کو تاریخی گیٹ وے آف انڈیا پر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کی جانب سے کل ہند مشاعرہ 'جشن ہندوستان' کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں پورے ہندوستان سے شعرائے کرام تشریف لائے تھے۔ ممبران اکادمی اسلم تنویر اور عظیم نواز راہی نے شاعروں اور سامعین کا خیر مقدم کیا۔ محکمہ اقلیتی ترقیات حکومت مہاراشٹر کے پرنسپل سکریٹری جناب شیام تاگڑے نے شمع فروزاں کرکے مشاعرے کا افتتاح کیا۔ حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ ''ریاست مہاراشٹر میں اردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج کے لیے مہاراشٹر اسٹیٹ ساہتیہ اردو اکادمی اس طرح کے پروگرام منعقد کرتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ اکادمی کی اور بھی کئی اسکیمیں ہیں جن سے اردو والے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ مشاعرہ بھی اردو کی ترقی اور لوگوں کی اردو سے دلچسپی پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے، یہ ایک تہذیبی ورثہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ حاضرین اس سے لطف اندوز ہوں گے۔''

عرفان پٹیل کی نعت پاک سے مشاعرے کی شروعات ہوئی۔ ممتاز ناظم مشاعرہ ڈاکٹر کلیم قیصر نے نظامت کی ذمے داری بخوبی نبھائی۔ شاعر وسیم بریلوی کی صدارت میں مشاعرے میں مدعو شعرا نے اپنے اپنے کلام سے حاضرین کو خوب محظوظ کیا اور سامعین نے بھی شعرا کے کلام کی خوب داد دی۔ مشاعرے کے دیگر شعرا میں ذاکر خان ذاکر، مہران امروہی، تنویر غازی، مونیکا سنگھ، حسیب سوز، پرگیہ وکاس، رنجیت چوہان، قیصر خالد، پاپولر میرٹھی، جوہر کانپوری اور ڈاکٹر کلیم قیصر نے بھی اپنے اپنے کلام پیش کیے۔

پریس ریلیز: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی، مہاراشٹر، 26 جنوری 2018

'اردو صحافت مسائل اور امکانات' پر منعقدہ سیمنار

بنگال:

اردو صحافت: مسائل اور امکانات

کلکتہ: مشہور صحافی وسیم الحق نے مغربی بنگال اردو اکادمی کے اردو صحافت مسائل اور امکانات کے موضوع پر منعقد دو روزہ سیمنار کی افتتاحی تقریب میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو صحافت کو اس وقت جس صورت حال کا سامنا ہے شاید ہی کبھی رہا ہوگا۔ مگر مسائل کے حل کرنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے تو یقیناً اردو صحافت کا عہد رفتہ ایک بار پھر بحال ہوسکتا ہے۔ وسیم الحق نے کہا کہ ہندوستان کی آزادی اور تقسیم ہند کے بعد ملک جن حالات سے دوچار ہوا اس سے اردو صحافت بھی متاثر ہوئی، حکومت کی ناانصافیوں اور بے توجہی اور ہم سب کی غفلت کی وجہ سے اردو صحافت کا وہ کردار سماج و معاشرہ میں نہیں رہا جو ہندوستان کی آزادی سے قبل تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس مایوس کن دور میں بھی ملک کے بیشتر بڑے شہروں سے اردو اخبارات کی اشاعت ہورہی ہے اور اخبارات جدید تکنالوجی سے بہرہ ور ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان حالات میں مایوس ہونے کے بجائے سنجیدگی سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جائے، مجھے امید ہے کہ اسی مایوسی سے روشن کرنیں پھوٹیں گی۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کے کارگزار وائس چیئرمین ایس حیدر نے کہا کہ کلکتہ شہر کو یہ فخر حاصل ہے کہ برصغیر میں صحافت کا آغاز اسی شہر سے ہوا اور اردو صحافت کا جنم بھی اسی شہر سے ہوا۔ مولانا آزاد کے 'الہلال' اور 'البلاغ' نے تو پورے ہندوستان میں تحریک آزادی کا صور پھونک دیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو صحافت نے تحریک آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے اور آزادی کے بعد بھی اردو صحافت نے اقلیتوں اور پسماندہ طبقات کے مسائل کو پوری قوت کے ساتھ اٹھایا۔ مشہور صحافی معصوم مراد آبادی نے بھی اردو صحافت کے ماضی کے حوالے سے گفتگو کی اور اردو صحافت کے مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ اس سیمنار میں یواین آئی اردو سروس کے ایڈیٹر عبدالسلام عاصم، انقلاب دہلی کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر محمد یامین انصاری، لکھنؤ سے شاہنواز قریشی اور معصوم مراد آبادی نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 فروری 2018

اعزاز و اکرام:

پروفیسر آصفہ زمانی اردو اکادمی یوپی کی چیئرپرسن نامزد

لکھنؤ: صوبے میں آدتیہ ناتھ یوگی حکومت تشکیل ہونے کے بعد خالی پڑے اقلیتی اداروں کے عہدوں کو پر کرنے کی پیش رفت شروع ہوگئی ہے۔ پدم شری اعزاز یافتہ پروفیسر آصفہ زمانی کو اردو اکادمی یوپی کا چیئرپرسن اور

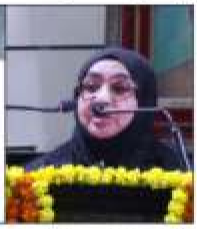

ڈاکٹر عارف ایوبی کو فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کا چیئرمین نامزد کیا گیا ہے۔ پروفیسر آصفہ زمانی لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کی سربراہ رہ چکی ہیں اور موجودہ وقت میں ڈاکٹر عارف ایوبی لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے صدر کے عہدے پر فائز ہیں۔ پروفیسر آصفہ زمانی سابق ریاستی وزیر شیمار ضوی کی والدہ ہیں اور تقریباً دو درجن کتب کی مصنفہ ہیں۔ نومنتخب چیئرپرسن کے ملک اور بیرون ممالک کے ممتاز ادبی رسائل میں دو سو سے زائد مضامین شائع ہوچکے ہیں اور حکومت ہند کی جانب سے انھیں 2010 میں فارسی کی اہم خدمات کے اعتراف میں پدم شری ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ 1975 میں بطور لکچرر اپنے کریئر کا آغاز کرنے والی پروفیسر آصفہ زمانی پہلی خاتون ہیں جنھیں شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی اور ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری ملی تھی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 1 فروری 2018

ظفر اقبال کو سوشل ایکسی لینس ایوارڈ

نئی دھلی: اردو کے معروف نوجوان شاعر اور سماجی کارکن

ظفر اقبال عرف ظفر عارفانہ کو سماجی خدمات کے لیے سوشل ایکسی لینسی ایوارڈ سال 2018 سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں سوسائٹی فار پالیسی ریسرچ اینڈ امپاورمنٹ کے ذریعے ایتھک ڈسکورس ان سوشل سائنس اینڈ مینجمنٹ کے موضوع پر منعقد کی جانے والی تقریب کے دوران دیا گیا۔ ریٹیلرس اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے صدر ظفر اقبال عرف ظفر عارفانہ نہ صرف نوجوان شاعر ہیں بلکہ سماجی خدمات میں اپنے دائرے میں رہتے ہوئے بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیتے ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ یہ میرے لیے باعث فخر بات ہے کہ مجھے عوامی خدمت کے لیے اعزاز سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر انھوں نے میزبان تنظیم کے ذمے داران کا شکریہ بھی ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جنوری 2018

پروفیسر فضل اللہ قادری کو علامہ کبیر الدین ایوارڈ

نئی دھلی: 'عالمی یونانی میڈیسن ڈے' 2018 کے موقعے پر پروفیسر فضل اللہ قادری کو 'علامہ کبیر الدین ایوارڈ برائے علمی و تالیفی خدمات' کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ واضح ہو کہ یونانی طب کے میدان میں پروفیسر فضل اللہ قادری (پھلواری شریف، پٹنہ) ایک عرصے سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے CCRUM کے انٹرنیشنل سیمنار میں ایک لیکچر 'القانون فی الطب—A Bible of Tibb' کے عنوان سے پیش کیا۔ وہ گورنمنٹ طبیہ کالج کی انجمن خدام الطب کے صدر رہے اور مجلّہ 'طبیب' ان کی ادارت میں شائع ہوا۔ ان کے مضامین ملک کے طبی مجلات کے علاوہ پاکستان کے طبی جرائد میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی اہم تصنیفات میں اصطلاحات کلیات ادویہ وصیدلہ، المفردات (یونانی) زیر طبع، انتخابات قادری، سید احمد عروج قادری کے افسانے، انشائیے وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر فضل اللہ قادری 'آل انڈیا یونانی طبی کانگریس' صوبہ بہار کے صدر بھی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 جنوری 2018

ڈاکٹر محمد ادریس حبان رحیمی 'فخر الاطبا ایوارڈ' سے سرفراز

بنگلور: بزم غالب بنگلور اور کرناٹک اردو اکادمی کے اشتراک سے منعقدہ کل ہند مشاعرے میں حبیب الامت ڈاکٹر مولانا محمد ادریس حبان رحیمی کو ان کی طبی خدمات کے اعتراف میں فخر الاطباء ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ واضح

رہے کہ ماہر نباض حضرت مولانا حکیم ڈاکٹر محمد ادریس حبان رحیم ایم ڈی جن کی جائے پیدائش چرتھاول ضلع مظفرنگر یوپی ہے۔ ان کی شخصیت طبی دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ حضرت حکیم صاحب گزشتہ چار دہائیوں سے بنگلور میں مقیم ہیں جہاں آپ طبی تعلیمی اور اصلاحی خدمات میں مصروف ہیں۔ شہر بنگلور میں آپ نے کئی ایک تعلیمی ادارے قائم فرمائے جو قوم وملت کی خدمات میں مصروف ہیں۔ مولانا رحیمی کی طبی خدمات کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک کے مریض بھی بڑی تعداد میں رجوع کرتے ہیں اور شفایاب ہوتے ہیں۔ 26 جنوری 2018 کو کرناٹکا اردو اکادمی نے کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا۔ اس موقعے پر کرناٹکا اردو اکادمی نے مولانا رحیمی کو 'فخر الاطبا ایوارڈ' سے نوازا۔ یہ ایوارڈ آپ کو حکومت کرناٹکا کے وزیر ہاؤزنگ جناب ایم کرشنپا کے ہاتھوں پیش کیا گیا، جسے آپ کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر حکیم محمد فاروق اعظم حبان قاسمی نے وصول کیا۔ اس سے قبل بھی بڑے حکیم صاحب مولانا رحیمی کو سابق ریاستی گورنر ہنس راج بھاردواج نے کرناٹکا راج بھون میں منعقدہ ایک پروقار تقریب میں حضرت حکیم صاحب کو اعزاز سے نوازا تھا۔ حضرت حکیم صاحب کی فن طب پر درجنوں کتابیں منظر عام پر قبول خاص وعام ہو چکی ہیں۔ اس موقعے پر اپنے خطاب میں مہمان خصوصی ریاستی وزیر برائے ہاؤزنگ ایمن کرشنپا نے کہا کہ اردو ایک شیریں زبان ہے۔ میر وغالب کے اشعار دلوں کو چھو جاتے ہیں۔ گرچہ میں اردو بول چال پر قادر نہیں لیکن اردو کے اشعار سے خوب محظوظ ہوتا ہوں۔ بزم غالب کے صدر محبوب پاشاہ عرف نمبر بابو کے کلمات تشکر کے ساتھ مشاعرہ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 31 جنوری 2018

حنیف سید 'خدمتِ خلق ایوارڈ' سے سرفراز

آگرہ: 10 جنوری 2018 خدمت ویلفیئر سوسائٹی، آگرہ رجسٹرڈ کی جانب سے جے پیلیس آگرہ کے یوتھ ہاسٹل میں منعقدہ اعزاز وایوارڈ ڈسٹری بیوشن میں کنوینر جناب

پرویز کبیر صاحب نے آگرہ کے افسانہ نگار حنیف سید کی گل پوشی وردائے افتخار کے ساتھ مسند صدارت ولکھنؤ کے ارشاد راہی کی گل پوشی وردائے ادب سے سرفراز کر کے مسند مہمان خصوصی وانشور دیال اور حاجی یوسف قریشی کی گل پوشی کر کے مہمانِ ذی وقار سے سرفراز کیا۔ اُس کے بعد افسانہ نگار حنیف سیّد، سروج گوڑ نے شاعر ارشاد راہی لکھنوی کی کتابوں 'ہم راہی' اور 'حقیقتاً' کا اجرا کیا۔ اسی موقعے پر خدمت ویلفیئر سوسائٹی، آگرہ کی جانب سے سوسائٹی کی صدر محترمہ رینا جعفری نے اردو ادب کی خدمت کرنے والے افسانہ نگار حنیف سیّد کی گل پوشی اور ردائے افتخار کے ساتھ 'خدمت خلق' ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

پروگرام کی نظامت آمیزشِ سخن کے ساتھ سوسائٹی کے سکریٹری جناب پرویز کبیر نے فرمائی۔ آخر میں خدمت ویلفیئر سوسائٹی، آگرہ کی صدر عزت مآب محترمہ رینا جعفری نے سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

رپورٹ: پرویز کبیر، خدمت ویلفیئر سوسائٹی، آگرہ، یوپی، 1 فروری 2018

اردو میڈیم اسکول کے طلبا کو اعزازات

نئی دھلی: فصیل بند شہر کی مشہور ومعروف سماجی تنظیم دہلی یوتھ ویلفیئر ایسوسی ایشن (ڈائیوا) نے ہندی بھون میں سکنڈری اور سینئر سکنڈری سطح کے بورڈ امتحانات میں امتیازی نمبرات حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کے اعزاز میں ایک جلسے کا اہتمام کیا۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ظفرالاسلام خان کی زیر صدارت منعقدہ اس جلسے میں 24 طلبہ وطالبات کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔ جلسے میں چاندنی چوک حلقے کی ممبر اسمبلی الکا لامبا نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی جبکہ دہلی کے وزیر تعلیم کی مشیر آتشی مرلینا مہمانِ ذی وقار کے طور پر شریک ہوئیں۔ اس موقعے پر امریکن فیڈریشن آف مسلمس آف انڈین اوریجن (افمی) کے ٹرسٹی ڈاکٹر عبدالرحمن نا کیدار اور مسلم آبزرور (امریکہ) کے چیف ایڈیٹر ڈاکٹر اسلم عبداللہ کو تعلیم کے میدان میں ان کی بیش بہا خدمات کے لیے خصوصی اعزازات سے سرفراز کیا گیا۔ سروودے کنیا وِدیالیہ نمبر 2، جامع مسجد کو بہترین اردو میڈیم اسکول کے لیے منتخب کیا گیا جسے اسکول کی پرنسپل محترمہ نیلم سچدیوا نے قبول کیا۔ نیو ہورائزن اسکول کی بارہویں جماعت کے طالب علم محمد یاسر کو سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے اور ایس کے وی نمبر 2، زینت محل، لال کنواں کی طالبہ اقصیٰ سکندر کو اردو مضمون میں صد فیصد نمبرات حاصل کرنے کے لیے گیارہ گیارہ ہزار روپے کے نقد انعامات سے بھی نوازا گیا۔ قومی سطح کی 100 میٹر کی دوڑ میں طلائی تمغہ حاصل کرنے والے نثار احمد کو بہترین ایتھلیٹ کا اعزاز دیا گیا جبکہ ڈاکٹر عرشان علی اور ڈاکٹر بشریٰ ظہور کو ایم بی بی ایس مکمل کرنے پر خصوصی انعامات سے سرفراز کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی الکا لامبا نے کہا کہ مسائل کا تعلق مذہب سے نہیں بلکہ ناخواندگی سے ہے۔ دہلی کے وزیر تعلیم کی مشیر آتشی مرلینا نے بچوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی تعلیم میں صرف آپ کی ذات ہی نہیں بلکہ آپ کے والدین اور اساتذہ کا بھی اہم کردار ہے۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ بچوں کی حوصلہ افزائی کے فوری نتائج سامنے نہیں آتے لیکن یہ نہایت اہم ہے اور اس کے نتائج دیرپا ہوتے ہیں۔ پروگرام کے آخر میں صدر محمد نعیم نے مہمانوں، والدین، طلبہ، شرکا اور ایسوسی ایشن کے عہدیداران وممبران کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 جنوری 2018

سلطان اختر شولاپوری اردو دوست ایوارڈ سے سرفراز

بیڑ: روزنامہ 'الہلال' بیڑ اور 'بزم شمع ادب' بیڑ کے زیر اہتمام سلطان اختر شولاپوری کو اردو زبان وادب کے فروغ کی کوششوں کے لیے 'نجابت علی عثمانی اردو ایوارڈ' 23 دسمبر 2017 کو بیڑ میں منعقدہ تقریب میں کارپوریٹر یوگیش شیر ساگر، ممبئی کے جج جناب خواجہ احمد فاروق ودیگر معزز مہمانان کے ہاتھوں انھیں گلدستے، شال اور سپاس نامہ دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔ اس موقعے پر ادارے کے صدر مشتاق انصاری، کارگزار صدر ارشد صدیقی اور روزنامہ 'الہلال ٹائمس' کے مدیر وسکریٹری قمرالایمان خان یوسف زئی موجود تھے۔

روزنامہ 'اردو ٹائمز' ممبئی، 2 جنوری 2018

اجرا:

'لائف اینڈ ٹائمس آف اے نیشنلسٹ مسلم'

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے سابق استاد اور سابق ممبر، راجیہ سبھا، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کی خودنوشت 'لائف اینڈ ٹائمس آف اے نیشنلسٹ مسلم' کی رسم اجرا کی تقریب یو جی سی ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ سینٹر میں منعقد کی گئی جس کی صدارت پرو چانسلر نواب ابن سعید خاں آف چھتاری نے کی۔ اس تقریب کا اہتمام پروفیسر عبدالرحیم قدوائی اور پروفیسر محمد شافع قدوائی نے کیا تھا۔ اس موقعے پر سینئر اساتذہ پروفیسر مسعود الحسن، پروفیسر شان محمد اور پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن نے ڈاکٹر

قدوائی سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر مسعودالحسن نے اپنے خطاب میں کہا کہ ڈاکٹر ہاشم قدوائی اپنے وقت میں یونیورسٹی کے ان معدودے چند اساتذہ میں شامل تھے جن کو طلبا میں زبردست مقبولیت حاصل تھی اور سبھی طبقوں میں ان کو نہایت احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر قدوائی کی خودنوشت دراصل اس دور کے حالات وواقعات کا آئینہ ہے اوراس کی تاریخی اہمیت مسلم ہے۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر قدوائی نہایت بسیار نویس تھے اور انھوں نے اپنے صحافتی شوق کی تکمیل کے لیے اس وقت کے اہم موضوعات پر اخباروں میں خطوط اور مضامین لکھے۔ پروفیسر شان محمد نے کہا کہ ڈاکٹر قدوائی نہایت خلیق اور ملنسار انسان تھے اور لوگوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 جنوری 2018

آہٹ پانچویں موسم کی

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام شام شہریاراں کے موقعے پر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے صدر، ڈاکٹر عباس رضا نیر کے شعری مجموعے 'آہٹ پانچویں موسم کی' پر ایک پروقار مذاکرے کا اہتمام کیا گیا۔ اس مذاکرے کی صدارت کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ شام شہریاراں کے موقعے پر ہم ہر ماہ مختلف موضوعات پر بے تکلفانہ گفتگو کرتے ہیں اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم یہ بھی دیکھیں کہ صاحب کتاب نے اپنے شوق سخن کو کس قدر خوبصورتی سے برتا ہے۔ ڈاکٹر عباس رضا نیر عہد حاضر کے ایک اہم شاعر ہیں اوران کی شاعری میں ہمیں ہر موسم کی آہٹ نظر آتی ہے۔ اس موقعے پر ممتاز نقاد پروفیسر شارب ردولوی نے اپنی خصوصی تقریر میں اس شعری مجموعے کی اہمیت وانفرادیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کسی شاعر تک ہم اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اس کی آہٹ کو نہ پہچانیں۔ بنیادی طور پر عباس رضا نیر کا رشتہ مختلف آہٹوں سے ہے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے موجود جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر شاہد مہدی نے کہا کہ عباس رضا نیر کو میں کافی عرصے سے جانتا ہوں اور ان کی تحریریں میرے مطالعے میں رہتی ہیں۔ شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ اس شعری مجموعے کو پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی نظموں اور غزلوں میں عصری مسائل کے ساتھ ساتھ قدیم روایات کی جھلک بھی ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد پروفیسر کوثر مظہری نے کہا کہ عباس رضا نیر کے مجموعہ کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ اس میں امکانات کی روشنی بے انتہا ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے تمام مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ڈاکٹر عباس رضا نیر کی علمی وادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا۔ اس موقعے پر صاحب کتاب ڈاکٹر عباس رضا نیر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس کامیاب مذاکرے کے بعد میرے پاس کہنے کے لیے کچھ زیادہ نہیں ہے البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ شاعری ایک قسم کی مسٹری ہے۔ موجودہ وقت کے ممتاز شاعر و ناظم معین شاداب نے اپنے خوبصورت انداز میں نظامت کے فریضے کو انجام دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 فروری 2018

مجھے بھی کچھ کہنا ہے

نئی دهلی: ادبی وثقافتی تنظیم 'کاروان سخن' کی جانب سے غالب اکادمی، نظام الدین، دہلی میں اردو کے معروف شاعر امردیپ اوبرائے کے شعری مجموعہ 'مجھے کچھ کہنا ہے' کی رسم اجرا کے موقعے پر ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کاروان سخن کے صدر رئیس مظفرنگری نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر راز سکندرآبادی نے شرکت کی۔ استاد شاعر درد دہلوی کے ہاتھوں کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر درد دہلوی نے شعری مجموعے پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ امردیپ اوبرائے کو اردو سے والہانہ محبت ہے، ان کی تمام تر شاعری اسی محبت کا پیش خیمہ ہے۔ وہ اردو کے فروغ کے لیے انتہائی سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ رئیس مظفرنگری نے کہا کہ امردیپ اوبرائے کا شعری مجموعہ رنگِ تغزل کا اعلیٰ نمونہ ہے، وہ کائنات میں ہونے والے منفی اور مثبت واقعات میں سے صرف مثبت پہلوؤں کو خاطر میں لاتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جنوری 2018

تاثرات

کرلا: پروگرام کے اعلان کے مطابق حمید ادیبی ناندوری کے شعری مجموعے تاثرات کی تقریب رسم اجرا بروز اتوار بتاریخ 7 جنوری 2018 زیر اہتمام بزم اقبال قریش نگر کرلا (مشرق) ممبئی، بمقام بزم اقبال ہال واڑی منعقد ہوئی۔ مسندِ صدارت کے لیے جناب شبیر احمد شاد صاحب بھیونڈی کا انتخاب متفقہ طور سے عمل میں آیا۔ نظامت کے فرائض جناب عارف اعظمی صاحب نے بحسن وخوبی ادا کیے۔ تقریب کا آغاز مولانا جناب محبوب اثری کی مترنم آواز میں تلاوتِ کلام پاک اور نعت شریف کا نذرانہ پیش کرکے کیا گیا۔ پہلے تمام معزز مہمانوں کی گلپوشی ہوئی۔ پھر روزنامہ ممبئی اردو نیوز کے مدیر معاون جناب وکیل خاں کے دستِ مبارک سے جناب حمید ادیبی ناندوری کے شعری مجموعے 'تاثرات' کی رسم اجرا انجام پائی۔ جناب سلام بن عثمان اور جناب شکیل احمد شکیل نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ دونوں صاحبان نے صاحب اعزاز کی سابقہ پانچ تخلیقات کا ذکر کرکے اردو زبان کی خدمت کے ضمن میں ان کی کوششوں کو سراہا اور زیرِ نظر شعری مجموعے پر اپنے تبصرے پیش کیے۔ آخر میں صدر شبیر احمد شاد نے اپنے صدارتی کلام سے تقریب ہذا میں جیسے مزید روح پھونک دی۔ انھوں نے فرمایا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ اردو سے ہماری دوری بڑھنے نہ دیں۔ حمید ادیبی نادوروی صاحب کے شعری مجموعے کے تعلق سے آپ نے کہا کہ مواد کے اعتبار سے وہ ایک انوکھی پیش کش ہے۔ ناظم جناب عارف اعظمی نے صاحب اعزاز اور بزمِ اقبال کی طرف سے تمام معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ڈاک سے: سلیم قریشی، قریش نگر کرلا، ممبئی، 9 جنوری 2018

قیمتی باتیں

دیوبند: نوجوان سماجی کارکن ومصنف مولوی واصف حسن کی مرتب کردہ کتاب قیمتی باتیں (ہندی) کا اجرا مولانا حسیب صدیقی منیجر مسلم فنڈ ٹرسٹ کے ہاتھوں محمود ہال میں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر حسیب صدیقی نے

مذکورہ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کہا کہ مذکورہ کتاب آیات قرآنی، احادیث مبارکہ نیز دانشوران عالم کے اقوال زریں پر مشتمل ہے جو کہ علماء کرام عوام وخواص نیز سماج کے ہر طبقے کے لیے یکساں مفید ہے بالخصوص دین کی تڑپ رکھنے والے افراد کے لیے یہ کتاب ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اصلاح معاشرہ، سماجی

اصلاحات روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل کی بھرپور رعایت رکھتے ہوئے اس سلسلے میں کامیاب مواد کافی عرق ریزی سے جمع کیا گیا ہے۔ اس سے قبل یہ کتاب اردو میں شائع ہوکر مقبول عام ہوچکی ہے۔ معروف شاعر ڈاکٹر نواز دیوبندی نے اپنے ایک پیغام میں کتاب قیمتی باتیں کے سلسلے میں کہا کہ یہ کتاب ہندی ادب میں ایک رہنما کتاب ہے جو کہ ارشادات نبوی اور اقوال زریں پر مشتمل ہے۔ نظامت کے فرائض سید وجاہت شاہ نے انجام دیے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 25 جنوری 2018

غالب کا جائزہ

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر پروفیسر سید شاہد مہدی نے کہا کہ اردو زبان کے نامور شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کا ترجمہ ہر دور میں اپنے طور پر کیا جائے گا۔ ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ غالب کی فارسی

شاعری پر بھی کام کیا جائے تاکہ لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم ہوسکے۔ پروفیسر شاہد مہدی انجینئر حسن عبداللہ کی کتاب ایویلوشن آف غالب (غالب کا جائزہ) کی رسم اجرا کے موقعے پر انڈیا انٹرنیشنل میں منعقد ایک تقریب کے دوران بات کر رہے تھے۔ انجینئر حسن عبداللہ نے اپنی کتاب کے تعلق سے بات کرتے ہوئے کہا کہ وہ کوئی ادیب نہیں ہیں، مگر غالب کی شاعری سے بے پناہ محبت نے انھیں اس کتاب کو لکھنے پر مجبور کردیا۔ اس موقعے پر انیس الرحمٰن نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تقریب میں پدم شری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر رئیس الرحمٰن، پروفیسر محمد مسعود، انجمن ترقی اردو ہند کے ڈائرکٹر ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر خالد جاوید، سید جاوید اصغر، پروفیسر اختر صدیقی، پروفیسر حسن عبداللہ، خواجہ افتخار اور محمد تعظیم کے علاوہ کثیر تعداد میں دانشوران نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 جنوری 2018

'ندائے سحر' اور 'نوکیلے پتھر'

سہارنپور: حضرت امیر خسرو کلچرل سوسائٹی اور اپج مقبول میموریل سوسائٹی و انجمن دالان سہارنپور کے اشتراک سے مشہور شاعر این آر آئی ذیشان سحر کے شعری مجموعہ 'ندائے سحر' اور 'نوکیلے پتھر' کے اجرا کے موقعے پر ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ انبالہ روڈ پر واقع ایک ہوٹل میں مشہور روحانی شخصیت پنڈت کیدار ناتھ پربھاکر جی کی سرپرستی میں منعقد پروگرام کی صدارت ہندی کے نامور شاعر ڈاکٹر وجیندر پال شرما نے کی اور نظامت راؤ محبوب نے کی۔ پروگرام میں دیر رات تک ہندی اور اردو کا سنگم سامعین کو محظوظ کرتا رہا۔ شاعر ذیشان سحر نے اپنی شاعری سے پروگرام میں سماں باندھ دیا۔ ذیشان سحر کے شعری مجموعہ پر غلام ربانی نے سپاس نامہ پیش کیا۔ اسلامیہ انٹر کالج کے ریٹائرڈ پرنسپل پروفیسر جلال عمر نے ذیشان سحر کی شاعری اور ان کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ ایم ایل اے سنجے گرگ نے کہا کہ ذیشان سحر نے کناڈا میں بھی ہندوستان کو آباد کیا ہوا ہے اور وہ بیرون ملک رہ کر بھارت کا نام روشن کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 14 جنوری 2018

بے چاری نہیں ہے ناری

نئی دہلی: مشہور کالم نگار، مصنف، سماجی تجزیہ نگار اور تاریخ داں ڈاکٹر سید مبین زہرا کی ہندی کتاب 'بے چاری نہیں ہے ناری' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ عالمی کتاب میلے کے موقعے پر پرگتی میدان میں منعقد ایک شاندار تقریب میں خواتین و اطفال

بہبود کی مرکزی وزیر محترمہ مینکا گاندھی نے سماجی معاملات کی ماہر مبین زہرا کی کتاب کا رسم اجرا کیا۔ ڈاکٹر سید مبین زہرا نے کہا کہ ان کا مقصد عورت کو قوت دینے کی بات کرکے مرد کو کمزور بنانا نہیں بلکہ دونوں کو ہی قوت دینا ہے، عورت کی طاقت مرد کی کمزوری نہیں ہے، اس لیے آج یہاں اس مباحثے میں صرف مرد ہی حصہ لے رہے ہیں۔ اس موقعے پر سینئر صحافی اپنا بھاگنی ہوتری، دہلی یونیورسٹی کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سندیپ کمار، میڈیا شخصیت اور میٹرو کی آواز شمی نارنگ، سینئر صحافی شکیل شمسی اور دوردرشن اور آکاشوانی کے اے ڈی جی راج شیکھر ویاس کے علاوہ کئی دانشور اور ماہرین تعلیم موجود تھے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 8 جنوری 2018

کامیابی کی راہیں

نئی دہلی: عالمی کتاب میلے میں مغربی بنگال اردو اکادمی کے بک اسٹال پر مزمل حسین برکاتی کی کتاب 'کامیابی کی راہیں' کا اجرا ہوا۔ ماہنامہ 'کنزالایمان' کے ایڈیٹر مولانا ظفرالدین برکاتی نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ سیرت پبلی کیشن کولکاتا کے زیر اہتمام اور اردو اکادمی مغربی بنگال کے اشتراک سے شائع ہونے والی یہ کتاب یو پی ایس سی، ایم ایس سی، ٹی ای ٹی، ریلوے، بینکنگ، ڈیفنس جیسے موضوعات اور محکموں کی سرکاری ملازمت سے متعلق رہنمائی کی گئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ کتاب انگلش اور اردو میں مضامین کا مجموعہ ہے جس میں زیادہ تر ریٹائرڈ آئی اے ایس اور آئی پی ایس افسران کے مقالات اور تجربات ہیں۔ معروف کالم نگار اے رحمان، ڈاکٹر پرویز شہریار، ڈاکٹر شفیع ایوب اور دہلی اردو اکادمی کے ڈاکٹر عزیر قدوسی نے کتاب کے مرتب مزمل حسین برکاتی کی حوصلہ افزائی کی اور اس امید کا اظہار کیا کہ 'کامیابی کی راہیں' سرکاری ملازمت کے لیے تیاری کرنے والے طلبہ وطالبات کے لیے مفید ہوگی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 جنوری 2018

'تجاویز' اور 'دیدہ وران حامد اشرف'

اودگیر: ایک اچھی کتاب، ایک عظیم روایت ہوتی ہے، جو وقت کی آزمائش پر پوری اُترتی ہے۔ کتابیں عموماً

سادہ ہوتی ہیں، اتنی ہی جتنی کہ سچائی۔ ڈاکٹر اشرف کی 'تجاویز' اور جاگیردار عذرا شیرین وقریشی زیتون کی 'دیدہ وران حامد اشرف' سے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ

یہاں حسن وتعمیر کی روح جگمگاتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر جوگیندر سنگھ بیسین (پرنسپل، دیانند آرٹس کالج لاتور وڈین سوامی رامانند تیرتھ مراٹھواڑہ یونیورسٹی، ناندیڑ) نے مہاراشٹرا اودے کالج' اودگیر کے زیرِ اہتمام منعقدہ 'رسم اجرائے کتب' میں بحیثیت مہمان خصوصی کیا، جبکہ گلبرگہ سے تشریف لائے ہوئے معروف شاعر وادیب اکرم نقاش (انجینئر و سابق رکن کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور) نے بتایا کہ ڈاکٹر اشرف کے مضامین بڑے سرل اور سیدھے سادے ہوتے ہیں اور مرتبہ تصنیف 'دیدہ وران حامد اشرف' استاد وشاگردان کی عقیدت ومحبت کی نشانی ہے۔

مہمان خصوصی مرزا وحید علی (معتمد لبرل ایجوکیشن سوسائٹی' اودگیر) نے دونوں تصانیف سے متعلق ناقدانہ جائزہ پیش کیا اور مصنفین کو مینارۂ آگہی کا نام دیا اور بتایا کہ نئی نسل میں موجود عصری بے راہ روی اور معاشرے میں پھیلی خرابیوں کو استاد ہی دور کرسکتا ہے۔ تقریب کی کارروائی جاگیردار عذرا شیرین نے بحسن وخوبی چلائی اور محمد عظمت الحق نے معززین شہر اور حاضرینِ مجلس کا شکریہ ادا کیا اس طرح جلسے کا اختتام عمل میں آیا۔

پریس ریلیز: حمید اشرف، اودگیر، 3 فروری 2018

محمد یامین انصاری کی کتاب کی رسم اجرا

نئی دھلی: انڈیا اسلامک کلچر سینٹر میں منعقد ایک پروقار تقریب میں انقلاب کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر محمد یامین

انصاری کے تحریر کردہ سفرنامہ 'عراق: جو میں نے دیکھا' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے وائس چانسلر پدم شری پروفیسر اخترالواسع نے کہا کہ یہ سفرنامہ عراق کی موجودہ صورت حال اور مغربی میڈیا کے ذریعے جاری گمراہ کن تشہیر کی سچائی بتانے والا ہے، جس کے لیے اس کے مصنف ڈاکٹر یامین انصاری کے ساتھ ساتھ آغا سلطان بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ جن کی کوششوں سے صحافیوں کا ایک ایسا وفد عراق کے دورے پر جاسکا جس نے وہاں کی حقیقت سے لوگوں کو روشناس کرایا اور تفریق کی سیاست کو پس پشت ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے کہا یقیناً سرزمین عرب میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد اگر کوئی زمین ایسی ہے جس کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنایا جائے تو وہ سرزمین عراق ہے، جو کہ کربلا کے شہیدوں کی یادگار ہے۔ عراق کے مختلف مقامات مقدسہ اور تاریخی مقامات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتی اس کتاب کا اجرا پروفیسر اخترالواسع کے علاوہ کرناٹک کانگریس کے جنرل سکریٹری اور معروف سماجی کارکن آغا سلطان، معروف اسلامی اسکالر مولانا ڈاکٹر یاسین علی عثمانی، انقلاب کے ایڈیٹر شکیل شمسی، شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ابن کنول، جے این یو کے پروفیسر معین الحسن ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن کے علاوہ وفد میں شامل صحافی وسیم راشد، عارفہ خانم، رادھیکا بورڈیا، خورشید ربانی، سمیر ارشد، حسام صدیقی وغیرہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر (نارتھ) شکل حسن شمسی نے کہا کہ بلاشبہ عراق میں شیعہ سنی اتحاد ہے اور یہ آج کی نہیں، بلکہ سیکڑوں برس پرانی بات ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے شرکا نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر یامین انصاری نے سفرنامہ پر مبنی کتاب عراق جو میں نے دیکھا، کے چند اقتباسات پیش کیے اور اس میں شامل اہم باتوں سے روشناس کرایا۔ انھوں نے وفد میں شامل اپنے سبھی صحافی ساتھیوں کا بھی ذکر کیا اور ان کی کوششوں کو بھی سراہا۔

اس سے قبل تقریب کا آغاز حافظ محمد عرفان نے تلاوت کلام پاک سے کیا، جبکہ نظامت کے فرائض معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جنوری 2018

وفیات:

ڈاکٹر لئیق صلاح

حیدرآباد: اردو کی مایہ ناز ادیبہ اور ممتاز مزاح نگار ڈاکٹر لئیق صلاح کا 21 دسمبر کی صبح مختصر علالت کے بعد خانگی ہاسپٹل میں 79 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کا نام لئیق خدیجہ اور قلمی نام لئیق صلاح تھا۔ وہ نواب صلاح بن شمشیر یاور جنگ مرحوم کی دختر تھیں۔ وہ ایک عرصہ دراز تک گلبرگہ یونیورسٹی میں پروفیسر صدر شعبہ اردو کے عہدے پر فائز رہیں۔

ملازمت کا آغاز بحیثیت لکچرر بی بی رضا ڈگری کالج گلبرگہ سے کیا۔ وہ کرناٹک اردو اکیڈمی کی صدر رہیں۔ اس کے علاوہ قومی کونسل برائے فروغ اردو دہلی' انجمن ترقی اردو ہند اور آل انڈیا ریڈیو دھارواڑ کرناٹک کی مشاورتی کمیٹی کی رکن رہیں۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں دیدہ شنیدہ، عکس درعکس، میر شمس الدین، فیض حیات اور ادبی کارنامے، تارنفس، نقد وجستجو، ارسطو جاہ اور دیگر تصانیف بھی شامل ہیں۔ محترمہ محمود علی بن صلاح نے ڈاکٹر لئیق صلاح کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر ایک کتاب 'چشم نگراں' شائع کی جس میں ممتاز شخصیتوں کے مضامین شامل ہیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر م ق سلیم، صدر شعبہ اردو، شاداں کالج، حیدرآباد، 23 دسمبر 2017

نذیرالدین

حیدرآباد: دکن کے نامور ادیب، مصنف، دانشور اور مورخ جناب نذیرالدین احمد سابق میونسپل کونسلر مجلس بلدیہ حیدرآباد کا مختصر علالت کے بعد یکم جنوری 2018 کی صبح ان کی قیام گاہ واقع قادر باغ مہدی پٹنم میں انتقال ہوگیا۔ وہ 85 برس کے تھے۔ انھیں مجلس اتحاد المسلمین کے بانی قائد ملت بہادر یار جنگ کی سوانح حیات لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ انھوں نے قائد ملت پر 21 کتابیں تحریر کیں جو منظر عام پر آچکی ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب 'سوانح بہادر یار جنگ' کو جناب عابد علی خاں مرحوم بانی ایڈیٹر روزنامہ 'سیاست' کے نام معنون کیا۔ وہ نہ صرف ایک شعلہ بیان مقرر بلکہ سماجی خدمات اور متحدہ شہری کمیٹی کے سرگرم قائد تھے وہ بہادر یار جنگ اکادمی کے بانی تھے۔ انھوں نے گزشتہ 50 برسوں میں ہندوستان اور پاکستان سے نواب بہادر یار جنگ کے بارے میں تفصیلات حاصل کیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر م ق سلیم، صدر شعبہ اردو، شاداں کالج، حیدرآباد، 3 جنوری 2018

مشہور خطاط نسیم پینٹر

دیوبند: فن خطاطی سے دیوبند کا نام روشن کرنے والے معروف اور مشہور پینٹر چودھری نسیم احمد کا طویل علالت کے سبب ان کے آبائی وطن چرتھاول میں انتقال

ہوگیا۔ انھوں نے دو جنوری کو آخری سانس لی۔ ایک تعزیتی میٹنگ محلہ ابوالمعالی گدی واڑہ میں کی گئی جس کی صدارت سابق رکن پالیکا حافظ اقبال انصاری نے کی۔ میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا عبدالروف نے کہا کہ نسیم پینٹر نے اپنے فن سے دیوبند کے نام کو مزید روشناس کرایا۔ انھوں نے اپنے فن میں مہارت حاصل کی اور دیوبند کے ساتھ ساتھ دور دراز علاقوں تک اردو رسم الخط کو پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے فن پر مہارت حاصل کی اور اپنے فن سے دیوبند کے نام کو اردو رسم الخط میں بلندیوں تک پہنچایا۔ انھوں نے کہا کہ مرحوم اردو کے ساتھ ساتھ عربی اور انگلش رسم الخط کے حوالے سے بھی مہارت رکھتے تھے۔ میٹنگ میں محمد جاوید، مستقیم، پینٹر، عبدالروف عثمانی، فاروق عثمانی، عبیداللہ قلندر، طیب قاسمی وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 8 جنوری 2018

جمیل ظہیر

گیا: اردو کے معروف شاعر اور ادبیات مشرق و مغرب پر گہری نگاہ رکھنے والے ادیب جمیل ظہیر کا 12 جنوری ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ خاندان کے قریبی ذرائع کے مطابق مرحوم کا تعلق ضلع نوادہ کے رجہت سے تھا جہاں سے ان کے والد حکیم ظہیر صاحب گیا منتقل ہوئے تھے، ان کے پسماندگان میں بیٹے بیٹی اور اہلیہ کے علاوہ برادر زادگان میں مشہور افسانہ نگار عشرت ظہیر اور متھلا یونیورسٹی میں اردو کے استاد پروفیسر اسد ظہیر شامل ہیں۔ نماز جنازہ بعد نماز جمعہ کریم گنج مسجد میں ادا کی گئی اور ان کو کریم گنج قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ تجہیز و تدفین میں بڑی تعداد میں معززین شہر، ادبا و شعرا شریک تھے۔ اپنے ایک تعزیتی پیغام میں مشہور ادیب پروفیسر حسین الحق نے کہا کہ جمیل ظہیر اردو کے اچھے شاعر تھے، ان کی غزلیں شب خون، آہنگ، صبح نو، سہیل، آج کل اور ایوان اردو جیسے کثیر الاشاعت معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ادبی معالات پر شب خون اور آہنگ میں ان کے مکتوبات بھی آیا کرتے تھے جن کو ادبی حلقوں میں اب بھی یاد کیا جاتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 جنوری 2018

مختار عاشق جونپوری

جونپور: معتبر بزرگ شاعر مختار عاشق جونپوری 16 جنوری 2018 کو لقوے کی طویل علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ مختار عاشق جونپوری کی پیدائش 1929 میں

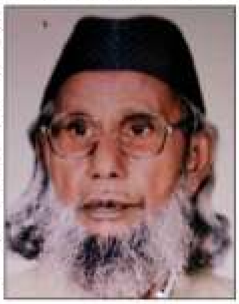

شیراز ہند جونپور میں ہوئی۔ 1946 میں ذریعہ معاش کے سلسلے میں احمد آباد آئے۔ مختار عاشق جونپوری کی شاعری کی ابتدا احمد آباد میں ہوئی۔ مختار عاشق جونپوری نے اس وقت کے استاد شاعر عاشق جونپوری سے اصلاح سخن لی۔ مرحوم کے تین شعری مجموعے ان کی حیات میں شائع ہو چکے تھے، جن میں گلشن اسلام 1968، انداز بیاں اور 2007 گجرات اردو اکادمی سے انعام یافتہ اور تیسرا شعری مجموعہ 'پیانِ قلم' 2014 میں شائع ہوا۔ 'پیانِ قلم' پر مختار عاشق جونپوری کو گجرات اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی، اور اترپردیش اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ مرحوم کی تدفین باغ تاج قبرستان میں بعد نماز عصر ہوئی۔

پریس ریلیز: سلمان جونپوری، جونپور، 18 جنوری 2018

معصوم شرفی اسیر

پٹنہ: اردو تحریک کے خادم اور شاعر معصوم شرفی اسیر کا 27 جنوری کو سلطان گنج میں انتقال ہوگیا۔ وہ تقریباً 83

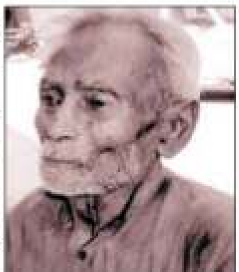

برس کے تھے۔ وہ ایک لمبے عرصے سے صاحب فراش تھے۔ ان کی نماز جنازہ شاہ ارزاں مسجد کے پاس بعد نماز جمعہ ادا کی گئی اور تدفین شاہ گنج قبرستان میں کی گئی۔ معصوم شرفی اسیر نے عمر بھر شادی نہیں کی اور وہ اپنے دوست آر بی آئی کے سابق افسر ظہیر احمد کے دولت خانہ پر تقریباً 60 سال قیام پذیر رہے اور آخری سانس بھی وہیں لی۔ وہ غلام سرور کی اردو تحریک سے وابستہ تھے اور ان کے رفقاء کار کے اہم رکن تھے۔ اردو میں حقوق کے لیے انھوں نے انجمن اسلامیہ ہال میں بھوک ہڑتال بھی کی۔ انقلابی نظریے کی وجہ سے انھیں انقلابی شاعر بھی کہا جاتا تھا۔

عبدالقیوم انصاری سکریٹری انجمن ترقی اردو بہار، قاسم خورشید، ڈاکٹر جاوید حیات وغیرہ نے گہرے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ معصوم شرفی اسیر بہار میں اردو تحریک کے سچے علمبردار تھے۔ ان کا انتقال اردو آبادی کے لیے بڑا خسارہ اور ناقابل تلافی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 جنوری 2018

سلیم صدیقی

نئی دھلی: معروف شاعر اور سینئر صحافی سلیم احمد صدیقی ولد نسیم احمد صدیقی مرحوم کا گذشتہ 26 جنوری کو انتقال ہوگیا۔ وہ 55 برس کے تھے اور سانس کی تکلیف میں مبتلا

تھے۔ شمال مشرقی ضلع دہلی کے بابرپور حلقہ کی کبیر نگر کالونی میں رہنے والے سلیم صدیقی کو 25 جنوری کے دن دل کا دورہ پڑا۔ پسماندگان میں دو بیٹیاں ہیں جبکہ ان کی اہلیہ کا 5 سال قبل ہی انتقال ہوگیا تھا۔ 3 جنوری 1962 کو بریلی کے معزز اور ادبی گھرانے میں پیدا ہونے والے سلیم صدیقی عرصہ دراز سے دہلی ہی میں مقیم تھے اور یہیں ان کی ابتدائی و اعلیٰ تعلیم بھی مکمل ہوئی تھی۔ شاعری کے ساتھ ساتھ صحافتی سفر کا آغاز اپنے زمانہ کے روزنامہ فیصل جدید سے شروع کیا اور ان دنوں میں بھی اپنی خدمات پیش کیں اس کے بعد روزنامہ راشٹریہ سہارا میں طویل مدت تک صحافتی خدمات پیش کرتے ہوئے نہ صرف قلم کا لوہا منوایا بلکہ نئے آنے والے صحافیوں کو بھی صحت مند صحافت کرنے کے لیے مشعل راہ دکھائی اور چیف رپورٹر کے عہدے تک گئے۔ ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آئے جن میں ایک 'قلندر بولتا ہے' اور 'تمھارے بعد' تھا۔ مرحوم سلیم احمد صدیقی کے انتقال سے نہ صرف اردو صحافت کی دنیا میں بلکہ حلقہ علم و ادب میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ ان کی تدفین ویلکم قبرستان میں عمل میں آئی۔ نماز جنازہ غوثیہ مسجد جعفرآباد کے امام مولانا غلام جیلانی اشرفی نے پڑھائی۔ ان کی نماز جنازہ میں کثیر تعداد میں شہر کی معزز شخصیات شامل ہوئیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 جنوری 2018

محمد علوی

ممبئی: یہاں موصول ہونے والی خبر کے مطابق ممتاز جدید شاعر محمد علوی 91 سال کی عمر میں 29 جنوری کو اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ وہ ادھر کچھ عرصے سے علیل تھے۔ ان کے انتقال کی خبر نے پورے ملک کی ادبی دنیا کو سوگوار کردیا۔ ان کا تعلق

چونکہ حضرت شاہ وجیہ الدین علوی کے خانوادے سے تھا، اس لیے ان کے جسد خاکی کو شاہی باغ علاقے میں پہلے خانقاہ میں لے جایا گیا اور اس کے بعد نیلی گنبد قبرستان میں، جو کہ ان کا آبائی قبرستان ہے، رات 9 بجے سپرد خاک کیا گیا۔ اسی قبرستان میں اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی (انتقال جنوری 2014) بھی آرام فرما ہیں۔ محمد علوی کے انتقال کی خبر بعد کی نسل کے اہم شاعر ریاض لطیف نے دی اور بتایا کہ تدفین میں ان کے اہل خاندان کے علاوہ شہر کے متعدد ادبا و شعرا بشمول جینت پرمار، اکرام خاور، صادق انور وغیرہم موجود تھے۔ علوی کے پسماندگان میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ محمد علوی کے جن شعری مجموعوں نے ان کی ادبی شناخت اور مقام کا تعین کیا ان میں خالی مکان، آخری دن کی تلاش، تیسری کتاب اور چوتھا آسمان شامل ہیں۔

روز نامہ 'انقلاب' دہلی، 30 جنوری 2018

ڈاکٹر تاج پیامی

آرہ: معروف ادیب ڈاکٹر تاج پیامی کا طویل علالت کے بعد 31 جنوری 2018 کو انتقال ہوگیا۔ وہ 78 برس کے تھے۔ پسماندگان میں اہلیہ اور دو بیٹے ہیں مرحوم کو گردے کا عارضہ لاحق تھا اور ادھر کوئی ایک ماہ سے وہ صاحب فراش تھے۔ کل رات کوئی گیارہ بجے انھوں نے آخری سانس لی۔ تدفین ان کے آبائی گاؤں جگدیش پور کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ تاج پیامی کی رحلت کی خبر عام ہوتے ہی علمی، ادبی اور تہذیبی حلقے سوگوار ہوگئے۔ مرحوم ایک سے زیادہ نسلوں میں مقبول تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی ادب کے لیے وقف کرنے کے ساتھ ساتھ عمر کا طویل حصہ نئی نسل کی تربیت میں صرف کیا تھا۔ مرحوم کی تصانیف میں آئینہ (شاعری)، سنگ گراں، آئینہ غزل (شاعری)، صاعقہ طور (تنقید)، مزاحیہ شاعری اور چند مزاحیہ شعرا (تنقید) نمایاں ہیں۔ اس موقعے پر عمائدین شہر اوران کے متعلقین نے اظہار تعزیت پیش کیا۔

روز نامہ 'میرا وطن' دہلی، 1 فروری 2018

خراج عقیدت:

انجمن ترقی اردو اودے پور کی جانب سے تعزیتی جلسہ

ادے پور: انجمن ترقی اردو اودے پور، ادبی سنگم، ومرش اور PWA/راجستھان کی جانب سے انجمن کے نائب صدر جناب ہریش تلریجا کے دولت کدہ پر تعزیتی جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں معروف شاعر انور جلال پوری، خداداد مونس، ہندی کے شاعر کنور نارائن، فکشن نگار دودھ ناتھ سنگھ اور پروفیسر مرتضی بیگ کے 24 دسمبر 2017 سے 10 جنوری 2018 کے درمیان وفات پر خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت بزرگ شاعر عابد ادیب نے کی۔ انجمن ترقی اردو اودے پور کی صدر اور PWA کی صوبائی سکریٹری ڈاکٹر ثروت خان نے خداداد مونس، پروفیسر دودھ ناتھ سنگھ اور پروفیسر مرتضی بیگ کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات پر مقالے پڑھے۔ ثروت خان نے اپنے مقالہ میں کہا کہ راجستھان ہی نہیں پوری اردو دنیا میں اب قدیم تہذیبی و اخلاقی ورثہ کے ادبا و علما و شعرا ہمارے درمیان سے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ خداداد مونس اُن میں سے ایک تھے جن کی شاعری، تاریخ گوئی اور منظوم تراجم کی اپنی شان ہے۔ اردو، ہندی، انگریزی، عربی، فارسی اور پنجابی زبانوں کے ماہر، بہترین شاعر خداداد مونس کو 'طوطی خواجہ' بھی کہا جاتا ہے جنھیں یہ خطاب من جانب غریب نواز فاؤنڈیشن، اجمیر بطور اعزاز دیا گیا تھا۔ مونس نے دیوان خواجہ معین الدین چشتی کے فارسی کلام کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کیا اور "Khwaja Moinuddin chishti social and educational relevance" نام کی کتاب لکھ کر اردو ہندی میں ترجمہ کرکے شائع کی۔ مونس نے بابا فرید گنج شکر کے پنجابی کلام کے وہ حصے جو سکھ مذہب کے 'گرو گرنتھ صاحب' میں درج ہیں اُن کا بھی اردو منظوم ترجمہ کیا۔ ان کی تصانیف میں سعادت کبریٰ (نعت مجموعہ)، عشق کی راہوں میں (سلام و منقبت) مشکوۃ التواریخ (فن تاریخ گوئی اور شاعری)، پُر فضا (پنجاب غزلیات) بھی شامل ہیں۔ آپ نے بڑے افسر کی ذمہ داریوں کے ساتھ ناظم درگاہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیر، ڈائرکٹر ابوالکلام آزاد عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک اور سکریٹری راجستھان اردو اکادمی کی ذمہ داریوں کو بھی بہ حسن خوبی انجام دیا۔ راجستھان اردو اکادمی نے مونس کو 'بسمل سعیدی ایوارڈ' سے نوازا۔ ثروت خان نے پروفیسر مرتضیٰ بیگ کی ادب نوازی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مرحوم فزکس کے مشہور اور قابل پروفیسر تھے، لیکن اردو ادب کا مطالعہ اس قدر وسیع تھا کہ اودے پور کے پی۔ جی میرا گرلس کالج کے شعبہ اردو کی جانب سے جب بھی آپ سے درخواست کی جاتی، آپ توسیعی خطبہ دینے کے لیے بہ خوشی تیار ہو جاتے۔ اکثر اُن کے خطبات سے طلبا نے فیض اُٹھایا۔ ملک کے بڑے بڑے سائنس داں، سیاست داں، ڈاکٹر اور انجینئر ان کے شاگردوں میں سے ہیں۔ محترمہ شیبا حیدر نے انور جلال پوری کی شاعری اور اُن کی نظامت پر بہترین مقالہ پڑھا۔ انھوں نے بتایا کہ اردو مشاعروں کا نظم وضبط، اُن کی رونق اور سامعین کی دلچسپیاں اور محفل کی حرارت کو قائم و دائم رکھنے کا سلیقہ انور جلال پوری کی نظامت کا طرۂ امتیاز تھا۔ کلام میں کلاسیکی روایت کے باہم عصری حسیت کے پیچ وخم کا بیان انور جلال پوری کی شاعری کو منفرد بناتا ہے۔ ٹیگور کی 'گیتا نجلی' اور 'گیتا' کا ترجمہ بھی انور جلال پوری کا بہترین کارنامہ ہے۔ پروفیسر چندر کانتا نے ہندی کے معروف شاعر کنور نارائن پر اپنے مقالہ میں یہ بتایا کہ وہ ہندی بھاشا کے بہترین کوی تھے۔ اُن کی شاعری احساس کی شاعری ہے جو ایک کسک کے ساتھ بیداری بھی پیدا کرتی ہے۔ ہندی غزل میں اُن کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ڈاکٹر ثروت خان نے فکشن نگار، نقاد اور دانشور شری دودھ ناتھ سنگھ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر دودھ ناتھ سنگھ کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ سادہ مزاجی، نرم لہجہ وشائستگی سے پُر علمی وادبی گفتگو اور ہر وقت چہرے پر سکون بھرا تبسم، اُن سے ملاقات کرنے والوں کو اپنا گرویدہ بنالیتا تھا۔ اُن کا فکشن ہندی ادب ہی نہیں، ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادب کے لیے مثالی بھی ہے اور باعث فخر بھی۔ ہمارے درمیان سے ان سب ہستیوں کا چلا جانا وہ خلا، پیدا کرتا ہے جسے پُر نہیں کیا جاسکتا۔

اس موقعے پر اودے پور کے قلم کاروں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ جن میں پروفیسر پریم سنگھ بھنڈاری، ڈاکٹر رجنی کلشریشٹھ، ڈاکٹر اسمتا سنگھ، جناب اقبال ساگر، جناب مشتاق چنچل، جناب ہریش تلریجا، جناب خورشید نواب، ڈاکٹر شوکت پروین، ڈاکٹر فرحت بانو، ڈاکٹر اندرا جین، جناب زاہد خاں کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ثروت خان، صدر انجمن ترقی اردو ادے پور، راجستھان، 25 جنوری 2018

سولاپور کتاب میلہ اخبارات کے آئینے میں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شب خون کا توضیحی اشاریہ (جلد اوّل ودوم)

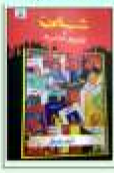

مرتب: انیس صدیقی
صفحات: 1374 مکمل سیٹ
قیمت: 580 روپے مکمل سیٹ

کلیات ماجدی (شخصیت) جلد چہارم

ترتیب وتدوین: عطاء الرحمٰن قاسمی
صفحات: 527
قیمت: 230 روپے

مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایات

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 382
قیمت: 170 روپے

صرف تمھارے لیے

مصنف: ڈاکٹر ستیندر رانا ڈگ
مترجم: ماہر منصور
صفحات: 139
قیمت: 85 روپے

دنیائے افسانہ

مصنف: محمد عبدالقادر سروری
صفحات: 131
قیمت: 85 روپے

شاعری کی تنقید

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 327
قیمت: 155 روپے

کلیات بانی

مرتب: پروفیسر گوبند پرشاد
صفحات: 383
قیمت: 180 روپے

انتخاب سخن (جلد دوم) سلسلۂ ذوق

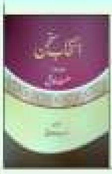

مرتب: حسرت موہانی
صفحات: 321
قیمت: 155 روپے

جانے انجانے جاندار

مصنف: شمس الاسلام فاروقی (علیگ)
صفحات: 66
قیمت: 35 روپے

اصلاح الاصلاح

مصنف: ابراحسنی گنوری
مقدمہ: شمس رمزی
صفحات: 129
قیمت: 85 روپے

مشرق ومغرب میں تنقیدی تصورات

مصنف: محمد حسن
صفحات: 373
قیمت: 168 روپے

عوام الناس کے صدر ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام

مصنف: ایس۔ ایم۔ خان
مترجم: سید وجاہت مظہر
صفحات: 166
قیمت: 125 روپے

کردار اور افسانہ یعنی دنیائے افسانہ (حصہ دوم)

مصنف: عبدالقادر سروری
صفحات: 118
قیمت: 75 روپے

قدیم علم الامراض

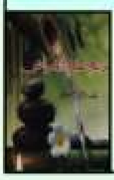

مصنف: ملک واثق امین
صفحات: 131
قیمت: 50 روپے

اصول افسانہ نگاری

مصنف: اویس احمد عزیز
صفحات: 86
قیمت: 65 روپے

بہار کی بہار (جلد دوم)

مصنف: اعجاز علی ارشد
صفحات: 242
قیمت: 150 روپے

مغرب میں تنقید کی روایت

مصنف: عتیق اللہ
صفحات: 568
قیمت: 245 روپے

بہارِ گلشن کشمیر (جلد اوّل ودوم)

مرتبہ ومولفہ: پنڈت برج کشن کول
و پنڈت جگت موہن ناتھ رینہ
صفحات: 454، 537
قیمت: 275، 300 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, March-2018, Vol.20, Issue:03
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2017-19
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/02/2018**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیشکش

خاکہ پر ایک دستاویزی شمارہ جس میں خاکہ کے فن اور روایت، اردو کے اہم اور نمائندہ خاکہ نگاروں پر مضامین کے علاوہ رفتگاں اور قائماں پر اہم ادبی خاکے بھی شائع کیے گیے ہیں۔

صفحات: 422 قیمت: 50 روپے

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025